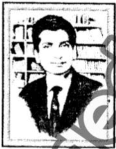

ماہنامہ
سچی کہانیاں
August
2017
☆......'مسئلہ یہ ہے' قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل
☆......سلسلے وار ناول 'خانقاہ' اور 'نواب' بدیسی کہانی 'بارش'

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



MEMBER APNS CPNE

رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

خط وکتابت کا پتا: II-C-88 فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے — جلد: 34 - شمارہ: 08 اگست 2017ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

07	شکرانہ	منزہ سہام
08	احوال	ناصر رضا
18	نو بہ نو حیرت کدے	فوزیہ صدیقی
28	بازارِ عشق	سلیم اختر
40	روپ بہروپ	نینا خان
54	مجرم کون	راحت وفا
62	دشمن جاں	نگین وڑائچ
71	ایسا بھی ہوتا ہے	نسیم سکینہ صدف
76	دکھوں کے سائے	سنبل ناہید
82	عروج وزوال	شاہدہ ذاکر
88	غم ہی مقدر ٹھہرے	عظمیٰ نعیم
92	نواب	حمیرا خان



فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی' سٹی پریس' OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

بد کا انجام برا	118	سید ملازم حسین
غیرت کے نام پر	122	جہانہ آفتاب
مظلوم کی آہ	131	اُمِ عادل
کاش وہ لوٹ آئیں	136	کوثر پروین
مہرباں یہ کیا کیا	140	عائشہ نور آغا
خانقاہ	146	کاوش صدیقی
کنویں والی عفریت	176	نفیسہ سعد
مجھ کو تباہ کر دیا	182	میر حسن
تم میری ہو	192	نسرین اختر نینا
آرڈی ہیبرن	203	شفاعت
بارش	213	نجیب عمر
مسئلہ یہ ہے	249	ادارہ



زر سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے، افریقہ 65 ڈالر، کینیڈا، آسٹریلیا 65 ڈالر، ایشیا، یورپ 55 ڈالر / قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

اب CSS ایک حقیقت

1) والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی اولاد اُن کا نام روشن کرے مگر فی زمانہ اکثر والدین اپنی خواہش کو بس اپنے دل میں ہی دبا کر رکھ لیتے ہیں۔

2) مشہور تعلیمی اداروں اور ان سے جڑے اساتذہ کی بھاری بھرکم فیس عام والدین کی پہنچ سے بہت دور ہوتی ہیں۔

3) ایسے میں ہم آپ کی رہنمائی کریں گے ہم آپ کی اولاد کو آپ کے لیے باعث فخر بنائیں گے۔

4) علم کی دنیا میں CSS ایک خواب۔

5) اس خواب کی حقیقی تعبیر کے لیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

6) انتہائی قابل ٹیچرز سے گھر بیٹھے اپنی لاڈلی بیٹی یا ہونہار سپوت کو CSS کی تیاری کرائیں۔

7) CSS میں آپ کی کامیابی کو ہم یقینی بنائیں گے۔

رابطہ کیجیے

www.facebook.com/srasheedkhan

شکرانہ

انسان بڑا ناشکرا ہے اپنے پروردگار کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے۔ ہر وہ عمل اس کو خوشی دیتا ہے جس سے تمام جہانوں کے رب نے منع فرمایا ہے۔ نافرمانی کرنے کے بعد اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے بے سروپا تاویلیں بھی حضرتِ انسان خوب دیتا ہے۔ زندگی کا مطلب ہی جدوجہد ہے پریشانیاں آتی ہیں اور انسان کو مزید مضبوط کر کے چلی جاتی ہیں۔ ایک زندگی میں انسان خوشیاں بھی دیکھتا ہے اور دکھ بھی، مگر جو دکھوں اور پریشانیوں کو صبر سے جھیلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ کندن بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے حساب نعمتوں سے نوازا ہے ہمیں محبت کرنے والے والدین دیے، نیک اولاد دی، صحت اور تندرستی عطا کی، حلال رزق کا ذریعہ عطا کیا۔ ہر مشکل میں ساتھ دینے والے رشتے اور دوست دیے، تازہ ہوا دی، فرحت بخش پانی سے نوازا، خوش رنگ پھول دیے، آرام دہ اور خوشیوں سے مزین گھر عطا کیے۔

تو پھر 'فبای علی ربکما تکذبان' مگر ایک ایسی نعمت ہے جو ان سب نعمتوں پر بھاری ہے ہمیں صرف ایک اس نعمت کے بدلے اپنے پروردگار کے سامنے سجدے سے سر نہیں اٹھانا چاہیے ہمیں کسی تنگی کا شکوہ نہیں کرنا چاہیے ہمیں کسی دکھ پر واویلا نہیں کرنا چاہیے، ہمیں اور کچھ نہیں مانگنا چاہیے۔ صرف اور صرف اس لیے کہ اس رب العزت نے ہمیں کلمہ گو بنایا ہمیں ایسے والدین عطا کیے جو اُس کے محبوب ﷺ کے امتی ہیں، ہمیں اپنے رب کے صرف اس ایک احسان کے بدلے اپنی پوری زندگی اُس کے طے کردہ اصولوں کے مطابق گزارنی چاہیے......

اگر ہماری زندگی اس کے برعکس ہوتی تو......؟

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

محترم احوالی دوستو! سلامت باشد! سالہا سال کے بعد میں ایک بار پھر آپ سے مخاطب ہوں، ادارہ پرل پبلی کیشنز اور آپ سے میرا دیرینہ تعلق ہے۔ اتنے برسوں کہاں رہا اور کیسی گزری؟...... یہ ایک لمبی کہانی ہے، زندگی رہی تو آپ کو سناؤں گا ضرور، آپ کے اسی اپنے پسندیدہ ماہنامے ''سچی کہانیاں'' میں' فی الوقت تو مجھے آپ کا ''سچی کہانیاں'' آپ کے اعلیٰ معیار اور مقررہ وقت میں مارکیٹ کرنے کا چیلنج درپیش ہے...... جبکہ یہاں جو 'حال' ہے' ایسا نہیں کہ آپ سے کہیں!!...... بقول شاعر:

یہ اور بات ہے کہ منبر پہ جا کے کچھ نہ کہیں
خموش لوگ بلا کے خطیب ہوتے ہیں

احوال میں یہ پہلی آمد ہے، حیدر آباد کے نامور صحافی اور لکھاری سید سرور ندیم کی، لکھتے ہیں ''اپنے ''علمی گھر'' میں واپسی مبارک ہو، یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا کہ گوشت سے ناخن جدا نہیں ہوتا، امید ہے کہ اب ''سچی کہانیاں'' میں بہت سے پرانے رائٹرز کے ساتھ ماضی کے کچھ مقبول سلسلے بھی نظر آئیں گے، اور ہاں کہانی کی سرخی کے ساتھ، کہانی کا حاصل شعر، مرزا صاحب اور شمیم نوید مرحوم کی نہایت ہی منفرد سوچ کا عکاس سلسلہ تھا، تو پھر ہو جائے وہی شعری خیال والی سرخی؟ اگر آپ مناسب سمجھیں تو؟؟ آئندہ شمارے کے لیے نامور سیاسی شخصیت مولا بخش چانڈیو صاحب کی زندگی کا لفظی خاکہ ارسال کروں گا، دیکھ لیجے گا۔

☆...... بھائی سید سرور ندیم! آپ کے خط نے ماضی کے حوالے سے نجانے کیا کیا 'حال' کے ورق پر تحریر کر دیا ہے، آپ جیو! سرخی کے ساتھ کہانی کے مطابق شعر والی آپ کی بات تو وہ ہے جو میرے دل میں تھی، آپ کی تحریر کا شدت سے انتظار رہے گا۔

معروف شاعرہ اور کہانی کار، پروفیسر صفیہ سلطانہ کی احوال میں آمد بہت خوشی کا باعث بنی ہے آپ لکھتی ہیں، اپنوں سے اپنوں کا مل جانا، بہت اچھا لگا، بہت ہی مبارک ہو۔ سچ میرے لیے تو یہ ایک خوشی کی بڑی خبر ہے، جن لوگوں نے مرزا صاحب مرحوم جیسے باکمال شخص کا دور دیکھا ہے' اس دور میں ان کے کمال ساتھیوں کو دیکھا ہے، میں ان بہت خوش قسمت لکھاریوں میں سے ہوں، دانش دیروی، شمیم نوید،

سلیم فاروقی مرحوم جیسے علم دوست لوگ، پرویز بلگرامی بھائی، سیما غزل، فریدہ مسرور، غزالہ رشید اور آپ! اللہ آپ سب کو صحت بھری زندگی دے، میرے حوالے سے آپ اور تمام قارئین کے لیے دو اچھی خبریں ہیں، پہلی یہ کہ مجھے اللہ نے اس برس فریضۂ حج کے لیے منتخب کرلیا ہے، میرا دربارِ رسولؐ سے بلاوا آ گیا ہے' دوسری بات یہ کہ میرا تیسرا شعری مجموعہ ''میرا درد کیسے غزل ہوا'' اشاعت کے لیے جا رہا ہے۔ آپ فوری طور پر مجموعے پر اپنی رائے ارسال کردیں، اس مجموعے کی کچھ شاعری فوٹو اسٹیٹ کی صورت حاضر ہے......اور کیا لکھوں! منزہ کو بہت سلام اور دعائیں کہ انہوں نے مرزا صاحب کی بیٹی ہونے کا حق ادا کردیا ہے!!

☆......صفیہ جی! آپ نے میرے اور اُن کے دور کو کیا یاد کیا؟ گویا ماضی کا دریچہ کھول دیا، مرزا صاحب اور وہ تمام ساتھی جو اَب اس دنیا میں ہمارے ساتھ نہیں، ان کی بخشش اور درجات کی بلندی کے لیے اَنگنت دعائیں اور جو حیات ہیں، ان کی زندگی، صحت، خوشی اور کامیابی کے لیے دعائیں ہی دعائیں۔ آپ کے شعری مجموعے کے لیے میری رائے بس یوں سمجھیں کہ ارسال ہوگئی، حج کی سعادت کا حصول بہت مبارک ہو، خانہ کعبہ اور روضۂ رسولؐ پر، میرے، اپنے اور پرائے سب کے لیے بہت دعا کیجیے گا......آپ کا سلام صرف منزہ سہام ہی نہیں، ان کے صاحبزادے زین شمسی تک بھی پہنچادیا ہے۔ جوان دنوں اپنی والدہ کے شانہ بہ شانہ، دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے ایڈورٹائزنگ منیجر کی حیثیت سے ماہناموں کی اشاعت و ترویج میں حصہ لے رہے ہیں...... ''اور کیا لکھوں!'' آپ نے بھلا ہم سے یہ کیا سوال کیا؟ ارے بھئی آپ ''دوشیزہ'' کے لیے افسانے اور ''سچی کہانیاں'' کے لیے کہانیاں لکھیں!!

مشہورِ زمانہ شاعر محسن نقوی کے عاشقِ محبت، ان پر پی ایچ ڈی کے خواہش مند، شاعر و نثر نگار اشعر جواد کی کراچی سے احوال میں آمد! محسن نقوی مرحوم کے دلکش خیال سے اپنے خط کا آغاز کیا ہے:

انا پہ چوٹ پڑے بھی تو کون دیکھتا ہے
دھواں سا دل سے اٹھے بھی تو کون دیکھتا ہے
اجاڑ گھر کے کسی بے صدا دریچے میں
کوئی چراغ جل کے بجھے بھی تو کون دیکھتا ہے

ناصر رضا بھائی! آپ ''احوال'' میں آئے تو ہم بھی آ گئے......کہ آپ ''بلاتفریق'' سب سے محبت کا ہنر جانتے ہیں۔ آپ کے دورِ گزشتہ میں، ہیں 'سچی کہانیاں' کے اوراق کی زینت بننے والے دو سلسلے، ''اس ماہ کا شاعر'' اور ''آپ کی ڈائری'' قارئین کو بہت پسند تھے۔ کیا یہ سلسلے دوبارہ شروع ہوسکتے ہیں؟ گزشتہ مہینوں میں، میں نے اپنے ایک عزیز دوست کی فرمائش پر یا خواہش کے پیشِ نظر، اپنی شاعری کو مجموعے کی صورت شائع کرانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس سلسلے میں کچھ کام بھی شروع کیا تھا لیکن پھر بس

اچانک ہی دل میں خیال آیا تھا کہ...... ابھی پختگی کا اور سفر ضروری ہے، سو یہ سفر جاری ہے' میری دعا ہے کہ آپ بھی ''سچی کہانیاں'' کے ایک نئے پختگی والے سفر میں کامیاب اور کامران ہوں!

☆......اشعر! میرے بھائی، میرے دوست، یہ سچ ہے کہ مجھے ''محبت'' کے سوا کچھ نہیں آتا، رشتوں، عزیزوں، دوستوں یا پھر دشمنوں سے لے کر اپنے کام تک محبت، ہی ایک اسم ہے جس کا ورد کیے جا رہا ہوں، خدا کرے کہ یہ سلسلہ زمین کا رزق ہونے تک جاری رہے...... آئندہ ماہ سے ''سچی کہانیاں'' میں بہت کچھ بدلے گا لیکن جو کچھ بھی تبدیل ہوگا وہ ''سچی کہانیاں'' کے رائٹرز اور قارئین کی آراء کی صورت میں ہوگا، اس مقصد کے حصول کی خاطر، ''احوال'' میں شائع ہونے والا اشتہار ''آپ......! کیسا ''سچی کہانیاں'' دیکھ لو، اپنی کتاب کے حوالے سے تمہاری پختگی کے سفر والی بات بہت اچھی لگی، میں بھی تمہاری کامیابی اور کامرانی کے لیے دعا گو ہوں!

📄 اپنی شادی کے بعد قلم کی دنیا سے دور ہو جانے والی، بہت ہی اچھی شاعرہ اور کہانی کار، روشانے سبعین مہاروی کی ''احوال'' میں آمد یوں ہوئی ہے......

محترم ناصر بھائی! آداب' امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ سب سے پہلے تو آپ کی صحت کے لیے دل سے دعا گو ہوں، شادی اور پھر امورِ خانہ داری میں یوں الجھی کہ چار سال کیسے بیت گئے، کچھ خبر ہی نہیں ہوئی...... جونہی فرصت کے چند لمحے میسر آئے، سب سے پہلے قلمی سلسلہ بحال کرنے کا قصد کیا، اور ''لیکھ'' کی صورت میں ایک کہانی صفحۂ قرطاس پر بکھر گئی۔ امید ہے ''سچی کہانیاں'' کے صفحات پر شرفِ قبولیت پائے گی، اور چند نظمیں بھی ارسال کر رہی ہوں۔ منزہ باجی تمام اسٹاف اور قارئین کو سلام!

☆......بہت اچھی بہن روشانے! چار سال بعد، تمہاری قلم کی دنیا میں آمد سے میرا دل شاد اور آباد ہو گیا۔ تمہاری تحریر ''لیکھ'' بہت شاندار ہے اور شاعری کا بھی جواب نہیں، اپنے میاں جی کو میری طرف سے سلام اور دعا، بچوں کو بہت پیار دو......!

📄 ''سچی کہانیاں'' کے بہت پرانے دوست، پرویز احمد دولومیاں چنوں سے احوال میں تشریف لائے ہیں۔

محترم انکل ناصر رضا، السلام علیکم!

لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے
یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

ملکۂ ترنم نور جہاں نے یہ گیت شاید ہمارے لیے ہی گایا تھا۔ ''سچی کہانیاں'' اور ''احوال'' کی آبیاری کی ذمے داری ایک بار پھر آپ کو سونپ دی گئی ہے۔ ''سچی کہانیاں'' کے ساتھ آپ کا نام سنتے ہی بہت سے چہرے کھلکھلا اٹھے، حسین خواجہ، علی اصغر انصاری، منچن آباد، مقصود بلوچ، منشی عزیز میے، شہزاد اشعر، بلال اصغر اور بہت سے لوگ خوش ہوئے کہ وہ اب دوبارہ اس محفل میں آپ کے زیرِ سایہ بیٹھیں گے اور رونقیں بڑھائیں

دکھ کی خبر

معروف شاعر حسن اکبر کمال گزشتہ دنوں طویل علالت کے بعد رضائے الٰہی سے رزقِ خاک ہوئے۔
ادارہ پرل پبلی کیشنز، مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کے ساتھ اہلِ خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

گے۔ اگلے ماہ سے تو بہت سے پرانے ساتھی ''احوال'' میں موجود ہوں گے۔ اس محفل میں شمولیت کرنے والوں، اہتمام کرنے والوں اور پڑھنے والوں کو بہت لطف آئے گا۔

☆...... بھائی مہر پرویز احمد دولو! ''سچی کہانیاں'' آپ سب دوستوں کا اپنا ماہنامہ اور ''احوال'' آپ کی اپنی محفل ہے۔ آپ سب کی آمد سے ہی یہ محفل آباد ہوگی......!

اسماء غفور صاحبہ چیچہ وطنی سے پہلی بار شریکِ محفل ہیں:

اچھے انکل ناصر رضا! السلام علیکم! امید ہے آپ کے مزاج اچھے ہوں گے۔ میں ''احوال'' میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ آپ کی حوصلہ افزائی مجھے اس محفل کا مستقل ممبر بنا سکتی ہے ہمارے گھر میں ''دوشیزہ'' آتا ہے۔ میں کبھی کبھار ''سچی کہانیاں'' بھی پڑھ لیتی ہوں۔ میں اتنا تو نہیں جانتی لیکن گھر والے کہتے ہیں کہ ''سچی کہانیاں'' کا اب وہ پہلے والا معیار نہیں رہا۔ انکل! آپ گروپ ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھال چکے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ''سچی کہانیاں'' کو معیاری ماہنامہ بنائیں گے۔ اگست کا شمارہ پڑھ کر تفصیلی تبصرہ کروں گی۔ اس وقت تک کے لیے اجازت چاہوں گی۔ اللہ حافظ!

☆......اچھی بھتیجی اسما غفور! ''احوال'' کی محفل میں خوش آمدید، آپ نے اپنے خط میں ''سابقہ'' ''سچی کہانیاں'' کے حوالے سے جو شکایات تحریر کی ہیں وہ ہم نے نوٹ کر لی ہیں، لیکن ان کی اشاعت مناسب نہیں، البتہ یہ ہمارا آپ سے وعدہ ہے کہ ہم ''سچی کہانیاں'' کا معیار بلند سے بلند کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور ہاں! آئندہ ''احوال'' میں آپ کی شرکت یقینی ہونی چاہیئے!

عثمان علی صاحب پتوکی سے ''احوال'' میں تشریف لائے:

السلام علیکم! ناصر رضا صاحب! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ (ویلکم بیک) سر آپ کے لیے میرا نام نیا ضرور ہوگا مگر میرے لیے نہ آپ نئے ہیں اور نہ ''سچی کہانیاں''۔ بہت سے ایڈیٹر آئے اور گئے مگر میں ''سچی کہانیاں'' سے وابستہ رہا۔ بس خط پہلی دفعہ لکھ رہا ہوں۔ امید ہے میرے خط کو احوال میں جگہ ملے گی۔ سر بات شروع کرنے سے پہلے سابقہ ایڈیٹر کے بارے میں چند باتیں کہوں گا کہ بہت ہی محنتی اور ٹیلنٹڈ ایڈیٹر تھے مگر جناب اتنے محبوب اور پسندیدہ ایڈیٹر کا اچانک رخصت پر چلے جانا عجیب سا لگا۔ کہا انہوں نے یہی ہے کہ لوٹ کے آئیں گے مگر یہ سب باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں، جانے والے کب لوٹ کر آئے ہیں؟ اس ماہ کا ٹائٹل زبردست تھا مگر سرورق پر موجود بولڈ سرخیوں نے ماڈل کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اگر ایڈیٹر غور کرے تو باقی

تمام ڈائجسٹوں کے سرورق پر ایسی سرخیاں نہیں ہوتیں، سوائے ڈائجسٹ کے نام کے۔ بابرہ شریف کی تصویر، مسئلہ یہ ہے، 30 سے زائد کہانیاں شمارے میں موجود، یہ سب کچھ خوامخواہ سا تھا۔ ٹائٹل کو ماند کر دیا۔ تحریریں بہترین رہیں۔ رسالہ دیر سے ملا اس لیے ابھی زیادہ پڑھ نہیں سکا 'کس پہ اعتبار کریں، سعودی عرب کا ویزا، پروفیشنل، تجھ بن روئے ساون، لاجواب تھیں۔ ارم ناز کی تحریر نے مایوس کیا۔ ارام بہن معذرت کے ساتھ آپ کی تحریریں یکسانیت کا شکار نظر آنے لگی ہیں۔ تحریریں پڑھ کر اندزہ ہوتا ہے کہ آپ سینئر رائٹرز کا مطالعہ نہیں کرتیں۔ بہن اپنا مطالعہ وسیع کریں اور موضوعات میں نیا پن لائیں۔ امید ہے آپ میری تنقید کو مثبت لیں گی۔ بھائی اپنی بہنوں کا برا نہیں چاہتے۔ مینا تاج کی کہانی پڑھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ آخر میں تمام رائٹرز سے ایک ہی التماس کرنا چاہوں گا، اکثر رائٹرز کو خبط ہوتا ہے کہ کوئی ایڈیٹر چلا جائے تو وہ بھی اُن کے پیچھے ہی غائب ہو جاتے ہیں، ٹھیک ہے ہر ایک کی وابستگی کا اپنا انداز ہوتا ہے مگر جناب ہمارا کیا قصور ہے کہ ہم تو ان رائٹرز کی تحریریں پڑھنا چاہتے ہیں۔ خط بہت طویل ہو گیا ہے کسی کو کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت چاہتا ہوں اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔ اب اجازت!

☆......محترم عثمان علی! آپ کا احوال میں پہلا خط بہت اچھا ہی نہیں ''بامعنی'' بھی ہے۔ سرورق کے حوالے سے آپ کی شکایت نوٹ کر لی گئی ہے، ہمیں ''احوال'' میں آئندہ بھی آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

''سچی کہانیاں'' کے دیرینہ دوست عبدالغفار عابد بھائی کی بھی ''احوال'' میں آمد ہوئی ہے:

محترم ناصر رضا! السلام علیکم! آپ کی ''سچی کہانیاں'' میں واپسی ہمارے اور بہت سے قارئین و رائٹرز کے لیے خوشی کا باعث ہے۔ ناصر بھیا میں آپ کی ادب دوستی کو سلام پیش کرتا ہوں کہ آپ نے میرے جیسے عام لکھاریوں کو بھی ''سچی کہانیاں'' میں دوبارہ لکھنے کی دعوت دی۔ آپ کا محبت بھرا حکم سننے کے بعد اقرار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اپنے تمام ساتھیوں سمیت اس امید کے ساتھ یہاں موجود ہوں کہ آپ لکھاری اور کہانی کے حوالے سے میرٹ کو اہمیت دیں گے اور ''سچی کہانیاں'' کو زیادہ معیاری پرچہ بنائیں گے۔ میری ''سچی کہانیاں'' سے روٹھے ہوئے تمام دوستوں سے اپیل ہے کہ واپس آ جائیں اللہ رحیم و کریم ہم سب کو ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے اور اپنی رحمت، عنایات، کرم اور فضل سے نوازتا رہے۔ آمین۔ اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

اپنی فطرت ہے یزیدوں سے بغاوت کرنا
شہر پہ ان کی حکومت ہے تو پھر سوچتے ہیں

☆......بھائی عبدالغفار عابد! آپ کے خط سے کچھ باتیں منہا کرنے پر معذرت! لیکن آپ کی تمام شکایات نوٹ کر لی ہیں اور ان کا ازالہ بھی ہو گا۔ ہر لکھنے والے کی عزت اور حرمت، ہمیشہ سے میرا ایمان رہا ہے اور رہے گا......اور ہاں! لکھاری کوئی بھی ''عام'' اور خاص نہیں ہوتا، اس کی تحریر عام یا خاص درجے کی ہوتی ہے۔ آپ نے خط کے آخر میں شعر بہت کمال تحریر کیا ہے۔ واہ دل شاد ہو گیا......!

آپ کیسا "سچی کہانیاں" چاہتے ہیں؟

قارئین کرام اور لکھاری دوستو! سچی کہانیاں آپ کا اپنا ماہنامہ تھا' ہے اور رہے گا۔ آپ سچی کہانیاں میں کیا تبدیلی یا اضافہ چاہتے ہیں؟ فوری طور پر خط تحریر کریں یا دفتری نمبرز پر گروپ ایڈیٹر سے فوراً رابطہ کریں۔ ہم آپ کی قیمتی آراء اور مشوروں کے منتظر ہیں۔

خوش خبری

ماہنامہ 'دوشیزہ' اور 'سچی کہانیاں' کے ایجنٹ حضرات اور قارئین کے لیے ادارہ پرل پبلی کیشنز بہت جلد انعامات کا ایک سلسلہ شروع کر رہا ہے......!

اِس انعامی سلسلے اور دیگر معلومات کے لیے......بس ذرا انتظار......!

ستمبر 2017ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: ....

مکمل پتا: ....

ستمبر 2017ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: .... تعداد صفحات: ....

نام: ....

مکمل پتا: ....

....

فون/ رسیل نمبر: ....

ستمبر 2017ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: .... مصنف: ....

دوم، عنوان: .... مصنف: ....

سوم، عنوان: .... مصنف: ....

نام: .... شہر: ....

انتقالِ پُر ملال

خواتین کے حقوق اور حرمت کی علمبردار معروف سماجی شخصیت فرزانہ رحمٰن گزشتہ دنوں زندگی کا حق ادا کرنے کے بعد اپنے مالکِ حقیقی کی طرف لوٹ گئیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز مرحومہ کے متعلقین کے غم میں شریک ہے اور مرحومہ کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔

احوال کی اس محفل میں آخری خط ہے کراچی سے محمد افضل خان صاحب کا، آپ لکھتے ہیں:

محترم ناصر بھائی! ''سچی کہانیاں'' اور آپ سے میری وابستگی مجھے ''احوال'' میں لے آئی ہے آئندہ ماہ کہانیوں پر سیر حاصل تبصرہ بھی موجود ہوگا۔ فی الحال تو میں ایک سوال کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ ''سچی کہانیاں'' میں مقبوضہ کشمیر میں، کشمیریوں پر ہونے والے بھارتی فوج کے مظالم اور حریت پسندوں کی کہانیاں شائع کیوں نہیں کرتے؟ میں ہی نہیں اور بھی بے شمار قارئین ایسی کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں' کشمیر کے حوالے سے ہی معروف انسان دوست بھارتی شاعر گلزار صاحب کی ایک بہترین نظم بھی آپ کے پیش خدمت ہے:

رات ہوئی تو خواب میں دیکھا
سرحد کے اُس پار سے کچھ مہمان آئے تھے
باتیں ساری دیکھی بھالی
چہرے سارے سنے سنائے
ہاتھ دھلائے' پیر دھلائے
صحن میں بھی آسن لگوائے
اور تندور پہ موٹے موٹے جو کے روٹ پکائے
ایک پوٹلی میں مہمان مرے
پچھلے سال کی فصلوں کا گڑ لائے
آنکھ کھلی تو کوئی نہیں تھا
ہاتھ لگا کے دیکھا تو تندور ابھی بجھا نہیں تھا
اور ہونٹوں پر گڑ کا ذائقہ اب تک چپک رہا تھا
خواب تھا شاید
خواب ہی ہوگا
سرحد پہ کل رات سنا ہے چلی تھی گولی
سرحد پہ کل کچھ رشتوں کا خون ہوا تھا

☆..... محمد افضل خان صاحب! ہمیں آپ جیسے سخن شناس، سخن فہم ادب دوست کا یہ سوال اچھا لگا، ہمارا آپ سے وعدہ ہے کہ صرف کشمیر ہی نہیں، فلسطین وغیرہ کے حوالے سے بھی کہانیاں آپ کی اور دیگر قارئین کی

بصارتوں کا رزق بنیں گی، گلزار صاحب کی کیا بات ہے! ان کی شاعری تو ہمارے دل سے مکالمہ کرتی ہے، آئندہ کہانیوں پر تبصرے اور اعلیٰ شاعری کے انتخاب کے ساتھ احوال میں آپ کی آمد کے منتظر رہیں گے......!

''احوال'' میں اجازت سے پہلے میری ''سچی کہانیاں'' کے تمام رائٹرز، قارئین اور احوالی دوستوں سے محبت بھری گزارش ہے کہ ''سچی کہانیاں'' آپ کا تھا، آپ کا ہے اور ہمیشہ آپ ہی کا رہے گا، میں آپ کی کہانیوں، خطوط اور دیگر تحریروں کا اس وعدے کے ساتھ منتظر رہوں گا کہ کسی صورت بھی آپ کے ساتھ اشاعت کے حوالے سے ناانصافی نہیں ہوگی......! اور اب اجازت سے پہلے پرل پبلی کیشنز کی دیرینہ دوست، معروف شاعرہ اور نثر نگار محترمہ شگفتہ شفیق صاحبہ کی ایک آزاد نظم ''عزم'' آپ کی بصارتوں کے رزق کی صورت پیش ہے، جس میں انہوں نے ماہ آزادی کے حوالے سے، وطنِ عزیز کے لیے اپنے جذبات کی صورت ہم سب کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔

عزم

یہ میری زمیں ہے
یہ میرا وطن ہے
پہاڑوں کی جھرمٹ میں بہتے ہیں جھرنے
گلابوں کے کنج اور ریشم سے سبزے
بہت پیارے دِکھتے ہیں درخت اور بوٹے
بہادر جیالوں کی یہ سرزمیں ہے
رہتا ہے جویاں پر اس کا مکیں ہے
میرا وطن ہے بہاروں کا مسکن
بھرا رہے اس کا پھولوں سے دامن
میری اس زمیں میں شہیدوں کا خوں ہے
میرے دل میں میرا وطن ہے دھڑکتا
میرا مرنا جینا رہے گا یہاں
میں اپنے جیالوں کے آگے چلوں گی
میں مٹ جاؤں گی پر مٹانے نہ دوں گی
میں اس پر کوئی آنچ آنے نہ دوں گی
میں قربان کردوں گی اپنا اثاثہ
دیکھے گی دنیا عجب یہ تماشا
میری سوہنی دھرتی کو آلودہ کرنے
کہاں سے آئے ہیں یہ کالے سائے
جو خوف و دہشت کی بس ہیں علامت
نہیں چلتا جن پر محبت کا جادو
جو پل بھر میں نگری میں آفت مچادیں
کوئی ان کو ڈھونڈے نکالے یہاں سے
اس پیاری دھرتی سے باہر بھگادے
سنو! میری اس پاک دھرتی کے دشمن
کبھی بھی، کہیں بھی، نہ تم سے ڈرے ہیں
اس بات پر اپنی بس ہم اڑے ہیں
جو ٹیڑھی نگاہ ڈالی تو سن لو قسم سے
مچادیں گے آفت نکالیں گے آنکھیں
پھر تم ہمیشہ تڑپتے رہو گے
کفِ افسوس ہر دم ملتے رہو گے
یہ میرا نہیں سارے لوگوں کا وعدہ
وطن کے لیے جاں ہنس کے دیں گے
سرخرو ہم رہیں گے......!

☆

اجازت کا طالب ناصر رضا
پھر ملیں گے اگر خدا لایا!

ماہ آزادی کے حوالے سے یادگار کہانی

نو بہ نو حیرت کدے

شازیہ صدیقی

تحریکِ آزادیِ پاکستان کی ایک پُراثر کہانی



ہمارا گھر موتی جھیل کے بالکل سامنے تھا۔ اثنالی پوسٹ والی گلی میں۔ یہ قصبہ الہٰ آباد کے نواح میں واقع ہے۔ میرے والد کی درزی کی دکان تھی جہاں ان کے علاوہ بہت سے کاریگر بھی کام کرتے تھے۔ یہ دکان، بہت زیادہ بڑی تو نہیں تھی لیکن اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ سفید پوشی کا بھرم قائم تھا۔ والدہ صاحبہ نہایت کفایت شعار اور امور خانہ میں ماہر خاتون تھیں جس کی وجہ سے ہمیں کبھی تنگدستی کا احساس نہیں ہوا۔ میرے علاوہ بڑے بھائی، کلثوم آپا اور چھوٹی زینب گھر میں تھیں۔ کلثوم آپا اور بھائی جان کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ آپا بیاہ کر حیدر آباد دکن چلی گئیں کیونکہ ان کی سسرال وہیں تھی۔ کچھ دنوں میں تو ہم نے ان کی کمی بہت زیادہ محسوس کی لیکن دھیرے دھیرے مریم بھابی نے جو لکھنوی پس منظر رکھتی تھیں، ہمارا دل جیت لیا۔ اب ہمیں آپا سے زیادہ مریم بھابی سے انسیت ہو گئی تھی اور جب بھی وہ بھائی جان کے ساتھ اپنے میکے لکھنؤ کچھ دنوں کے لیے چلی جاتیں تو ہم انہیں بہت یاد کرتے۔ اس وقت میری عمر تقریباً گیارہ سال اور زینب کی سات برس تھی۔ زندگی بہت خوشگوار تھی جیسے ہولی کے دن، رنگوں اور مستیوں میں ڈوبے ہوئے۔

ہمارے پڑوس میں بابو امرناتھ کی فیملی تھی۔ امرناتھ کے دو بچے تھے، راجندر ناتھ مجھ سے تھوڑا بڑا لیکن قد کاٹھ میں کچھ کم ہی تھا کیونکہ بھائی جان کے ساتھ رہ کر میں بھی بچپن سے صحت بنانے اور ورزش کرنے پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ میں نے آپ کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ بھائی جان آرمی میں تھے۔ ابا جی کو ان کا آرمی جوائن کرنا قطعی پسند نہیں تھا کیونکہ وہ انگریزوں کی غلامی کے سخت خلاف تھے لیکن بھائی کے شوق اور ضد کے آگے خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آزادی کی تحریک ایک چنگاری کی صورت دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی۔ ابھی اس چنگاری کی تپش عام لوگوں کے دلوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ابا جان بھی اندر اندر ہی مسلم لیگ کے حامیوں میں شامل ہو گئے تھے لیکن سیاست کی یہ آگ ابھی بچوں تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ راجندر ناتھ (راجو)، کلپنا (راجو کی بہن جو زینب کی ہم عمر تھی) میں اور زینب سب ساتھ ہی کھیلتے شرارتیں کرتے کبھی جھیل پر چلے جاتے، مچھلیاں پکڑتے اور اماں سے پکوا کر کھاتے۔ شاردا موسی کے ہاتھ میں بھی غضب کا ذائقہ تھا۔ میں تو جب تک ان کے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی چیز نہ کھا لیتا، مجھے لگتا میرا پیٹ ہی نہیں بھرا۔ موسی بھی میری اس عادت سے واقف تھیں اس لیے روزانہ ہی میرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور بھیجتی تھیں ادھر راجو ماں سے ضد کر کے کباب اور کوفتے بنواتا اور مزے لے کر کھاتا۔ امرناتھ بابو برہمن تھے اس لیے ان کے یہاں ماس (گوشت) کھانا سختی سے منع تھا اور راجو کو دنیا میں اگر کوئی کھانا پسند تھا تو وہ گوشت کے پکوان تھے۔ اماں کبھی کبھی اسے ڈانٹتیں اور موسی کا ڈراوا دیتیں مگر وہ اماں کے سامنے ایسی مسکین صورت بناتا کہ ان کا دل پگھل جاتا۔

کلپنا روز صبح موسی کے ساتھ مندر جاتی۔ جاپ کرنا اور رامائن پڑھنا سیکھتی کیونکہ اسے اپنے مذہب سے بہت زیادہ لگاؤ تھا لیکن جب ہم سب بچے ساتھ ہوتے تو کوئی ہندو، مسلمان نہ رہتا۔ سب کا ایک ہی مذہب ہوتا۔ پیار اور آشتی کا مذہب۔ کوئی بھی تہوار ہوتا ہم مل کر مناتے، ہولی میں خوب رنگ اڑاتے دیوالی، شب برات میں دیوں اور پٹاخوں سے خوب خوب لطف اندوز ہوتے۔ عید کی مبارکباد سب سے پہلے امرناتھ فیملی ہی دیتی۔ یہ صرف دو خاندانوں کی محبت ہی نہ تھی بلکہ ساری بستی سارا الہٰ آباد ایسی محبت کی داستانوں سے بھرا پڑا تھا۔

☆......☆

وقت آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔ ہم سب بچپن کو الا نگتے پھلا نگتے جوانی کی دہلیز پر پہنچ گئے۔ میری عمر اس وقت اٹھارہ سال تھی۔ ان دنوں زینب کی شادی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ہمارے گھر میں ویسی ہی خوشحالی تھی بس اگر فرق پڑا تو اتنا کہ امرناتھ بابو اور ابا جان کے درمیان پہلی سی دوستی نہیں رہی تھی۔ راجو کے دل میں بھی اب ہمارے لیے محبت ختم ہو چکی تھی بلکہ سچ پوچھیں تو میرے دل میں بھی کدورت آ گئی تھی۔ وجہ نہایت معمولی تھی لیکن رائی کا پہاڑ بنانے والوں نے اس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا یہ کہ ہولی کے دن تھے ہم سب خوش خوش شرارتیں کرتے ایک دوسرے کو رنگنے میں مصروف تھے۔ ہندو مسلم دونوں گھرانوں کے لڑکے بالے اس تہوار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ عصر کا وقت تھا۔ موذن صاحب جن کی سب لوگ خواہ وہ ہندو ہی کیوں نہ ہوں بہت عزت کرتے تھے۔ اذان دینے مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ کسی شوخ لڑکے نے ان پر رنگ کی پچکاری مار دی۔ مولوی صاحب کو تو جیسے کسی ایسے ہی وقت کا انتظار تھا انہوں نے واویلا مچایا کہ خدا کی پناہ۔ رنگ پھینکنے والا لڑکا بار بار قسمیں کھا رہا تھا کہ مولوی صاحب غلطی ہو گئی۔ قسم سے میں نے آپ پر جان بوجھ کر رنگ نہیں پھینکا۔ آپ اچانک ہی سامنے آ گئے مگر مولانا اپنی بات پر اڑے رہے۔

''مولوی صاحب دیکھیے وہ معذرت کر رہا ہے غلطی ہو گئی بچہ ہے'' میں نے آگے بڑھ کر مولوی صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''غلطی ہو گئی حد کرتے ہو میاں تم! ایک تو مجھے ناپاک کر دیا اوپر سے تم آ گئے اس کی سفارش لے کر۔'' مولوی صاحب بھڑک کر بولے۔ پھر فوراً ہی مجھے سر سے پاؤں تک گھورنا شروع کر دیا'' کہیں تم خان عنایت علی کے بیٹے تو نہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی جی بزرگوار بالکل صحیح پہچانا آپ نے''

میں نے بات کا زجبد لتے دیکھ کر جلدی سے کہا کہ کہیں مولوی صاحب پھر شروع نہ ہو جائیں۔ میں خان شجاعت علی ہوں۔ بچپن میں آپ کے پاس قرآن مجید پڑھنے آتا تھا۔'' میں نے انہیں اپنی پہچان کروانا چاہی تاکہ وہ کچھ ٹھنڈے پڑ جائیں لیکن اس کا اثر بالکل الٹا ہوا۔ میرا نام سن کر مولوی صاحب ایک دم غصے میں بھر گئے۔

''نا ہنجار، نالائق! اس لیے میں نے تجھے تعلیم دی تھی کہ تو ان ناپاک لوگوں کے ساتھ رنگ رلیاں منائے۔ یہی سکھایا تھا میں نے تجھے؟ خوب روشن کر رہا ہے اماں باوا کا نام۔''

''مولوی صاحب اللہ کے واسطے خاموش ہو جائیے۔ یہ سب میرے دوست ہیں۔ ہندو ہیں تو کیا ہوا؟ انسان تو ہیں ناں۔'' میں نے دھیرے سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کیونکہ میں راجو اور دوسرے ہندو لڑکوں کے تیور بدلتے دیکھ رہا تھا۔

''بس لڑکے بہت ہو گیا، ہمیں زیادہ انسانیت مت سکھاؤ اور کان کھول کر سن لو۔ ہندو مسلمان کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ دریا کے دو کنارے ہیں۔ آئی بات سمجھ میں۔ عنایت میاں تو خوب بولتے ہیں مسلم لیگ کی حمایت میں اور بیٹا چلا ہے ہندوؤں سے دوستی نبھانے۔'' مولوی صاحب بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں نے دیکھا سارے ہندو لڑکے ایک طرف ہو گئے اور ہمیں غصیلی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''شجاعت، تمہارے پتا مسلم لیگی ہیں ناں!'' یہ راجو تھا جو مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

میں خاموش کھڑا تھا۔ کیا جواب دیتا؟ مجھے پتہ نہیں تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ ہاں یا نہیں؟ شاید نہیں لیکن میں جھوٹ کیوں بولوں، مسلم لیگی ہونا کوئی گناہ تو نہیں۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں؟'' میری خاموشی پر راجو نے مجھے ٹوکا۔

''ہاں شاید لیکن تمہارے والد بھی تو کانگریس کے اہم رکن ہیں۔'' میں نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔

''کانگریس کا رکن ہونا کوئی جرم نہیں، کانگریس تو پورے انڈیا کی، سارے ہندوستانیوں کی ترجمانی کرتی ہے اور مسلم لیگ ہماری مخالف ہماری دشمن جماعت ہے۔'' یہ سنجیو کپور تھا، ہمیشہ کا جھگڑالو۔

''غلط کہہ رہے ہو تم مسلم لیگ کسی کی دشمن نہیں۔ وہ صرف مسلمانوں کی رہنمائی کرتی ہے اور بس، اور تمہارے کانگریسی لیڈر جلسوں میں سوائے ہندوازم کے اور کوئی بات ہی نہیں کرتے۔ محض بہلاوا ہے یہ سب کانگریس ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب کا بھلا سوچتی ہے۔'' زاہد بھلا کیوں پیچھے رہتا۔ اس نے بھی ٹکا سا جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ بات بڑھتی محلے کے کچھ بڑوں نے بیچ میں پڑ کر سب کو سمجھایا اور سب اپنے دلوں میں نفرت کی چنگاری سلگاتے گھروں کو لوٹ گئے۔ اس دن سے امرناتھ بابو نے ابا جان سے بات کرنا چھوڑ دی اور راجو کو دیکھ کر تو ایسا لگتا جیسے اس کی آنکھوں میں آتش فشاں پک رہا ہے جو اللہ جانے کب پھٹ پڑے۔ ایک کلپنا تھی جو ان حالات میں بھی کبھار زینب سے ملنے چلی آتی۔

☆......☆

بھائی جان کے یہاں تیسرے بچے کی ولادت ہوئی تھی۔ کلثوم آپا بھی ان دنوں آئی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے دو شرارتی، نٹ کھٹ سے بچے بھی تھے۔ رمضان کا مہینا شروع ہو گیا تھا اور آپا کا پروگرام اس دفعہ یہیں عید منانے کا تھا۔ عید کے بعد زینب کی شادی تھی۔ شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ آج ابا جان کپڑے کی خریداری کے لیے بڑی مارکیٹ گئے تھے۔ بھائی جان چھٹی پر آئے ہوئے تھے لہٰذا گھر میں خوب رونق تھی۔

ابا جب بھی کپڑے لینے بڑی مارکیٹ جاتے عموماً رات گئے ان کی واپسی ہوتی اس لیے ہم سب اطمینان سے بیٹھے تھے۔ عشا کی نماز کے بعد میں اور بھائی جان جھیل کے کنارے آ کر بیٹھ گئے۔ میں بھائی جان کو مولوی صاحب پر رنگ پھینکنے اور پھر راجو سے تکرار ہونے والا واقعہ سنا رہا تھا کیونکہ ان دنوں بھائی جان ڈیوٹی پر تھے۔ اسی وقت سڑک پر کچھ ہلچل سی دکھائی دی۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ میں نے بھائی کو اشارہ کیا تو وہ بھی ادھر ہی دیکھنے لگے۔

لوگ تیز تیز بھاگ رہے تھے۔ میں وجہ جاننے کے لیے ادھر جانے پر غور ہی کر رہا تھا کہ کچھ لوگ سر پر چارپائی اٹھائے دوڑتے ہوئے ہماری گلی میں داخل ہوئے۔ ہم دونوں بھائی چوکنا ہو کر گلی کی طرف بھاگے اور پھر ہم نے دیکھا وہ لوگ ہمارے دروازے پر جا کر رک گئے تھے۔ بھائی جان نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں بتایا کہ یہ ان کا گھر ہے اور پھر ان لوگوں نے جو کچھ بتایا، اس سے میرے حواس ایک دم غائب ہو گئے۔ مجھے کسی نے تیز دھوپ میں میرے سر سے سائبان چھین کر مجھے تنہا جلنے کے لیے چھوڑ دیا ہے مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ بھائی جان مجھے سہارا دے کر گھر کے اندر لے گئے۔ سامنے چارپائی پر ابا جان کی لاش پڑی تھی۔ وہ کپڑے خرید کر مارکیٹ سے لوٹ رہے تھے کہ کسی نے انہیں گولیوں سے چھلنی

کر دیا تھا۔ صرف ابا ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ مارے گئے تھے اور زخمیوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا مارکیٹ میں زیادہ تر دکانیں مسلمانوں کی تھیں۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں میں بھی تقریباً سارے ہی مسلمان تھے۔

☆......☆

پھر تو اس طرح کی وارداتیں معمول بن گئیں، آئے دن مسلمانوں کے علاقوں میں ہندو بلوائی حملہ کرتے۔ ان کے پاس چھرے، بھالے، ہنسوے اور ڈنڈے ہوتے۔ چند ایک کے پاس رائفلیں بھی ہوتیں۔ ابھی تک ہمارا علاقہ ان بلوائیوں کے حملوں سے بچا ہوا تھا کیونکہ یہاں ہندو مسلمانوں کی مدد کر رہے تھے۔ لیکن کئی دنوں سے ہندوؤں کے تیور خطرناک لگ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ آج ستائیسوں شب تھی۔ تمام لوگ گھروں میں عبادت میں مصروف تھے۔ میں بھی نماز پڑھ کر پہرے پر چلا گیا۔ جب سے مختلف جگہوں پر حملے کی خبریں ملی تھیں، ہم بھی محتاط ہو گئے تھے۔ رات کو کچھ لڑکے گلی کا پہرہ دیتے رہتے تھے اور آج کی رات تو فیصلے کی گھڑی تھی۔ خبروں سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ آر یا پار۔

اللہ اللہ کر کے رات کٹی۔ اس وقت میں گھر سے کچھ دور دوستوں کے ساتھ ایک اسکول کی چھت پر بیٹھا تھا، جب محمد خان ہانپتے ہوئے آیا ''ارشد، زاہد، شجاعت، حمید کہاں ہو تم سب؟'' اس نے ہمیں آوازیں دیں تو ہم سب دوڑتے ہوئے نیچے آئے۔

''کیا بات ہے محمد خان؟ خیریت تو ہے ناں!'' ہم میں سے کسی نے پوچھا۔

''پاکستان بن گیا دوستو! پاکستان بن گیا۔ ہم آزاد ہو گئے۔'' اس کی آواز شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں کیسے پتہ چلا؟'' یہ میں تھا۔ مجھے محمد خان کی ذہنی حالت پر شبہ ہو رہا تھا۔ کہاں پاکستان کے نام پر بستی کی بستی اجاڑی جا رہی تھی، پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے والوں کی زبانیں کاٹی جا رہی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا کہ پاکستان بن گیا۔

''ہاں، ہاں شجاعت! میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے آل انڈیا ریڈیو پر سنا ہے اور لندن میں ریڈیو نے اس خبر کی تصدیق کر دی ہے۔'' ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں، ہندو بلوائیوں نے حملہ کر دیا ہے، لیکن نہیں شاید میں غلط کہہ رہا ہوں وہ بلوائی نہیں تھے' ہمارے اپنے سنگی ساتھی تھے۔ وہ جوان جن کے ساتھ ہمارا بچپن بیتا تھا، ہاتھوں میں ڈنڈے، چاقو لیے، مسلمانوں کا قتل عام کر رہے تھے۔

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ان کے کپڑے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ میری گلی کے ہی لڑکے تھے۔ راجو، راکیش، اجے اور بہت سے دوسرے۔ ان سب کی رہنمائی سنجیو کر رہا تھا وہ کہہ رہا تھا ''ختم کر دو ان سالے مسلمانوں کو، جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں، انہوں نے ہماری دھرتی ماتا کے ٹکڑے کیے ہیں ہم ان کے ٹکڑے کر دیں گے۔'' اس کی تقریر ختم ہوئی اور وہ سب جے کار بلند کرتے ایک طرف کو چل پڑے۔

میں اپنے گھر جانا چاہتا تھا لیکن ہر طرف ہندو ہمارے خون کے پیاسے بنے گھوم رہے تھے۔ میرے دوستوں نے کہا ''تھوڑی دیر بعد ہم ایک ایک کر کے نکلنے کی کوشش کریں گے اگر گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو ٹھیک ورنہ یہاں کب تک روپوش رہ سکتے ہیں؟''

میں شام ڈھلے چھپتا چھپاتا اپنے گھر پہنچا لیکن گھر میں سناٹے نے میرا استقبال کیا۔ پورا گھر کھلا پڑا تھا لیکن گھر والے؟ میں نے باری باری سب کو آوازیں دی مگر جواب ندارد۔ مجھ پر عجب وحشت طاری تھی ''کہاں گئے سب؟'' ایک ہی سوال دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ اگر خدانخواستہ بلوائیوں نے حملہ کیا ہوتا تو یقیناً ان سب کی لاشیں یہاں موجود ہوتیں۔

میں سوچوں میں گم خالی گھوم رہا تھا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ کوئی دبے قدموں گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ میں فوراً ایک طرف کو چھپ گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر آنے والے کا ارادہ نیک نہ ہوا تو وہ آج میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔

''شجاعت بھائی آپ کہاں ہیں؟'' یہ کلپنا کی آواز تھی جو مجھے پکار رہی تھی۔ میں سامنے آ گیا۔ کلپنا کو دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

''شجاعت بھائی یہ تو میں نہیں جانتی کہ سب کہاں ہیں البتہ آپ کی ماں جی میرے گھر میں ہیں۔ میں دوپہر کو گھر والوں سے چھپ کر ملنے آئی تو دیکھا ماں جی گھر میں اکیلی تھیں۔ میں نے انہیں اپنے گھر کی کوٹھری میں لے جا کر چھپا دیا۔ یہ بات بھیا اور پتا جی کو نہیں معلوم۔ وہ لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ابھی آپ سب نے سب کو آوازیں دی تو میں آپ کو بتانے چلی آئی۔''

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ راجو اور امرناتھ جی کہاں ہیں لیکن میں نے کلپنا کے سامنے اس کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کچھ بھی تھا بہر حال وہ میری محسنہ تھی۔ اس نے میری ماں کی حفاظت کی تھی۔

''کلپنا! اماں کو لے کر آؤ۔ میں اماں سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بیقراری سے کہا۔

وہ تھوڑی ہی دیر میں اماں کو لے آئی۔ اماں نے بتایا کہ جب پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو اچانک ہی بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ تمام لوگ محلہ چھوڑ کر جا رہے تھے۔ میں نے صباحت کے ساتھ مریم، کلثوم، زینب اور سب بچوں کو بھیج دیا اگر زندہ رہے تو کہیں نہ کہیں مل ہی جائیں گے۔ لیکن اگر اس گھر میں رہتے تو سارے مارے جاتے۔ میں تمہارے انتظار میں رہ گئی تھی کلپنا مجھے اپنے گھر لے گئی ورنہ شاید مجھے تمہاری لاش ہی ملتی۔''

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ کلپنا اپنے گھر سے دھوتی، کرتا اور ساڑی لے کر آ گئی اور ہم سے کہنے لگی ''ماں جی اور شجاعت بھائی! آپ لوگ یہ کپڑے پہن کر یہاں سے نکل جائیں۔ رات ہونے والی ہے اور اندھیرا ہونے کے بعد نکلنا آسان ہوگا۔ اس علاقے کے باہر آپ لوگوں کو ان کپڑوں میں سب ہندو ہی سمجھیں گے۔''

ماں کو اور سچ پوچھیں تو مجھے بھی یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔ میں نے کپڑے تبدیل کر لیے اور کلپنا نے ماں جی کو بھی کسی طرح راضی کر کے ساڑی باندھ دی۔ ہمیشہ کرتے پاجامے میں ملبوس رہنے والی اماں ساڑھی باندھ کر الجھن محسوس کر رہی تھیں اور سب سے بڑی بات وہ بغیر برقعہ کے باہر نکلنے پر راضی ہی نہیں تھیں لیکن پھر پتہ نہیں کیسے، شاید میری زندگی کی خاطر وہ چلنے پر رضا مند ہو گئیں۔ کلپنا نے میرے ماتھے پر بڑا سا ٹیکا لگا دیا تا کہ ہمارا پہناوا بناوٹی نہ لگے میں سوچ رہا تھا کہ کلپنا بھی تو اسی دھرتی کی بیٹی ہے، وہ بھی تو ہندو ہے پھر ہماری خاطر اتنا کچھ کیوں کر رہی ہے اور دوسرے ہی لمحے مجھے اس کا جواب مل گیا۔ کلپنا کہہ رہی تھی ''سارے ہندوستان میں مسلمانوں کو جس بیدردی سے مارا جا رہا ہے، اس کی مجھے خبر ہے لیکن میری تمنا ہے آپ لوگ خیریت

سے اپنے ملک پہنچ جائیں اور جب کبھی ہندوستان کو یاد کریں تو مجھے بھی یاد کریں اور اپنے لوگوں کو بتائیں کہ سارے ہندو امر ناتھ اور راجندر نہیں ہوتے کچھ کلپنا جیسے بھی ہوتے ہیں۔ اچھائی اور انسانیت کسی کی میراث نہیں۔ ہندوؤں میں بھی اچھے لوگ ہوتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

ہم وہاں سے چھپتے چھپاتے چل پڑے۔ ہمیں خبر نہیں تھی کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ ہماری منزل کہاں ہے؟ ہمیں تو اتنی خبر بھی نہیں تھی کہ ہم کن راستوں سے گزر رہے ہیں۔ کئی دن کے سفر کے بعد ہم ایک گاؤں میں پہنچے۔ یہ ایک بڑا گاؤں تھا۔ جہاں راجپوتوں کی آبادی تھی۔ نصف ہندو راجپوت اور نصف مسلمان تھے۔ ماں کی حالت بہت خراب تھی۔ یہاں کے لوگ ہمیں مغربی پنجاب سے آئے ہوئے ہندو مہاجرین سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ ایک ہندو راجپوت ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ اتنے دنوں بعد پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔ اب ماں کی حالت بھی کچھ سنبھل گئی تھی اور مجھے بھی سکون کا احساس ہوا تھا۔ تین چار دن تو ہم یہاں آرام سے رہے لیکن مجھے ہر دم دھڑ کا لگا رہتا کہ کوئی ہماری اصلیت نہ جان لے۔ گاؤں کے ہندو راجپوتوں نے فیصلہ کیا کہ گاؤں کے مسلمانوں کو ہندو بننے پر مجبور کریں گے اور اگر انہوں نے انکار کیا تو انہیں تہ تیغ کر کے ان کی لڑکیوں کو اغوا کر لیں گے۔

انہوں نے مسلمانوں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ دراصل ہندو ہی تھے انہیں جابر مسلمان حکمرانوں نے زبردستی مسلمان بنایا تھا اور اب ان کے پاس مناسب موقع ہے کہ ہندو بن کر اپنے بھائیوں کے ساتھ مل جائیں لیکن غیرت مند مسلمانوں نے یہ گوارا نہ کیا اور اس طرح اس گاؤں میں بھی دو گروہوں میں قتل و غارت گری کی نوبت آ گئی۔ خون کی ہولی میں اعلیٰ ذات کے ہندو چھوٹی ذات کے ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔ پورے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو سر چھپانے کی کہیں جگہ نہ تھی بلکہ پورے ہندوستان کا یہی حال تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میں اس وقت ضلع انبالہ (جو بعد میں ہریانہ اور بھارتی پنجاب میں تقسیم ہوگیا) کے قصبے ساھوڑہ (جو کبھی سندورہ کہلاتا تھا) کے نواح میں موجود گاؤں میں پناہ لیے ہوئے تھا۔

ایک دن صبح میں کرتا اتارے ہاتھ منہ دھو رہا تھا کہ امرتا آ گئی۔ امرتا لالہ ارجن کپور کی بیٹی تھی جن کے گھر میں ہم پناہ لیے ہوئے تھے۔ تھوڑی پڑھی لکھی اور بہت زیادہ باتونی تھی۔ اس نے آتے ہی مجھے گھورنا شروع کر دیا۔

''ایک بات پوچھوں'' اس نے مجھ سے کہا۔

''ہاں پوچھو۔'' یہ میرا جواب تھا۔

''تمہارا نام پریتم کمار ہی ہے نا؟''

''ہاں لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' میں نے کرتا پہنتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن تمہارے بازو پر خان شجاعت کیوں گودا ہوا ہے؟''

اس کی یہ بات مجھے چونکا گئی۔ اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اصل میں ہندو لڑکے اپنے بازوؤں اور پیٹھ پر مختلف دیوی دیوتاؤں کی تصویریں اور نام گدواتے تھے۔ انہی کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنے ایک بازو پر اپنا نام اور دوسرے پر مور کی تصویر بنوائی تھی لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی اس طرح بھی مجھے پہچان سکتا ہے۔ میں نے امرتا کو ٹالنے کے لیے کہا ''میرا ایک دوست تھا خان شجاعت میں نے اس کا نام اور اس نے میرا نام

اپنے بازو پر گدوایا تھا۔ اصل میں اس طرح ہم ایک دوسرے پر اپنی سچی دوستی ظاہر کر رہے تھے۔ بہت پہلے بچپن کی بات ہے۔'' لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میری بات سے مطمئن نہیں ہوئی ہے اور یقیناً یہ بات اب وہ اپنے باپ کو بتائے گی اور اس کے بعد...... اس سے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا۔

میں اماں کو لے کر وہاں سے نکل پڑا۔ اب یہ ہندووانہ بھیس بدلنا بے کار تھا۔ جو ہوگا دیکھا جائے۔ میں مسلمانوں کی آبادی میں آ گیا اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کر کے مدد کی درخواست کی۔

انہوں نے مجھے گلے سے لگالیا۔ ہندو راجپوتوں کا ظلم حد سے بڑھ گیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے بوڑھوں، بچوں اور جوانوں کو قتل کر دیتے اور لڑکیوں کو اغوا کر لیتے۔ جب یہ صورت حال حد سے بڑھ گئی تو مسلمانوں نے اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے ایک بہت ہی بھیانک فیصلہ کیا انہوں نے اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو ایک رات جمع کیا اور اپنے ہاتھوں سے ذبح کر کے کنویں میں ڈال دیا اور تلواریں بھالے لے کر ہندوؤں کے مقابلے کے لیے نکل پڑے۔

میں ایک قافلے کے ساتھ انبالہ ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ انبالہ ریلوے اسٹیشن مکمل طور پر ویران پڑا تھا۔ دوسری طرف لائن پر ایک ٹرین کھڑی تھی جس کے ڈبوں میں لاشیں پڑی تھیں اور پوری ٹرین خون سے رنگین تھی۔ ہم ایک ٹرین میں سوار ہو کر لدھیانہ پہنچے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شہریوں کو لدھیانہ چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ شہر میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی اور لوگ شہر چھوڑنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو رہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کا مسافر خانہ لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ شہر کی طرف سے لوگ سیلاب کی طرح امڈے چلے آ رہے تھے۔ عورتیں، ننگے پاؤں، کھلے سر، چھوٹے چھوٹے بچوں کو گود میں لیے۔ چھوٹی بڑی گٹھری سنبھالے اپنے گھروں کو چھوڑ کر اس آس کے ساتھ ریلوے اسٹیشن آ رہی تھیں کہ بس ابھی ٹرین میں سوار ہو کر پاکستان پہنچ جائیں گے۔ وہاں اسٹیشن پر بھی لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ مسلح سکھ شہر کی طرف سے آنے والے نہتے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے نقدی اور زیورات چھین رہے تھے اور لوگ پاکستان آنے کی امید میں لٹ رہے تھے۔ برباد ہو رہے تھے لیکن کسی کے لب پر حرف شکایت نہیں تھا۔

وہاں بلوچ رجمنٹ کے کچھ فوجیوں نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم قافلے کی شکل میں جگراؤں کیمپ کی طرف چل پڑے۔ لدھیانہ سے جگراؤں کا فاصلہ تقریباً تیس میل ہے۔ راستے میں ہم سے اور بھی قافلے ملتے گئے جو اپنے گھروں سے کیمپ جانے کے لیے رواں دواں تھے۔ ہم سب پیدل یا بیل گاڑیوں میں سوار کیمپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس پر مزید ستم یہ کہ ریلوے پار سے مسلح سکھ گروہوں کی شکل میں قافلوں پر حملے کرتے۔ سڑکیں مسلمانوں کی لاشوں سے پٹی پڑی تھیں۔

جگراؤں کیمپ سے ہم جالندھر کی طرف بڑھے۔ قتل ہوئے، لٹتے لٹاتے ہم جالندھر پہنچے اور وہاں سے ٹرین کے ذریعہ لاہور آ گئے۔ ہم شاید خوش قسمت تھے جو زندہ سلامت لاہور پہنچ گئے ورنہ وہاں آنے والی زیادہ تر ٹرینیں سوائے ڈرائیور کے کٹی پٹی لاشوں سے بھری ہوتی تھیں۔ فوجی جوان لاشوں کو دفنانے اور زندہ رہ جانے والوں کو کیمپ میں پہنچانے کا کام کر رہے تھے۔ مجھے ایک کیمپ میں جگہ ملی۔ یہاں ماں کو بھی صحیح علاج کی سہولت میسر آئی اور دوائیاں دی گئیں لیکن شاید ماں نے اتنی صعوبتیں پاکستان پہنچنے کے لیے برداشت کی تھیں۔ پاکستان

پہنچنے کے دسویں روز ماں کا انتقال ہوگیا۔ میں نے اپنے بھائی بہنوں کو بہت تلاش کیا، مہاجروں کے لیے لگائے گئے تقریباً تمام کیمپوں میں انہیں ڈھونڈا۔ فوجی ہیڈ کوارٹر میں جا کر ان کا نام پتا درج کروایا کہ شاید فوجیوں کے ساتھ ان کا تبادلہ ہوگیا ہو لیکن کہیں کچھ پتا نہ چل سکا اور پھر میں نے صبر کرلیا کہ آزادی کی خاطر شہید ہونے والے پندرہ لاکھ مسلمانوں میں شاید وہ لوگ بھی شامل ہوں۔

لاہور کیمپ سے بھائی بہنوں کی تلاش میں، میں کراچی چلا آیا۔ کراچی میں آ کر سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر رہنے لگا اور پھر کچھ روز مزدوری کرتا رہا۔ اس وقت یہاں نئی آبادیاں زور و شور سے بن رہی تھیں۔ میں نے بھی اس شہر کی تعمیر میں اپنا حق ادا کیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے مجھے بھی پلاٹ الاٹ کیا گیا۔

میں نے یہاں آ کر درزی کی دکان کھولی تھی کیونکہ یہ فن مجھے ورثے میں ملا تھا اور پھر ترقی کرتے ہوئے اس چھوٹی سی دکان کو ایک ہوزری کی فیکٹری کی شکل دے دی۔ آج میں ایک چھوٹی سی ہوزری فیکٹری کا مالک ہوں۔ میرے بچے کلثوم، زینب اور عنایت ہیں۔ مجھے لگتا ہے میں نے اپنے بھائی بہنوں کو پالیا ہے۔ میں بہت خوش تھا۔ اپنے آزاد ملک میں لیکن آج میں دکھی ہوگیا ہوں کیونکہ میرا پوتا جو ہو بہو میرے بھائی کی تصویر ہے، خان رفاقت علی جونیئر میں نے اسے ہمیشہ بھائی جان کی شکل میں دیکھا اور بہترین صلاحیتوں کا حامل ہونے کے باوجود آج اسے صرف اس وجہ سے سرکاری نوکری نہیں مل رہی ہے کہ اس کے پاس کراچی کا ڈومیسائل ہے اور اس کا دادا ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا۔ کاش! پاکستان میں بھی دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح میرٹ کا خیال رکھا جاتا تو مجھے یہ پچھتاوا نہ ہوتا!

ہمارے رہنما!

قیام پاکستان سے قبل اکثر لوگ بانی پاکستان سے سوال کرتے تھے کہ پاکستان کیسے اور کیوں کر بنے گا۔ قائد کا جواب ہوتا' پاکستان اُسی روز بن گیا تھا جب برصغیر کا پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا دو قومی نظریہ کی سچائی اور حقانیت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اس ایک جملے میں بند ہے۔

رہنماؤں کا یہی یقین ان کی پیروکاروں کو ارادے کی قوت اور عمل کے لیے لگن عطا کرتا ہے۔ قائد اکثر انگریزی میں تقریر کرتے جبکہ ان کے سامعین کی اکثریت انگریزی سے نابلد ہوتی تھی۔ کسی ایسے ہی سامع سے کسی نے پوچھا کہ تمہیں انگریزی نہیں آتی قائد کی باتوں کو کیوں کر سمجھتے ہو۔ سامع کا جواب بھی ملاحظہ فرمایئے۔ قائد کی باتیں تو سمجھ میں نہیں آتیں لیکن اتنا جانتا ہوں جو کچھ وہ کہتے ہیں حق اور سچ ہے۔ اِس رشتے کو میں عوام کے اپنے لیڈر کے ساتھ رومانس سے تعبیر کرتا ہوں یہ بھی قیام پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔ قائد اعظم علیگڑھ یونیورسٹی گئے۔ قائد اعظم سرسید کے تعلیمی انقلاب سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور اس کے زبردست حامی۔ اس موقع پر انہوں نے ایک تاریخی جملہ ادا کیا ''علی گڑھ ایک چھوٹا پاکستان ہے۔ ہم پاکستان کو بڑا علیگڑھ بنائیں گے۔''

تعلیم کی اہمیت کو قائد سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا لہٰذا انہوں نے دو جملوں میں پاکستان کے مستقبل کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ یہ ہوتے ہیں رہنما اور یہ ہوتی ہے رہنمائی۔

نجیب عمر کی کتاب ''وسعتِ بیاں'' سے اقتباس

اس ماہ کی خصوصی کہانی

بازارِ عشق

محمد سلیم اختر

ایک مرحوم شاعر کی زندگی سے آباد، مگر برباد داستانِ عشق!



دکھی پریمی ایک گمنام شاعر تھے۔ ان کا اصل نام صابر حسین تھا۔ ان کا شاعری کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا، مگر انہوں نے سینکڑوں غزلیں لکھیں۔ جن میں سے کچھ اخبارات، خصوصاً جنگ اور نوائے وقت میں شائع ہوتی رہیں۔ تین برس قبل ان کا انتقال نہایت ہی کسمپرسی کی حالت میں ہوا تھا۔ ایک ملاقات میں، میں نے ان سے دکھی اور پریمی تخلص رکھنے کی وجہ جاننا چاہی تو انہوں نے مجھے اپنی پریم کہانی سنائی تھی۔ ان کا پریم ادھورا اور نامکمل رہا تھا۔ اس لیے وہ دکھی ہو گئے تھے۔

یہ عشق و محبت بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے۔ جو نہ تو عمر دیکھتی ہے اور نہ ہی ذات برادری کے بندی خانوں میں قید ہوتی ہے۔ یہ نہ تو اونچی اونچی پگڑیوں کو دیکھتی ہے اور نہ ہی دنیا کے تاج محلوں کو، یہ تو بس یونہی اچانک ہو جایا کرتی ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں ایک چور گھڑی ایسی بھی آتی ہے جب کوئی خود بخود آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتا ہے۔ دکھی پریمی نے تین عورتوں سے عشق کیا۔ مگر بدقسمتی سے ان کا ہر عشق ناکامی سے دوچار ہوا۔ انہوں نے اپنے ناکام عشق کی کہانی کچھ یوں بیان کی تھی۔

☆......☆

میں وہ دن نہیں بھلا پاتا جب میں راجا بازار کے پورے پانچ چکر لگا چکا تھا لیکن دل کا کرب کسی طور پر بھی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے راحت کیفے پر حسب معمول چائے کا پیالہ اور راٹھنی دے کر ثریا کے چار ریکارڈ سنے۔ بوبی پان شاپ سے پان بھی کھایا اور سگریٹ تو خیر ہر وقت میرے پاس رہتی تھی۔

نور سینما پر جا کر میں نے بڑے بڑے فلمی پوسٹروں کو بڑے غور سے دیکھا۔ اس کے سامنے مجمع لگانے والوں کا لیکچر میں پورے گھنٹے کے لیے سنا تھا مگر میرے دل کی بے کلی کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔ میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا اور میرے ہونٹ خشک ہوئے جا رہے تھے۔ جی کرتا تھا کہ بازار کے عین درمیان والی مسجد کے مینار پر چڑھ کر چھلانگ لگا دوں۔

اس دن سے قبل میں نے راجا بازار کو ماں کی گود کی طرح راحت سے بھرپور پایا تھا، جب بھی میری روح گھائل ہوئی، جب بھی میرے احساسات مجروح ہوئے یا جب بھی منشی گیری کرتے کرتے تھک جاتا تو میں راجا بازار ہی کا رخ کرتا تھا۔ اس کا ایک پھیرا میری ساری بے چینیوں، اداسیوں اور تھکن کو دور کر دیتا تھا، مگر اس روز میرا دردِ دل بے قابو ہو گیا تھا۔ راحیلہ کی بے وفائی سے بھی بڑھ کر میرے احساسات کو دھچکا لگا تھا۔ راجہ بازار کی مسجد کے سامنے ایک گلی تھی جسے ''پریم گلی'' کہا جاتا تھا۔ وہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں۔ رات کے اندھیرے میں حسن و عشق کے سودے ہوتے تھے، میری طرح کے کئی اور عاشق اور دل جلے راتیں وہاں گزارتے تھے اور جو لاکھوں پتی تھے وہ راجا بازار کے دوسرے کونے پر واقع ہوٹل پیراڈائز میں ٹھہرتے تھے۔ ان کا مال ہوٹل کے کمرے میں پہنچ جاتا تھا۔ اس گلی میں اور بازار میں میری آمد و رفت کا باعث راحیلہ تھی......وہ حسن اور رعنائی میں یکتا تھی۔ اس کی ایک ایک ادا پر تماشائی دل تھام کر رہ جاتے تھے۔ وہ واقعی بے حد حسین تھی۔ وہ اتنا نفیس سنگھار کرتی تھی کہ اس کا حسن و شباب دو آتشہ بن جاتا تھا۔ اس کے جسم کے نشیب و فراز قیامت ڈھاتے تھے۔ دل کی دھڑکنیں شور مچانے لگتی تھیں۔ وہ میرے دل کے نہاں خانوں میں خراماں اتر گئی تھی مگر اس کے چاہنے والے بے شمار تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ مجھے اس بازار میں لا کر کھڑا

کر دینے والی وہی تھی۔ میں حالات وواقعات کے سامنے ایک بے بس عورت کی طرح اس بازار کے سہارے زندہ تھا یہ جاننے کے باوجود کہ طوائف کسی کی نہیں ہوتی۔ میں اس کے ملن کی آس پر جی رہا تھا ۔اس بازار میں گاہک اپنی پسند کے کوٹھوں کا رخ کرتے تھے مگر میں اپنی تسکین کی تلاش میں گاہکوں تک پہنچتا تھا۔ میں نے اپنی سرکاری ملازمت کے زمانے کی خریدی ہوئی گھریلو اشیا چوری چوری یہاں کے دکانداروں کے پاس اونے پونے داموں فروخت کردیں تاکہ راحیلہ کی خاطر زندہ رہ سکوں۔

☆......☆

راحیلہ میری دوسری محبت تھی۔ میری پہلی محبت میری چچا زاد عذرا تھی۔ میں چھوٹا سا تھا کہ میرے والدین ایک حادثے میں چل بسے۔ چچا جان مجھے اپنے گھر لے آئے۔ انہوں نے مجھے پالا پوسا اور تعلیم بھی دلائی۔ ان کی ایک بیٹی تھی عذرا، بہت لاڈلی اور خوبصورت بھی۔ وہ میری ہم عمر تھی۔ پرائمری تک ہم نے ایک ہی اسکول میں اکٹھے پڑھا۔ عذرا مجھے بچپن ہی سے اچھی لگتی تھی۔ جب وہ جوان ہوئی تو اس کی خوبصورتی میں اور بھی نکھار آ گیا وہ ایک انتہائی خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی تھی، کتابی چہرہ، گندمی رنگ، موٹی موٹی غزالی آنکھیں۔ سیاہ چمکدار اور لمبے لمبے بال اور ہونٹوں کے نیچے تھوڑی سے اوپر ایک خوبصورت تل قیامت ڈھاتا تھا۔ ہم بچپن سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے وقت کے ساتھ ہماری چاہت میں اور بھی شدت آ گئی تھی۔ ہم نے سنگ سنگ رہنے کے وعدے کئے ہوئے تھے۔ مگر نہ جانے چچا اور چچی کو مجھ سے کیا دشمنی ہوگئی تھی کہ انہوں نے ہمارا ملن نہ ہونے دیا۔ میں نوکری کی تلاش میں تھا اور پھر مجھے محکمہ بحالیات میں کلرک کی نوکری ملی تو مجھے راولپنڈی بھیج دیا گیا۔

نئے شہر میں آ کر مجھے کچھ عرصہ تو لگا کہ میں نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہوجاؤں۔ چچا اور چچی نے میری دوری اور مجبوری کا فائدہ اٹھایا، انہوں نے عذرا کی شادی کسی اور شخص سے کردی۔ مجھے علم ہوا تو بہت دکھ ہوا۔ میں بہت رویا تھا اس روز...... میں کراچی آ گیا اور چچا سے لڑ جھگڑ کر واپس آ گیا۔ عذرا کی جدائی نے میرا سینہ چھلنی کردیا، دنیا سے جی اچاٹ ہوگیا۔ یہی غم اور دکھ مجھے راحیلہ کے پاس لے گیا اور اس کی سنہری زلفوں کی چھاؤں میں پناہ ڈھونڈی۔ میں ہر غم اور خوشی سے بیگانہ ہوگیا۔ دن میں جب تک میں اس کا دیدار نہ کرلیتا مجھے چین ہی نہ آتا تھا۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ راحیلہ کبھی مجھ سے شادی نہیں کرے گی وہ اپنے والدین کا کہا مانتی تھی اور ان کے کہنے پر ہی کبھی میرے نزدیک آتی اور کبھی کنارہ کش ہوجاتی۔ اس کے باوجود میرے دل میں ایک ہلکی سی امید باقی تھی اس کی زندگی میں، میں نے جو نغمہ رنگیں چھیڑا تھا وہ شعر جو میں نے اس کے کانوں کے قریب ہوکر گنگنائے تھے۔ خوبصورت شامیں چوری چوری کی ملاقاتیں۔ انگوٹھیوں کے تبادلے مجھے احساس دلاتے تھے کہ وہ مجھے نہیں چھوڑے گی، میں اسی امید کے سہارے زندہ تھا۔ یہ خوش فہمیاں جانے کیوں محبت کا حصہ قرار دی گئی ہیں۔ میری خوش فہمی میری جدوجہد میں مزید تیزی کا باعث بنتی۔ یوں میں نے عذرا کی جدائی کے غم کو بھلادیا۔ اور اسے دل کے چوکھٹے سے نکال پھینکا۔

☆......☆

میری زندگی میں اچانک ہی برا وقت آیا کہ مجھے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ میرے علاوہ کچھ اور لوگوں کو بھی نوکری سے فارغ کیا گیا تھا۔ ادھر ملازمت نے مجھے چھوڑا تو ادھر راحیلہ نے یہ شہر

ہی چھوڑ دیا۔ ایک روز مجھے میرے دوست خورشید نے بتایا کہ تمہاری راحیلہ محبوب گل کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ وہی محبوب گل جس کے سر پر ایک بال بھی نہیں اور جس کا پیٹ کا وزن ہر ماہ ایک پونڈ بڑھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے محبوب گل سے شادی کر لی ہے...... مجھے یقین نہ آیا مگر خورشید نے مجھے یقین دلا کر ہی چھوڑا۔

محبوب گل ایک نہایت امیر باپ کا بیٹا تھا۔ اس کے پاس کوٹھی تھی۔ کار تھی، اس کے پاس دولت بہت تھی۔ مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ بدصورت تھا۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر بارش کی طرح وہ اپنے جسم پر یوڈی کلون چھڑکتا، مگر کبھی کبھار اس کے جسم سے ایک عجیب سی بدبو آ ہی جاتی۔ معلوم نہیں راحیلہ کے ساتھ اس کی کب ملاقات ہوئی اور کس طرح ان میں چاہت بڑھی مگر یہ صورت حال حقیقت بن کر سامنے تھی۔

میرے تن بدن میں ایک آگ سی لگ گئی تھی، مجھے تو وہ کہتی تھی کہ وہ والدین کی مرضی کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ اور یہاں والدین کی مرضی تو کجا اس نے اپنا مذہب بھی تبدیل کر ڈالا۔ اس سارے معاملے میں مجھے ایک ہی بات سمجھ آئی کہ وہ محبوب گل کی دولت پر مرمٹی تھی۔ ورنہ اتنی خوبصورت لڑکی محبوب گل جیسے بدصورت آدمی پر کبھی مر نہیں سکتی تھی۔ محبوب گل کی یہ دولت مندی راحیلہ کی صورت میرا سارا سکون چھین کر لے گئی۔ مجھ سے اس روز کوئی کام نہ ہو سکا۔ میں نے دفتر سے چھٹی لی اور راجہ بازار آ گیا۔ اِس سرے والے روز سینما سے لے کر، اُس سرے والے ہوٹل پیراڈائز تک میں نے اس بازار کے کئی چکر لگائے۔ اپنے آپ کو شوکیسوں میں سجی ہوئی اشیاء، گھومتے پھرتے چہروں، پراسرار کھڑکیوں، ان دیکھی منزلوں اور چھابڑی والوں کی ہاؤ ہو میں گم کرنے کی کوشش کی مگر جب بے چینی کم نہ ہوئی تو بوبی پان والے کے کھوکھے سے میں نے دس پیکٹ سگریٹوں کے خریدے اور گھر آ کر چارپائی پر پناہ گزین ہوا۔ چین نہ آیا تو وہاں سے نکل کھڑا ہوا اور پھر سے بازار کے چکر لگانے شروع کر دیے۔

☆......☆

رحیم خان صاحب سے میری پہلی ملاقات ملازمت کے دوران دفتر میں ہی ہوئی تھی۔ وہ لٹی پٹی حالت میں لدھیانہ سے یہاں آئے تھے۔ ان کا شمار لدھیانہ کے روٗسا میں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ شاندار حویلیوں میں گزارا تھا۔ ان کا سارا خاندان ناز و نعم میں پلا ہوا تھا۔ ہجرت نے انہیں تنگدستی کی حالت میں مساوات کی اسی لائن میں لا کھڑا کیا تھا جس سے وہ عمر بھر نفرت کرتے رہے تھے۔ وہ ان دنوں ایک مکان کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں میرے دفتر کے چکر لگایا کرتے تھے۔ ابتدا میں جب وہ اس دفتر میں آئے تو ان کو توقع تھی کہ ان سے خاطر خواہ برتاؤ کیا جائے گا مگر تلخ حقیقت جلد ہی سامنے آ گئی۔ کبھی کسی نے ان کے ساتھ بولنا تک گوارا نہ کیا، کبھی وہ خود لڑ کر وہاں سے اٹھ آئے، بہت مدت کے بعد انہوں نے جانا کہ اس سارے کاروبار کے پس منظر میں ایک اور تلخ حقیقت ہے اور وہ ہے پیسا!

اسی افراتفری کے عالم میں ان کا ایک بار رحیم یار خان میرے پاس بھی آنا ہوا۔ انہوں نے اپنی درخواست کے بارے میں مجھ سے پوچھا تھا۔ میں اس وقت کچھ اور لوگوں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا لہٰذا میں نے ان کو ایک طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر مجھے نہ جانے کیوں ان کے حالات سن کر ان سے ہمدردی ہو گئی۔ میں نے اسی روز ان کی مکان کی مشکل حل کر دی، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ

مجھے شاعری سے لگاؤ تو تھا ہی، وہ بھی شاعری کے دلدادہ نکلے، مختلف شعراء کی شاعری کے بارے میں بات کرنے میں ہم اتنے غرق ہوئے کہ وقت کے ختم ہونے کا احساس ہی نہ رہا، اس کے بعد وہ جب بھی دفتر آتے تو گفتگو کا آغاز شاعری ہی سے کرتے۔

میری کوششوں سے رحیم خان صاحب کو راجہ بازار کی مشرقی سمت میں ایک درمیانے درجے کا مکان الاٹ ہوگیا۔ اگرچہ وہ مکان ان کی حیثیت کے مطابق نہ تھا مگر وہ پھر بھی مطمئن تھے کہ انہیں سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی۔ ان دنوں میں راجا بازار میں اتنا نہیں گھوما کرتا تھا۔ دفتر سے نکل کر راحیلہ کے بالا خانے کی طرف نگاہ اٹھاتا ہوا بھی نامراد ہو کر رحیم خان صاحب کے پاس جا پہنچتا۔ میری اکثر شامیں اب ان کے ساتھ گزرنے لگیں چونکہ میں بھی اکیلا تھا لہذا کبھی ان کے اصرار پر میں ان کے پاس ہی سو جایا کرتا تھا۔ اور پھر ایک روز میں نے انہیں راحیلہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تو وہ مجھے سمجھانے والے انداز میں بولے تھے۔

''تم ایک آوارہ لڑکی سے محبت کرتے ہو وہ کوئی خاندانی تو نہیں ہے۔ محبت فطرت کا ایک بہت بڑا مذاق ہے۔ آدمی جب شباب میں قدم رکھتا ہے تو ایک مرغی بھی اسے ایک ہنس نظر آتی ہے اور ایک عام سی لڑکی شہزادی اور جب شباب کا نشہ اترتا ہے اور آدمی بڑھاپے کی سرحدوں میں قدم رکھتا ہے تو اسے یہ سارا کھیل چند اندھی خواہشات کا محدود سلسلہ محسوس ہوتا ہے۔''

''رحیم صاحب! اگر یہ فطرت کا مذاق اور چند عارضی خواہشات کا مجموعہ ہے تو آپ ایڈورڈ ہشتم اور تاج محل کو کیا کہیں گے؟'' میں نے جواب کی صورت سوال کیا تھا جس کا جواب بس ایک مسکراہٹ کی صورت ملا تھا۔

رحیم صاحب میری ایسی باتوں پر اکثر مسکرا دیا کرتے تھے۔ میں ان کی عزت بھی بہت کرتا تھا اور وہ سب اس لیے تھی کہ ان کی ذات میں مجھے ایک نوحہ گر مل گیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ ایک خاص ہمدردی کے ساتھ میری داستان سنی تھی۔ میں تقریباً ہر شام ان کے پاس جاتا۔ چائے کے گرم پیالوں کے گھونٹوں اور سگریٹ کے دھوئیں کے درمیان میں ہر روز اپنی داستان اس انداز سے سناتا، جیسے میں پہلی دفعہ ذکر کر رہا ہوں۔ اور وہ اسی انہماک سے سنتے جیسے پہلی دفعہ سن رہے ہیں، وہ بڑے ہی وضعدار آدمی تھے، ہم ولی دکنی سے لے کر ڈاکٹر اقبال تک اور رتن ناتھ سرشار سے لے کے ترقی پسند ادب تک نہ جانے کن کن شاعرانہ ادبی موضوعات پر بحث کرتے، لیکن میری طرف سے ہر تان راحیلہ کے ذکر پر ٹوٹتی۔ میں کوشش تو کرتا تھا کہ راحیلہ کا اتنا ذکر نہ کروں لیکن اس سلسلے میں میرا شعور میرا ساتھ نہ دے سکا۔ رحیم صاحب کو یہ یقین دلاتے ہوئے کہ اب میں راحیلہ کا ذکر نہ کروں گا، میں گھنٹوں اس کے بارے میں بول جاتا۔ رحیم صاحب کا خیال تھا کہ میں ایک نفسیاتی مریض بن چکا ہوں، میرا ہر منفی اور مثبت انداز گفتگو راحیلہ کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک میرا واحد علاج میری شادی تھا۔

رحیم صاحب کی تین بیٹیاں تھیں۔ ان کا بیٹا کوئی نہ تھا۔ وہ کافی عرصہ بیکار رہے اور بیگم کے زیورات فروخت کر کے گزارہ کرتے رہے۔ پھر انہوں نے ایک مقامی فیکٹری میں ملازمت کر لی تنخواہ معقول تھی، اس لیے وہ ذرا ڈھنگ سے زندگی بسر کرنے لگے۔ اب وہ مجھے خود بلاتے۔ کھانا کھلاتے۔ اب ہم رازداں اور تنہائی کے ساتھی بھی بن گئے تھے۔ ایک دن ان ہی تنہا ملاقاتوں کے دوران انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کی بیٹی

حسنہ سے شادی کرلوں مگر میں نے ان کی اس بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔

☆......☆

وہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ ایک شام جب افطار کرنے کا وقت ہوا تو میں رحیم صاحب کی بیٹھک میں اکیلا بیٹھا تھا۔ رحیم صاحب ابھی فیکٹری سے واپس نہیں آئے تھے۔ گھر میں بھی کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں بیٹھک میں ہوں۔ چونکہ روزہ بروقت افطار کرنا ضروری تھا اور اس وقت میرے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا چنانچہ میں نے بیٹھک سے گھر کے اندر کھلنے والا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز آئی۔ ''کون؟''

میں نے جواب دیا ''میں صابر ہوں۔''

''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' آواز نے پوچھا۔

''روزہ افطار کرنا ہے۔ کوئی کھانے کی چیز اندر بھیج دیں!'' میں نے جواب دیا

دو منٹ بعد ہی پردے کے پیچھے آہٹ ہوئی۔ پھر نیلے رنگ کے بوسیدہ پردے سے باہر کی طرف پلیٹ اٹھائے ایک نہایت خوبصورت ہاتھ بڑھا۔ اس ہاتھ کو دیکھنے میں، میں اتنا محو ہوا کہ مجھے پلیٹ لینا یاد نہ رہا، اور پھر مجھ پر ایسا وجد طاری ہوا کہ میں نے بیٹھک کے دروازے کا پردہ کھینچ کر پرے ہٹا دیا...... ایک پیکر مرمریں میرے سامنے موجود تھا۔ اس کا معصوم چہرہ، کسی جھیل کی طرح گہری آنکھیں، پیاری تراش خراش کے یاقوتی ہونٹ، اکہرا بدن ......وہ ہر لحاظ سے حسین تھی۔ پوجے جانے کے قابل ......میں گویا پتھر بن گیا تھا کہ اچانک ہی مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ دوسری طرف موجود اس کی ماں نے میری یہ حرکت دیکھ لی تھی۔ مجھے یکدم ہی رحیم صاحب کا خیال آ گیا تھا' میں بہت ہی شرمندہ، سب کچھ بھول کر وہاں سے سرپٹ بھاگا اور راجہ بازار میں آ کر دم لیا۔ شرمندگی سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنی بے وقوفی پر غصہ آ رہا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ رحیم صاحب کی بیگم ان کو سارا حال بتا دیں گی، وہ سنیں گے تو مجھے بہت برا بھلا کہیں گے، اس شرمندگی کے باعث میں نے ان کے ہاں جانا چھوڑ دیا، بلکہ بھول کر بھی اس گلی کا رخ نہ کیا۔ اب میں ہر شام راجہ بازار میں آوارہ گھوم کر گزار دیتا۔

ایک شام جبکہ میں گھر میں ہی تھا تو دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ میں نے اندر سے پوچھا تھا ''کون؟''

''میں ہوں رحیم خان!'' باہر سے جواب آیا تھا۔

میرا تو خون خشک ہو گیا تھا۔ سب پرانے تعلقات' رحیم صاحب کی شرافت اور خلوص میری نظروں کے سامنے پھر گئے تھے' میں نے جی کڑا کے دروازہ کھول دیا تھا۔ مجھ میں یہ ہمت نہ تھی کہ ان کے سامنے نظریں اٹھاؤں۔

انہوں نے بے ساختہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ ''صابر مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی۔ تم واقعی کم درجہ آدمی ہو۔ یہ حرکت کرنے سے قبل تمہیں ہمارے یہاں پردے کی سختی کا خیال کر لینا چاہیے تھا۔ تمہیں میری بیٹیوں کی معصومیت کا خیال تک نہ رہا، تمہیں چاہیے تھا کہ حسنہ کے لیے کسی کے ذریعے مجھے پیغام بھجوا دیتے، میں اب اس وقت اسی لیے آیا ہوں کہ تم حسنہ سے شادی کر لو!''

میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے رحیم صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور گڑگڑا کر معافی مانگی۔ ان کی شخصیت، اپنی کم ظرفی، اور واقعہ کی نوعیت کا احساس کر کے مجھے رونا آ گیا اور میں روتا چلا گیا۔ جب میرا رونا ختم ہوا تو میں نے انہیں ساری بات سچ

بتادی۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ یہ ایک سوچی سمجھی حرکت نہ تھی تو انہوں نے مجھے معاف کردیا اور ہمارے تعلقات پھر سے بحال ہوگئے۔

رحیم صاحب کی پیش کش بڑی معقول تھی۔ اس نے میری تنہا شاموں میں ایک شدید کشمکش کا اضافہ کردیا، گھر میں تنہا بستر پر لیٹے لیٹے میں ازل سے ابد تک کی باتیں سوچ ڈالتا۔ مگر ان ساری سوچوں کا مرکز دولڑکیاں ہوتیں۔ راحیلہ اور حسنہ ایک نغمہ زیرلب، دوسری فضا کی وسعتوں کو چیرتی ہوئی ایک دلکش تان۔ ایک خاموش گھریلو لڑکی دوسری اپنے حسن کے حربوں کی طاقت سے مکمل آشنا ......میں پہروں سوچتا رہتا، سگریٹ پیتا رہتا۔ اٹھتا ،بیٹھتا، چلتا رکتا، پھرلیٹ جاتا' مگر حسنہ کے حق میں کئی فیصلہ نہ کرپاتا۔ وہ میرے دل کے چوکھٹے میں فٹ ہی نہ آتی تھی۔ وہ سیدھی سادی اورشریف لڑکی صرف بیوی نظر آتی تھی۔ اس میں اورایسی کوئی بات نہ تھی جو میری شاعرانہ جبلتوں کوتسکین دے سکے، حسنہ کا معاملہ صرف میرے اوراس کے باپ کے مابین تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیسے میرے ایک دوست خورشید کوسن گن ہوگئی۔ وہ ایک منظم زندگی بسر کررہا تھااور بال بچے والا آدمی تھا۔ اس نے یہ سنا تو بہت خوش ہوا۔ ایک شام وہ دوڑادوڑا میرے پاس آیااور مجھ سے پوچھا۔

''تم نے رحیم صاحب کو ہاں کی ہے یا نہیں؟''

''ابھی تک نہیں کی!'' میں نے جواب دیا'' شاید وہ میرے دل کونہیں بھائی۔''

میرا یہ جواب سن کرخورشید بھڑک اٹھا۔ وہ میرے سب رازوں سے واقف تھا۔ وہ جوش میں آکر بولا

''تم نرے الو ہو۔ ہمیشہ دل کے راستے محبت کرتے ہو' تمہاری بساط کیا ہے۔ تم ایک کلرک ہو۔ بڑی مشکل سے تم نے بی اے کیا ہے۔ تمہارا کوئی سرپرست نہیں۔ تم رحیم صاحب کے پس منظر کونہیں جانتے۔ اس قدر شریف آدمی تم پر مہربان ہے۔ اس کے گھرانے کی شرافت مسلم ہے۔ ایسی بیوی تمہیں کبھی نہ مل سکے گی۔''

میرے لیے خورشید کی باتیں بالکل بے وزن تھیں۔ میں پیسےاور نام ونمود کا بھوکا نہ تھا۔ مجھے ایسی زندگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی جس میں ایک بیوی ہو ۔ایک خاوند ہو۔ بیوی بچے جنے جائے۔ خاوند کما کما کرگھسیارا بن جائے۔ شرافت ایک اچھی بات ہے، مگر جذباتی پن میں، میں اسے اہمیت دینے کوتیار نہیں تھا۔ میں نے خورشید کوانکار کردیا۔ وہ ناراض سا ہوگیا تھا، اور جب بہت دنوں بعدوہ آیا تو راحیلہ کی بے وفائی کی خبر سنائی تھی۔

☆......☆

میں ایک مکمل گھسیارا بن چکا تھا۔ اب میں راجہ بازار میں گھومنے کے لیے آزاد تھا۔ میں بازار کے چکر لگاتا رہتا۔ کبھی چائے کے ہوٹل پر۔ کبھی پان سگریٹ والے کے پاس۔ کبھی سینماہاؤس کے سامنے کبھی ،فوٹوگرافر کی دکان کے اندر، راجہ بازار میری روح کا مسکن بن گیا تھا۔ اس کا پرانا حصہ میری زندگی کا پرتو تھا۔ اکھڑا ہوا فرش۔ ہر قدم پرٹھوکر کھانے کا اندیشہ، تنگ وتاریک دکانیں۔ تندور گرم کرنے والے، کباڑیے، چھریاں تیز کرنے والے، گلی سڑی سبزی سستے نرخ، راشن ڈپوؤں پر لمبی لمبی قطاریں، شلواریں، تہمد، پتلونیں مختلف رنگ، مختلف روپ، بولنے کے مختلف انداز، رکشے، بیل گاڑیاں و مٹھائیوں پرمکھیوں کی بھرمار، مریل اور خارش زدہ کتے، نالیوں سے صفائی کر کے نکالا ہوا جابجا گندگی کا ملغوبہ تنگ تنگ آسمان، بھکاری ہے تو ہر حال میں

ایک روپیہ، خربوزہ کیسے دیتے ہو؟ ایک آنے فی خربوزہ۔ جی یہ تو چار دن کا باسی ہے۔ اسی لیے ایک آنے فی خربوزہ لگایا ہے۔ فالودہ چار آنے پیالہ۔ شربت چار آنے گلاس۔ ہر رنگ کا شربت، رنگ کرنے والے، دودھ دہی کی گندی دکانیں، میلی لانڈریاں، غلیظ ہوٹل، سامنے نلکے پر لڑکا پانی بھر رہا ہے، ساتھ ہی کتا پانی پی رہا ہے۔ ہوٹل کے اندر حقہ بھی ہے اردگرد چھ سات گھسے پٹے انسان۔ ابے حقہ کا دم لو۔ مجھے آٹھ آنے کا گڑ دے دو۔ گھر میں مہمان آئے ہیں چائے بنانی ہے۔ سستی اور نامردی کا علاج۔ چوبیس گھنٹوں میں سرائے چارپائی بستر دو روپے میں، سائیں جی ڈاکٹر غلط کہتا ہے کہ میری بیٹی کو ٹی بی ہے میں ادویات کہاں سے خریدوں، دراصل میری بیٹی پر جنات کا سایہ ہے۔ تعویذ دیجیے۔ دیکھ مائی دو کالے مرغے لا دو۔ رات کو قبرستان میں جا کر غیبی موکلوں کو کھلاؤں گا پھر ان کی مدد سے تعویذ لکھا جائے گا۔ سیکنڈ ہینڈ فراکوں اور کوٹوں کی دکانیں۔ ہیر رانجھا اور لیلی مجنوں کے قصے اور شاہ بہرام کے کارنامے خریدیے۔ فلم 'دل لگی' کے گانوں کی کاپی چار آنے میں۔ طوطا قسمت کا حال بتاتا ہے۔ سلاجیت فروخت کرنے والے کا مجمع۔ حجام کی دکان۔ دیواروں پر ہر رنگ کی تصویریں اور ہر رنگ کا کاغذ۔ قائداعظم کی تصویر کے اوپر گریٹا گاربو کی ننگی ٹانگوں والی تصویر۔ فلم 'حسن کا ڈاکو' کا پوسٹر، بزازوں اور زرگروں کے پاس چہروں پر نقاب اٹھاتی عورتیں، پان کی پیک، سگریٹ کے ٹکڑے، تھوک پٹاخے، مکانوں کی منڈیروں پر لٹکے چیتھڑے ،گرم حمام، اندر فالتو بال، باہر میلے کچیلے تولیے، پانی کے لیے مٹی کے مٹکے۔ شاید جنھیں موسم شروع ہوتے ہی بھرا گیا تھا۔ آج نقد کل ادھار، ادھار محبت کی قینچی ہے، عقب میں چائے میں ماش کی دال کے چھلکے ملائے جا رہے ہیں، پرلی طرف مرچوں میں اینٹیں پیس کر ملائی جا رہی ہیں، ساتھ ہی کرائے پر قتل کرنے والے رہتے ہیں۔ بھٹی گلی میں جنت کا ڈیرہ جہاں سے رات دس بجے کے بعد ہر قسم کی چھوکری ملتی ہے۔ اس بالا خانے پر کبوتر باز رہتا ہے۔ اس کھولی میں سانپوں والا رہتا ہے۔ نیچے جوا ہوتا ہے۔ پرلے مکان میں ٹھرا بکتا ہے۔ ٹھیکہ، بھنگ، افیون، چوری چوری چرس اور شراب، سانڈے کا تیل، جیب تراش، ایوب کی دکان کی پرلی طرف راجہ بازار کا جدید ترین حصہ شروع ہو جاتا ہے۔ آدھی انگریزی، آدھی اردو، پنجابی کی ملاوٹ کے ساتھ۔ جمی آچو کو کیا پتہ، اس سوٹ کا کپڑا لندن سے اسمگل ہو کر آیا ہے۔ میں نے یہ کیمرہ ہانگ کانگ سے منگوایا تھا۔ گوگو۔ آچو کی پتلون کی موری کتنی ہے۔ ٹاٹا، پھیکے چہرے، مدقوق جسم، بڑے بڑے میک اپ، مصنوعی مسکراہٹیں، جاپان کی مصنوعات، فرانس کا سامان آرائش، امریکہ کی گندم، جرمنی کی سنہری لمبی لمبی کاریں، بڑی بڑی دکانیں، نیون سائن، کھڑے کھڑے پیشاب کرنے والے، انگلینڈ کے اخبار، بی بی سی کا تبصرہ، بلیو پرنٹ، ہوٹلوں کے کمروں میں آباد بستر، ساڑھیاں، غرارے، میکسیاں، پاجامے، کھلے بال، گھونسلوں کی طرح گندھے ہوئے بال، وگ، مصنوعی چوٹیاں، پیڈ، تاتاری کٹ مونچھیں، گھسے پٹے فقرے، سطحی بحثیں، ریستوراں، آج رات ہمارے ہوٹل میں مس ٹونکل کا ہوشربا رقص، کوکاکولا، ڈیفنس بانڈ، فلم محبت کے طریقے' بوائے فرینڈ، ہائے اللہ تم کتنی اجڈ ہو کہ میچ کرتے کپڑے پہننا بھی نہیں آتے۔ سینڈوچ ڈبل روٹی، کون آئسکریم، بڑی بڑی شاپنگ، بڑے بڑے لوگ، مطلب پرست لوگ، آخری سرے پر ہوٹل لالہ زار!

میرا اس بازار میں سفر پرانے بازار سے روز سینما کے قریب سے شروع ہوتا اور ہوٹل پیراڈائز پر جا کر ختم ہو جاتا۔ سینما اور ہوٹل پیراڈائز کے مابین میری مکمل روح۔ میری ساری ثقافت اور میری ساری تاریخ پھیلی ہوئی تھی، میں جب تھک جاتا تو پیراڈائز کے سامنے والے لان میں ایک گھنٹہ بیٹھتا، ہوٹل کی بلند و بالا بلڈنگ، کھڑکیوں کے پردے کے پیچھے والی پراسرار روشنی، خوبصورت لباس میں ملبوس عورتیں اور مردوں کو اندر باہر آتے جاتے دیکھتا اور واپس آ جاتا۔

ایک شام خورشید کی زبانی معلوم ہوا کہ رحیم صاحب کا حرکت قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ دل یہ سن کر بہت اداس ہوا۔ میں ان کے جنازے میں شریک ہوا۔ گھر جا کر بیوہ اور رحیم صاحب کے بھائی کو تسلی دی اور واپس آ گیا بعد ازاں وہاں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اسی واقعہ کے پیش نظر میں بار بار وہاں جانے سے ڈرتا تھا، مجھے اندیشہ تھا کہ اس طرح وہ مجھ پر حسنہ کے بارے میں شک کریں گے۔ اس کے علاوہ میں مفلس اور کنگال تھا۔ میں ان لوگوں کی کیا مدد کر سکتا تھا۔ رحیم صاحب کے مرنے کے بعد ان کے دوسرے دوستوں کا بھی وہاں آنا جانا تقریباً ختم ہو گیا، راحیلہ کی بے وفائی، رحیم صاحب کی وفات اور میری ملازمت سے برطرفی۔ ایسے واقعات تھے جنہوں نے مجھ میں زندگی کی ہر امید ختم کر دی تھی۔ میری صحت گر گئی۔ میں دنیا و مافیہا سے بتدریج کٹتا گیا، پھر مجھے چرس پینے کی عادت پڑ گئی تھی، اگرچہ اس دوران میں ایک ٹھیکیدار نے مجھے منشی رکھ لیا تھا، مگر یہ میرے لیے جینے کا کوئی باعزت ذریعہ تو نہ تھا۔

☆......☆

ایک شام میں چرس کی ترنگ میں ہوٹل پیراڈائز میں جا گھسا، ریاض خیر آبادی نے میکدے سے باہر آنے پر دنیا کو بدلا ہوا پایا تھا مگر مجھ کو اس کے برعکس نظر آیا۔ ہوٹل کے اندر جا کر مجھے محسوس ہوا جیسے الف لیلیٰ والے بغداد کے کسی محل میں ہوں۔ قالین، فانوس، مدھم مدھم روشنیاں، رنگین دیواریں، نیم عریاں نسوانی اجسام کی پینٹنگز، خوبصورت ملبوسات میں ادھر اُدھر گھومتی عورتیں، جسم کا ایک ایک حصہ نمایاں، جی چاہتا تھا انہیں چھو کر دیکھوں اور یقین کر لوں کہ واقعی میں حقیقی دنیا میں ہوں۔ میں اس مقصد سے آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ ایک بیرے نے مجھے بھکاری سمجھ کر ہوٹل سے باہر نکال دیا تھا۔

ہوٹل سے باہر نکل کر میں لان میں کافی دیر تک مبہوت بیٹھا رہا۔ یہ اندر کی دنیا کیسی تھی۔ کیا یہ غموں سے فرار کی صورت ہے یا خوشیوں اور مسرتوں کی تلاش! اگر غموں سے فرار کی صورت ہے تو میرے غم سب سے زیادہ ہیں، سب سے زیادہ میں مجروح ہوں، مجھے اوّل مقام ملنا چاہیے، ناچنے والے ہال میں سب سے پہلی کرسی میری ہو، آخر میں بھی تو انسانوں کے قبیلے کا فرد ہوں، مگر نہیں، یہ غموں سے فرار کی صورت نہیں، یہ تو حصول لذت کے لیے ایک دیوانہ پن ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ ایک ایک لمحہ سے خوشی کا ہر قطرہ نچوڑ لے۔ وہ اپنی خوشیوں کی خاطر باقی ہر ذی روح کو مٹا دیتا ہے، لیکن افسوس کہ تسکین کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ انسان اس سراب کے پیچھے بھاگتا ہے۔ حتیٰ کہ دل و جگر کا پیمانہ ان خوشیوں اور لذتوں کا زلزلہ انگیز تاثر پیدا کر کے ایک دن ٹوٹ جاتا ہے۔ میں ان ہی خیالوں میں محو تھا کہ دینو مالشیے کی آواز نے مجھے چونکا دیا تھا۔

”پسلیوں کا درد دور کر دوں، کندھے کس دوں، کمر سہلا دوں اور ٹانگیں نئی بنا دوں مالش، مال اِش!!“

میں نے دینو کو بلالیا اور اسے ایک روپیہ دے کر کہا "باقی سب اعضا تو درست ہیں، بس یہی سر قبضے سے باہر ہوا جاتا ہے۔ کبھی یہ الف لیلیٰ کی بابت سوچتا ہے اور کبھی کارل مارکس کے متعلق، اور پھر اس کی تان چرس پر آ کر ٹوٹتی ہے۔ اسے تھوڑا سا رگڑ دو!" چنانچہ اس نے رگڑنا شروع کر دیا۔ مالش کرانے کے بعد میں کھڑا ہو گیا۔ ایک انگڑائی لی۔ مجھے کارل مارکس کا فلسفہ یاد آ گیا۔ جی میں آیا کہ ارد گرد کے سب مالشیوں، بھکاریوں، لوفروں اور ٹیکسی والوں کو اکٹھا کر کے وہ فلسفہ بیان کروں، مگر جیل جانے کے تصور سے باز رہا تھا۔

عذرا کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی ہے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ کس ملک میں گئی ہے۔ میں اسے اور چچا، چچی تینوں کو بھلا چکا تھا کہ اچانک معلوم ہوا کہ چچا اور چچی ایک بس کے حادثے میں فوت ہو گئے ہیں، ان کی وصیت کے مطابق مجھے پانچ ہزار روپے ملے تھے، یہ رقم میں نے کراچی جا کر وصول کی تھی۔ کراچی میں ہی میں نے ایک خوبصورت سوٹ سلوایا تھا۔ چند اور چیزیں خریدی تھیں اور واپس لوٹ آیا۔ کچھ پیسے خرچ کر کے میں نے اپنے گھر کا رنگ و روغن درست کروایا۔ ادھار ادا کیا اور کچھ رقم بینک میں جمع کرا دی۔ میری مالی پریشانی ختم ہو گئی تھی۔ اور میں زندگی سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔

☆......☆

وہ دسمبر کی آخری شام تھی ...... میں نے وہی کراچی والا خوبصورت سوٹ زیب تن کیا۔ اس روز چرس کے بجائے شراب پی اور دو سو روپے اپنی جیب میں ڈال کر راجہ بازار آ گیا۔ روز سینما کے پہلو سے نکل کر میں ہوٹل پیراڈائز کی طرف چل پڑا۔ کتنی مختلف تھی وہ شام! میں اور میرا سوٹ، راہ چلتے لوگوں نے مجھے مڑ مڑ کر دیکھا، کیونکہ میرے چلنے کا انداز ہی ایسا تھا۔ عزیز دودھ والے نے مجھے دیکھتے ہی آنکھ ماری، بوبی پان والے نے زور سے سیٹی بجائی، ایوب بک اسٹال والا میرا انداز دیکھ کر مسکرایا کہ اچانک ایک سائیکل والا مجھ سے ٹکرا گیا، میری پتلون خراب ہو گئی۔ خادم لانڈری والے کی دکان میں جا کر میں نے اسے صاف کیا۔ کتوں، گدھوں اور بیل گاڑیوں سے بچتا بچاتا۔ ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ لیے میں چلتا چلا گیا، فلموں کے بڑے بڑے پوسٹر، بلند و بالا مکانات، بڑی بڑی دکانیں سب مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ میں خراماں خراماں بڑھتا رہا۔ آج الف لیلیٰ کا شہریار بغداد کے اس محل میں جا رہا تھا۔ میں شام دھندلکوں میں سیدھا ہوٹل پیراڈائز پہنچا اور ایک شان سے بار روم میں جا بیٹھا، وہاں سے اٹھا تو ڈانس والے ہال میں آ گیا۔ وہاں بہت سے مرد اور عورتیں اکٹھے تھے۔ ختم ہونے والے سال کے غم میں آرکسٹرا ایک غمناک دھن بجا رہا تھا۔ مجھے اس خوبصورت سوٹ میں شراب کے نشے میں، سو روپے کے نوٹ کے ساتھ یہ غمناک دھن پسند نہ آئی۔ میں اسٹیج پر پہنچا اور جھوم کر کہا:

پھر ادھر آئے نہ آئے وہ شمیم جاں فزا
پھر میسر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا
چھیڑ اس انداز سے اے مطرب رنگیں نوا
ٹوٹ جائے آج اک اک تار ترے ساز کا

ہال میں خاموشی چھا گئی۔ سب میری طرف دیکھنے لگے۔ اتنے میں وہ بیرا جس سے قبل ازیں بھی میری مڈبھیڑ ہوئی تھی، مجھے پہچان کر میری طرف بڑھا، اس نے مجھے آستین سے پکڑا اور باہر گھسیٹ لایا۔ میں نے اس کی بہت منت سماجت کی مگر وہ نہ مانا۔ میں نے دس روپے کی صورت میں فوراً اس کی

قیمت اس کی طرف بڑھادی، وہ فوراً مہذب ہو گیا۔ میں نے دس روپے مزید اس کو دیئے اس نے مجھے سلام کیا اور بولا ''صاحب غلطی ہو گئی''

''آج شام ہم نے تمہیں معاف کیا ہے بلکہ اپنے ہر دشمن کو معاف کیا۔''

''صاحب آپ چاہیں تو آپ کو واپس ہال میں لے چلوں۔'' وہ بولا۔

''نہیں! آج میں کوئی غمگین دھن نہیں سننا چاہتا، مجھے بار روم لے چلو'' میں نے جواب دیا۔

وہ مجھے وہاں لے گیا۔ میں وہاں پیتا رہا۔ وہ بیرا وقتاً فوقتاً میرا حال پوچھتا رہا۔ رات کے درمیانی حصے میں وہ بیرا پھر میرے پاس آیا اور کہا

''صاحب! نیا سال شروع ہو چکا ہے، سب خوش ہیں، آپ بے حد پی چکے ہیں، اب فضا میں تبدیلی ضروری ہے ۔ کیا کوئی رات کا ساتھی چاہیے؟''

''ہاں آج ضرور چاہیے۔ آج کی رات ان محرومیوں کی تلافی ضروری ہے۔'' میں نے مسرت سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔

میری رضامندی دیکھ کر بیرا چلا گیا تو میں باہر برآمدے میں آ گیا' ڈانسنگ ہال سے عجیب عجیب آوازیں آ رہی تھیں، کچھ جوڑے نیم تاریک راہداریوں میں گھوم رہے تھے ۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ کوئی کسی کی طرف متوجہ نہ تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ بیرا واپس آیا اور بولا۔

'' صاحب آپ سے مزید پچاس روپے چارج کیے گئے ہیں ۔ آپ کمرہ نمبر 25 میں پہنچ جائیں آپ کا وقت دو گھنٹے ہے!!''

میری جیب میں صرف ساٹھ روپے تھے۔ وہ میں نے اس کی طرف بڑھا دیئے ۔ اور کمرہ نمبر 25 میں جا پہنچا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا۔ سامنے

اطلاع

لوگو......!!
یہ کائنات یتیم ہو گئی ہے
سارے ستارے مر گئے ہیں
چاند گہن زدہ ہو گیا ہے
اور سورج کو گرہن لگ گیا ہے
چلو! بند کرو اب کھیل تماشے
اسرافیل صور پھونکنے آنے والا ہے
ایسا کرو......
اگر چھپ سکتے ہو
تو چھپ جاؤ کہیں......!!
(روشانے سبعین مہاروی)

ایک لڑکی دروازے کی طرف پیٹھ کیے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ اس کا خوبصورت جسم دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا

ذکر جس کا زہرہ و پروین کے کاشانے میں ہے
وہ صنم بھی آج اپنے ہی صنم خانے میں ہے

لڑکی نے اچانک میری آواز سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا تھا، اور پھر اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ اور میں دھڑام سے پیچھے دروازے پر جا لگا تھا ...... ہاں ! یقیناً وہ حسنہ تھی۔ ایک نہایت شریف خاندانی اور روایت پسند باپ کی بیٹی!! میں وہاں سے سرپٹ بھاگا اور سیدھا راجہ بازار جا پہنچا ......اور پھر وہاں کے چکر لگانے شروع کر دیے! بے مقصد، بے ارادہ، میرا دل تھا کہ کسی صورت چین نہ پا رہا تھا!!

پھر میں نے وہ بازار ہی چھوڑ دیا تھا اور کچھ عرصے بعد شہر بھی، ساتھ ہی عشق کرنے سے بھی ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی تھی۔

☆☆☆

نقشِ قدم

ماہنامہ 'دوشیزہ' بہت جلد اپنے صفحات پر ایک نئے سلسلے 'نقشِ قدم' کا آغاز کررہا ہے۔ اس سلسلے میں اُن خواتین کے انٹرویوز شامل ہوں گے' جو زندگی کے مختلف شعبوں کے علاوہ سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں منتظم کے فرائض انجام دے رہی ہیں...... 'نقشِ قدم سلسلہ ہے اُن خواتین کی صلاحیتوں کے اعتراف اور تشہیر کا' جو مردوں کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے صرف معاشرے کی فلاح و بہبود میں ہی اپنا کردار بہت مثبت انداز میں ادا کررہی ہیں' ساتھ ہی زندگی اور بندگی کا حق بھی ادا کررہی ہیں۔

اس ماہ کی خصوصی کہانیاں

روپ بہروپ

نینا خان

موجودہ دور میں بگڑے معاشرے کی ایک چشم کشا تحریر



''بھئی آج کیا کچھ خاص بن رہا ہے کچن میں؟ بڑی اچھی خوشبو آرہی ہے۔'' انوار احمد نے کچن کے پاس آکر کہا تو میں کچن میں پکوڑے فرائی کرتے ہوئے بولی

''ابو جان السلام علیکم! آپ بیٹھیں۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں آپ کے لیے اور پکوڑے بھی۔ آج میں نے سینڈوچز اور پکوڑے بنائے ہیں۔''

''جیتی رہو، خوش رہو، وہ لوگ اب تک نہیں آئیں کیا؟''

''مشی اور نمو بس آنے ہی والی ہوں گی، ابو جان آپ بیٹھیں صحن میں، میں بس ابھی گرما گرم پکوڑے لائی۔''

''بھئی تمہاری امی جان کہیں نظر نہیں آرہیں؟ کہاں ہیں وہ؟''

''میں نماز پڑھ رہی تھی، کیسا گذرا آج کا دن آپ کا؟'' ابو امی دونوں صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔

''دن اچھا گذرا۔ بس بھائی جان تھوڑے ناراض ہیں۔ دو دن سے کام کی مصروفیت کے باعث ان کے یہاں جا نہیں سکا تھا، بھائی جان ابھی راستے میں ملے۔ وہ کافی ناراض تھے۔ سوچ رہا ہوں چائے پی کر ان کے گھر چلا جاؤں، سلمیٰ بیگم آپ بھی تیار ہو جائیں اور بھائی جان کے گھر چلیں میرے ساتھ۔'' ابو کی بات سن کر امی نے جانے کے لیے ہامی بھر لی۔ میں نے جلدی سے ان دونوں کو چائے اور پکوڑوں کے ساتھ سینڈوچز بھی دے دیئے اور خود کچن میں کھانا تیار کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ مشی اور نمو بھی آگئیں، امی ابو کو سلام کر کے جب وہ میرے پاس آئیں تو امی ابو نے جانے کا کہہ کر مجھے دروازہ بند کرنے کا کہا، میں نے ان کے جاتے ہی گیٹ بند کر کے چائے نکالی اور سینڈوچز اور پکوڑے لے کر ہم تینوں چھت پر آ کر کھانے لگے۔

''حد کرتی ہو، تم دونوں نے کتنی دیر لگا دی آنے میں، میں کب سے انتظار کر رہی تھی تم دونوں کا......!''

''میں تو مشی کے گھر کب سے پہنچ گئی تھی، میڈم کی تیاری مکمل نہیں ہو رہی تھی، بھئی بہت دیر کراتی ہے یہ، کل سے میں اسے لے کر نہیں آؤں گی خود ہی آ جایا کروں گی۔'' نمو نے منہ بناتے ہوئے کہا تو مشی کہاں چپ رہنے والی تھی۔

''اب بندہ تیار بھی نہ ہو، ایسے ہی اٹھ کر آ جاؤں، تم دونوں یہ بات اچھی طرح سے جانتی ہو کہ مشی کبھی بغیر میک کے گھر سے باہر نہیں نکلتی، یار محلے کے لڑکے کیا سوچیں گے کہ اتنی خوبصورت لڑکی وہ بھی بنا میک اپ کے، لڑکوں پر اچھا امپریشن پڑتا ہے میک اپ کا۔ اور پھر میک اپ تو بنا ہی لڑکیوں کے لیے ہے کہ لڑکیاں میک اپ کر کے لڑکوں کو اپنا دیوانہ بنا سکیں، ہاہاہا!''

''دنیا سدھر سکتی ہے مگر مشی کا سدھرنا ناممکن ہے، ہاہاہا۔'' میں نے ہر بار کی طرح یہ ہی جملہ دہرایا تو نمو اور مشی بھی ہنس پڑیں۔

''ویسے عرشو! اتنا مشکل کام سدھرنا، جب تو مشی کو بتائے گی تو وہ کیسے کرے گی۔'' نمو نے مشی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ مگر مشی تو ٹھہری ایک نمبر کی ڈھیٹ انسان اسے کب کچھ برا لگتا تھا۔ فوراً بولی

''ہاں مشکل کام کرنا مجھے پسند نہیں، اور سدھر جانا تو امپوسیبل ہے میرے لیے ہاہاہا! میں تو کہتی ہوں کہ تم دونوں بھی تھوڑی سی میری ہی طرح ہو جاؤ، پھر دیکھو لائف کتنی رنگین ہے۔ کتنی انجوائمنٹ ہے لائف میں بس مت پوچھو۔''

''اچھا مشی وہ بتا تیرے اس بوائے فرینڈ کا

کیا ہوا، جس سے تو ملنے گئی تھی؟'' نمو نے پھر مشی سے اسی طرح کی باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ میں بس سنتی رہتی تھی، ان دونوں کی باتیں اور ہنستی رہتی تھی۔ مجھے کبھی یہ سمجھ نہیں آیا کہ یہ دن بہ دن محبتیں بدلتی کیسے ہیں۔ نمو مشی کی جیسی نہیں تھی، مگر اسے مشی کی رنگین دنیا سے لگاؤ بہت تھا۔ میں اکثر اسے منع کرتی تو وہ مجھے یہ کہہ کر خاموش کرا دیتی تھی کہ ''اب باتیں سننے پر تو پابندی مت لگا عرشو!''

''یار بہت کیوٹ ہے وہ، اس نے مجھے یہ واچ گفٹ کی ہے، برانڈڈ ہے۔ یہ دیکھو تم دونوں۔'' مشی ہاتھ میں پہنی ہوئی گھڑی دکھا رہی تھی تو نمو نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''کاش مشی، میں بھی تیری طرح لائف انجوائے کر سکتی، تیری لائف بہت اچھی ہے یار! تو کتنا انجوائے کرتی ہے۔ کاش میں بھی...!''

''شٹ اپ نمو! اگر تایا ابو کو پتا چلا تو تیری خیر نہیں، سدھر جا، یہ سارے کام تو مشی کے لیے ہی چھوڑ دے۔''

میری بات سن کر فوراً مشی نے جواب دیا ''خود تو، تُو بڈھی روح ہے اور نمو کو بھی ایسا ہی کر دے، مجھے تو لگتا ہے تو کبھی شادی کے بعد بھی لائف انجوائے نہیں کرے گی عرشو۔''

''میں بہت انجوائے کروں گی، تیری سوچ سے بھی زیادہ مگر صرف اپنے عرش کے ساتھ، میں صرف ایک شخص سے محبت کرنے پر یقین رکھتی ہوں، مجھے تو آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ محبتیں اتنی جلدی کیسے بدلتی ہیں؟''

میری بات سن کر نمو جل کر کہنے لگی ''ہاں خود کی منگنی تو بچپن ہی میں طے ہوگئی نا' میرے عرش بھائی جان سے۔ وہ محلے کے سب سے خوبصورت اور ہینڈسم نوجوان ہیں۔ خود تو اتنی لکی ہے۔ روز ان سے رات میں باتیں بھی کرتی ہے۔ تم دونوں کو تو مل گیا ہے نا باتیں کرنے والا، میں بیچاری بھری جوانی میں بور ہوتی ہوں۔ کیسی دوستیں ہو تم دونوں یہ نہیں ہوتا کہ اپنی خوبصورت دوست کے لیے کوئی اچھا سا ہینڈسم سا نوجوان ڈھونڈ دو۔''

''میں نے تو کئی بار آفر کروائی ہے تو ہی اپنے ابا کے ڈر کے مارے منع کر دیتی ہے۔ بہت مزہ آتا ہے نمو کبھی کسی لڑکے سے افیئر چلا کر دیکھ۔''

مشی کی اس ترغیب پر میں نے جھٹ سے نمو کو پیار کر کے کہا ''مشی تو میری سیدھی سادی نمو کو بگاڑ مت، میں ڈھونڈوں گی اس کے لیے اچھا سا لڑکا اور پھر اس کی شادی بھی دھوم دھام سے کراؤں گی، آفٹر آل نمو میری دوست ہی نہیں میری نند بھی تو ہے، مغرب کی اذانیں ہوگئیں، ابو امی بھی آتے ہی ہوں گے۔ نیچے چلتے ہیں۔ کل جلدی آجانا پھر روز کی طرح ایک ساتھ چائے بنا کر پئیں گے اور ہاں کل چائے نمو کے ہاتھ کی بنی پئیں گے۔''

''ٹھیک ہے! چلو چلتے ہیں کل ملیں گے۔''

دونوں کو بائے کہہ کے میں نے گیٹ بند ہی کیا تھا کہ ابو امی آگئے۔ پھر ہم تینوں نے وضو کر کے نماز مغرب ادا کی۔ ابو نیوز چینل لگا کر خبریں سننے لگے۔ امی بھی ان کے ساتھ روز ہی خبریں سنتی تھیں، میں اپنے روم میں آگئی تو عرش کا فون آگیا اور میں عرش سے باتیں کرنے میں مصروف ہوگئی۔

عرش سے میرا رشتہ بچپن میں ہی طے کر دیا گیا تھا۔ عرش میرے تایا ابو اور تائی امی کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ عرش اور مجھے بچپن سے اپنے رشتے کا پتا تھا تو بچپن سے ہی ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ بڑے ہوتے ہوتے محبت بھی پروان چڑھتی گئی، ہم دونوں کبھی ایک دوسرے سے الگ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ عرش اپنی تعلیم مکمل

کر کے ایک کمپنی میں انجینئرنگ کی پوسٹ پر دوبئ چلے گئے تھے، کافی ہینڈسم سیلری تھی، ابوجان اور تایا ابو بس دو ہی بھائی اور دونوں بھائیوں میں بے پناہ محبت بھی تھی۔ اسی لیے تو میرے پیدا ہوتے ہی تایا ابو نے میرا نام عرشال رکھا اور عرش سے میرا رشتہ طے کر دیا۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی عمران خان تھا جو بچپن میں ہی ٹائیفائیڈ کے باعث انتقال کر گیا تھا اگر عمران بھائی حیات ہوتے تو یقیناً نمو کی شادی عمران بھائی سے ہوتی پر اللہ کو جو منظور۔

ابا نے کبھی اپنے بڑے بھائی سرور احمد کے خلاف کوئی بات نہ کہی تھی، ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اسی لیے امی اور تائی جان میں بھی کافی محبت تھی۔ دیورانی، جٹھانی ہونے کے باوجود دونوں سگی بہنوں کی طرح مل جل کر رہتی تھیں، جب سے میرا رشتہ طے ہو گیا تھا تو ابوجان نے اسی گلی میں الگ گھر لے لیا تھا۔ تایا ابو کی اجازت سے ایک ہی گلی میں رہنے کے باوجود دونوں بھائی ایک دوسرے کی اکثر اپنے اپنے گھروں میں دعوتیں کرتے رہتے تھے اور ملنے بلاتے رہتے تھے۔ عرش سے چھوٹی نرمین تھی، جو کہ میری عمر کی تھی۔ ہماری پیدائش میں ایک مہینے کا ہی فرق تھا۔ ہمارے پڑوس میں ہی سعید انکل اور ان کی بیگم طاہرہ آنٹی رہتے تھے، ان کو بھی خدا نے بس ایک ہی بیٹی سے نوازا تھا جو کہ مہوش تھی اور جسے ہم مشی کہتے تھے۔ سعید انکل ساری عمر باہر ملک میں رہے تو طاہرہ آنٹی نے خود کو کافی ماڈرن طریقے میں ڈھال لیا اور اسی انداز میں مشی کی تربیت بھی کی تھی جس کی وجہ سے مشی کافی آزاد خیال ہو گئی تھی۔ ہم تینوں کی عمر تقریباً یکساں ہی تھی، اور تینوں ایک ہی محلے میں پلے، بڑھے اور ایک ہی اسکول میں گئے۔ کافی اچھی دوستی تھی۔ ابوجان اور تایا ابو دونوں سرکاری ملازم تھے۔ دونوں ہی اچھی پوسٹ پر تھے، اچھی خاصی تنخواہ تھی۔ تایا ابو تو ریٹائر ہو چکے تھے۔ پھر عرش بھی تو دوبئ میں اتنا اچھا کما رہے تھے۔ اللہ کے کرم سے روپیہ پیسے کی ریل پیل تھی کسی بھی چیز کی کوئی کمی نہ تھی۔ سب ہی نماز کے پابند تھے، بس مشی کا لائف اسٹائل دیکھ کر نمو اکثر بھٹکنے لگتی تو میں اسے سنبھال لیا کرتی تھی۔ پھر بھی مجھے پتا نہیں کیوں نمو اور مشی کے لیے ایک انجان سا خطرہ رہتا تھا، نمو تو میری کزن، بہن اور سب سے اچھی دوست بھی تھی اور بچپن سے مشی ساتھ رہی ہے تو محبت اس سے بھی کم نہ تھی میں اکثر اس کی نیک ہدایت کے لیے اللہ سے دعا کرتی تھی مگر مشی نے کہاں سدھرنا تھا 'وہ تو خود ہی سدھرنا نہیں چاہتی تھی' ہر نئے لڑکے سے اس کی دوستی ہو جاتی تھی پھر محبت، اس کے بعد ملاقاتوں کے سلسلے' طاہرہ آنٹی مشی کی ہر عادت سے واقف تھیں مگر اسے کچھ نہ کہتی تھیں۔ جبکہ ہمارے گھروں میں تو ہر بات پر پابندی تھی جو نمو کو اکثر بہت بری لگتی تھی، مجھے ہمیشہ نمو کی فکر رہتی تھی کہ ایک تو ہماری عمر ہی کچھ ایسی تھی پھر اوپر سے مشی کی باتیں۔ شاید اگر میری لائف میں عرش نہ ہوتا یا میں نماز، روزے اور دین سے اتنا قریب نہ ہوتی تو میں بھی مشی کی باتوں سے بھٹک ہی جاتی۔ اس کی باتیں تھیں ہی اتنی دلفریب، قصور ہماری عمروں کا تھا مگر اللہ نے جو مجھے شعور کی تعلیم دی تھی اور کچھ گھر کی تربیت بھی ایسی تھی کہ میں کبھی کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتی تھی۔ نمو بھی نماز کی پابند تھی مگر پھر بھی تایا ابو اور تائی امی کی سختی کے بعد بھی مشی کی باتوں میں کھنچی چلی جاتی تھی، قصور عمر نادانی کا تھا اور بس گھر والوں کی عزت خاندان کا نام اور ابو امی کی سختی کی وجہ سے نمو خاموش رہتی تھی۔ پر مجھ سے تو کھل کر باتیں کر ہی لیا کرتی تھی۔

''نمو بیٹا ذرا چائے کا کپ تو دے دو۔ کب

سے کہا ہوا ہے چائے بنانے کا؟'' ٹی وی لاؤنج میں نیوز دیکھتے ہوئے سرور احمد نے نمو کو چائے بنانے کا کہا تو وہ فوراً ہی چائے کا کپ لے آئی۔ امی اور ابو دونوں کے لیے۔''

''جیتے رہو بیٹا! اللہ تعالیٰ نصیب اچھے فرمائے (آمین)''

''ابو جان دوپہر میں بھائی جان کی کال آئی تھی۔ آپ سو رہے تھے تو انہوں نے اٹھانے سے منع کر دیا تھا اور کہا تھا جب آپ اٹھ جائیں تو میں آپ سے بات کرا دوں۔ آپ کہیں تو کال ملا دوں؟'' نمو نے کال ملاتے ہوئے کہا' امی جان میں جا رہی ہوں، شام کی چائے پینے عرشو کے پاس، آپ دونوں باتیں کریں بھائی جان سے۔ اور انہیں یاد کرا دیجیے گا کہ میرا سامان یاد سے بھجوا دیں۔''

''ٹھیک ہے جاؤ اور ہاں تھوڑا سالن اپنی چچی کے لیے بھی لے جاؤ اور ہاں جلدی آ جانا روٹیاں ٹائم سے بنا لینا۔''

''ٹھیک ہے امی جان اب میں جاؤں۔ اللہ حافظ۔''

نمو کے جاتے ہی اسپیکر پر سرور احمد اور نجمہ بیگم عرش سے مخاطب ہوئے تھے۔

''جلدی آ جاؤ عرش بیٹا تاکہ ہم تمہارے سر پر سہرا دیکھ لیں۔''

''ابو جان بس چند مہینوں کی بات ہے۔ آ جاؤں گا پھر شادی کر لوں گا۔ آپ زمین کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ لیں تاکہ اس کی شادی بھی طے کر دیں پھر میں اپنی چھوٹی بہن کی شادی خوب دھوم دھام سے کروں۔ بہت ارمان ہیں میرے اپنی بہن کے لیے۔ ویسے وہ فرمائشی نمو ہے کہاں؟ ہر وقت فرمائش کرتی رہتی ہے اپنے لیے اور اپنی دوستوں کے لیے۔''

''چائے تو وہ روز عرشو کے ساتھ ہی پیتی ہے نا۔ چائے پینے کا ٹائم ہو گیا تھا۔ پھر کہاں اس نے رکنا تھا...... بس بھاگے بھاگے گئی اپنے چچا جان کے گھر!''

نجمہ بیگم کی بات سن کر عرش فوراً بولا ''بس امی جان اللہ تعالیٰ ان دونوں کی محبتیں ہمیشہ یونہی قائم رکھے۔''

''آمین! ہماری تربیت ہی ایسی ہے عرش بیٹا آج تک ہم بڑوں میں جتنی محبتیں قائم ہیں نا بچوں میں بھی اسی طرح قائم رکھی ہیں اللہ تعالیٰ نے۔ تم فکر نہ کرو آگے بھی سب اچھا ہی ہوگا۔ انشاءاللہ!''

☆☆☆

''گلی میں اتنی بڑی کار وہ بھی اتنی مہنگی، اتنی خوبصورت کار کس کی ہو سکتی ہے؟'' نمو ابھی گھر سے نکلتے ہی کار دیکھ کر یہ سوچ میں ہی تھی کہ کار اس کے پاس رکی اور کار کے اندر سے ایک لڑکا اترا، انتہائی ہینڈسم، خوبصورت بہت ہی پر کشش شخصیت کا مالک سن گلاسز اتار کر پوچھنے لگا

''ایکسیوز می مس! کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ سعید صاحب کا گھر کون سا ہے؟''

''جی وہ میں بھی وہیں جا رہی ہوں، چلیں میں آپ کو لے چلتی ہوں۔'' نمو کی بات سن کر کار میں بیٹھی ایک خاتون کار کا ونڈو گلاس نیچے کر کے بولیں۔

''بیٹا آ جاؤ کار میں بیٹھ جاؤ اور ہمیں سعید صاحب کے گھر لے چلو۔''

''آنٹی یہ رہا گھر سامنے والا ہی تو ہے کار میں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کار یہیں پارک کر دیں سائیڈ میں۔''

کار سے اتر کر خاتون نے لڑکے سے کہا'' حسان بیٹا تم سائیڈ میں کار پارک کر دو۔ میں بچی کے

ساتھ اندر جاتی ہوں تم بھی آ جانا۔"

"اوکے ماما!" حسان نام ہے اس کیوٹ لڑکے کا۔ اُف کتنا خوبصورت ہے۔ پورے محلے میں ایسا وجیہہ نوجوان کوئی اور نہیں ہے۔"

"کیا سوچ رہی ہو بیٹا؟" آنٹی نے نمو کو گہری سوچ میں ڈوبے دیکھ کر کہا۔ نمو نے مسکرا کر "کچھ نہیں" کا جواب دیا۔ خاتون نے مزید چلتے ہوئے نمو سے پوچھا "بیٹا کیا نام ہے تمہارا؟ اور تم یہیں رہتی ہو کیا؟"

"جی آنٹی یہی تو گھر ہے میرا، میں اسی گھر میں رہتی ہوں۔ بس میں مشی کے گھر جانے کے لیے ہی تو نکلی تھی، میرا نام نزمین ہے اور میں سعید انکل کی بیٹی مہوش کی دوست ہوں۔"

"نزمین نام تو بہت پیارا ہے، بالکل تم اپنے نام کی طرح ہی خوبصورت ہو، بہت پیاری بچی ہو تم۔ میرا نام رشیدہ ہے اور یہ میرا بیٹا ہے حسان۔"

"آنٹی گھر آ گیا۔ آ جائیں گیٹ اس ٹائم کھلا ہوتا ہے کیونکہ میں یہاں اس ٹائم روز آتی ہوں، مشی کو لے جانے، آ جائیں اندر میں طاہرہ آنٹی کو بتاتی ہوں۔"

"طاہرہ آنٹی آپ سے ملنے کوئی رشیدہ آنٹی آئی ہیں۔"

طاہرہ آنٹی بڑے تپاک سے رشیدہ آنٹی سے گلے ملی تھیں اور پھر انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئی تھیں۔ نمو حسان کو جاتا دیکھ کر گہری سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ مشی نے اسے زوردار تھپڑ مارتے ہوئے کہا تھا۔

"میں کب سے تجھے آواز دے رہی ہوں اور تو پتا نہیں کن خیالوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ چلنا نہیں ہے کیا؟"

"یار یہ ہینڈسم لڑکا کون ہے؟ کتنا پیارا ہے۔ میرا تو دل آ گیا اس پر پہلی نظر میں۔"

"یو مین تو سے۔ پہلی نظر میں پہلا پیار۔ ہاہاہا یہ حسان ہے۔ رشیدہ آنٹی کا بیٹا ہے، رشیدہ آنٹی ماما کی بیسٹ فرینڈ ہیں اور بزنس پارٹنر بھی۔ دونوں نے مل کر میرج بیورو کھولا ہے ڈیفنس میں، میں نے بتایا تھا کہ ماما اور ان کی فرینڈ نے میرج بیورو کھولا ہے۔"

"ہاں تو نے بتایا تھا، چل اب چلتے ہیں اور ویسے ہی چائے میں نے ہی بنانی ہے آج۔"

"دونوں کو ابو امی کو سلام کرتا دیکھ کر میں نے منہ بنا کر غصے میں کہا تھا "آج چائے بنانے کا کیا کہہ دیا کہ تو نے دیر ہی کر دی آنے میں، چائے میں تیار کر چکی ہوں۔ ابو امی کو دے چکی ہوں۔ تم دونوں اوپر جاؤ میں لاتی ہوں چائے۔ چھت پر خبر لوں گی تم دونوں کی۔"

"جب میں چھت پر چائے لے کر گئی تو مشی ہمیشہ کی طرح اپنے بوائے فرینڈز اور ملاقاتوں کی باتیں کرتی رہی اور نمو کافی چپ چپ تھی۔ وہ چپ چاپ ہی چائے پیتی رہی، اسے اس طرح دیکھ کر جب میں نے وجہ پوچھی تو نمو سے پہلے ہی مشی نے ہنس کر کہا۔

"پہلی نظر کا پہلا پیار۔ ہاہاہا، عشق کا روگ لگ گیا ہے ہماری نمو کو۔ پہلی نظر میں اپنا دل دے بیٹھی ہے یہ۔"

"شٹ اپ مشی! فضول باتیں مت کر! بس آج میرا موڈ نہیں ہے باتیں کرنے کا۔" نمو کی باتیں اور مشی کا کہا سن کر مجھے تھوڑا شک ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے تو میں نے پوچھا۔

"مشی تو ہی بتا دے کہ آخر بات کیا ہے؟ اتنی خاموشی کیوں ہے؟"

"کچھ نہیں یار عرشو، مشی کی تو عادت ہے بکواس کرنے کی، میں گھر جا رہی ہوں، مجھے ذرا کام

ہے۔"

نمو جاتے جاتے مشی کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اسی دن سے میں دیکھ رہی تھی کہ نمو اور مشی دونوں باتیں کرتے اور میرے آتے ہی خاموش ہو جاتے۔ کافی دن سے ان دونوں میں کچھ کھچڑی پک رہی تھی جو مجھ سے چھپائی جا رہی تھی۔ میں ان دونوں میں آئی ہوئی تبدیلی کو کافی محسوس کر رہی تھی۔

اسی طرح چند مہینے گذر گئے اور عرش آ گئے۔ عرش کے آتے ہی ابو امی نے تایا ابو کی فیملی کی دعوت کی انہیں گھر بلایا کہ شادی کے حوالے سے باتیں بھی کر لیں گے اور ڈنر بھی ساتھ کر لیں گے۔ میں نے صبح سے ہی سارے کام کرنا شروع کر دیے تھے، ساتھ ہی نمو اور مشی کو بھی اپنی ہیلپ کے لیے بلا لیا تھا۔ مشی تو خیر کیا کام کراتی ہمارے ساتھ مگر اس کی باتیں بنانا، ہنسنا ہنسانا ہی کافی تھا' کام کے دوران لطف اندوز ہونے کے لیے اچھا تھا۔ شام تک سب کام ریڈی ہو گیا۔ نمو جا کر اپنی فیملی کے ساتھ تیار ہو کر آ گئی تھی' مشی بھی خوب میک اپ کر کے آ گئی اور میں نے بھی ہلکا سا میک اپ کیا اور تیار ہو گئی۔ ان کے آتے ہی امی ابو نے عرش کی بلائیں لے کر عرش کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں تو بہت بے چین تھی کہ کسی طرح میں عرش کو دیکھوں مگر یہ بے چینی ایک طرفہ نہیں تھی، عرش بھی اتنے ہی بے چین تھے جتنا کہ میں، ابو، امی اور تایا ابو' تائی امی کے سامنے عرش سے ملنا ممکن نہیں تھا۔ جب میں کھانا لگانے نمو اور مشی کے ساتھ اندر کمرے میں آتی تو چپکے سے عرش پر ایک نظر ڈال لیتی۔ عرش بھی مجھے نظر بھر کر دیکھنا چاہتے تھے مگر بڑوں کے سامنے ہمت کون کرتا۔ بڑوں کی عزت جو اہم تھی اور پھر جب تائی امی نے مجھے آواز دی تو میں بہت حیران ہوئی تھی۔

"عرشال بیٹا! تم بھی آ جاؤ ہم سب کے ساتھ ہی کھانا کھاؤ۔ اندر آ جاؤ اور نمو مشی تم دونوں بھی آ جاؤ۔" میں نظریں جھکائے کھانا کھا رہی تھی۔ عرش چوری چھپے مجھے دیکھ رہے تھے اور میں بھی کہ ابو جان تایا جان سے بولے تھے۔

"بھائی جان! ہم دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ شادی جلد سے جلد کر دیتے ہیں، عرش دو مہینے کے لیے آیا ہے تو شادی بھی آرام سے ہو جائے گی اور دونوں بچے وقت بھی گذار لیں گے پھر تو عرش چلا جائے گا واپس دوبئی۔"

"ہاں انور ہم یہی بات کرنے آئے تھے۔ ویسے تو شادی کی تیاریاں مکمل ہی ہیں۔ بس تھوڑی بہت جو رہ گئی ہیں وہ بھی کر ہی لیں گے۔" تایا ابو کی بات سن کر امی جان نے فوراً ہی کہا۔

"بھائی جان شادی مہینے کی آخری تاریخ میں کر لیتے ہیں، ہماری تو پوری تیاری ہے۔ اچھا ہے بچوں کو وقت مل جائے گا اور ابھی پورے پندرہ دن ہیں تو بس شادی کے چند کپڑے جو خریدنا ہوں گے باقی جو کچھ ہم نے اپنی عرشال کے لیے رکھا ہے وہ ہم بہت پہلے ہی لے چکے ہیں۔ فرنیچر عرشال اپنی پسند کے لے آئے گی۔"

تائی امی نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا اور سب کو مٹھائی کھلائی۔ مٹھائی کھاتے ہی میں روم سے باہر آ گئی تھی، نمو اور مشی مجھے چھیڑنے لگی تھیں۔

شادی کی تیاریوں میں کچھ دن ایسے گذرے کہ پتا تک نہیں چلا اور آخر کار وہ دن آ گیا تھا جس کا مجھے اور عرش کو بے چینی سے انتظار تھا۔

شادی کے بعد عرش کے ساتھ گذرے دن اور رات میرے زندگی کے یادگار شب و روز تھے۔ میں اور عرش خوشیوں سے نہال ہو رہے تھے کہ عرش کی کمپنی سے کال آ گئی تھی اور عرش کو وقت سے پہلے ہی جانا پڑا تھا۔ میں اداس تھی۔ عرش کے کپڑے

پیک کرتے ہوئے تو عرش نے مجھے اداس دیکھ کر کہا تھا۔

''عرشو پلیز اداس مت ہو اس طرح' اگر اداس چھوڑ جاؤں گا تمہیں تو میرا دل بھی نہیں لگے گا وہاں، پلیز خوشی خوشی رخصت کرو تا کہ میں جلدی سے جاؤں اور جلدی سے واپس بھی آ جاؤں' پلیز اب تو مسکرا دو۔''

یہ کہہ کر انہوں نے مجھے گلے لگا لیا تھا۔ ابھی ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے ہوئے تھے کہ نمو بغیر نوک کیے بیڈروم میں داخل ہو گئی تھی۔ عرش اور مجھے کافی برا لگا' پر عرش نے اسے کچھ نہیں کہا اور اپنا سوٹ کیس لے کر بیڈروم سے چلے گئے' ان کے جاتے ہی میں نے نمو سے کہا

''نمو یار تو حد کرتی ہے۔ اس طرح بغیر نوک کیے بیڈروم میں آ جانا غلط بات ہے۔''

''شادی کے بعد تو تُو بالکل ہی بدل گئی ہے عرشو۔ بھائی کیا مل گئے۔ دوست اور دوستی سب کچھ بھول گئی۔ اب دیکھتی ہوں نا میں کہ بھائی کے جانے کے بعد تجھے اس دوست کی ہی ضرورت پڑے گی نا۔ پھر میں بھی تجھے ذرا ٹائم نہیں دوں گی۔'' نمو کی یہ بات سن کر میں مسکرا کر اس کے گلے سے لگ گئی تھی۔

عرش کے جانے کے بعد میں کافی اداس تھی تو اگلے روز تایا ابو اور تائی امی نے نمو کو کہا کہ تم مشی کے گھر مت جاؤ، اسے یہاں ہی بلا لو شام کی چائے تم لوگ اب یہیں پیا کرو تا کہ عرشال بیٹی کا دل لگا رہے۔''

''ٹھیک ہے ابو جان، میں ابھی مشی کو کال کر دیتی ہوں اور اسے گھر پر ہی بلا لیتی ہوں۔ عرشو تم چائے بنا کر چھت پر لے آؤ، میں مشی کا وہیں انتظار کر رہی ہوں۔''

مشی کے آتے ہی ہم دونوں چائے اور اسنیکس لے کر چھت پر چلے گئے۔ اسنیکس کھاتے ہوئے' میں نے ان دونوں کو اشاروں میں باتیں کرتا دیکھ کر کہا:

''میں کئی دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں کہ تم دونوں بہت بدل سی گئی ہو۔ مجھ سے بہت سی باتیں چھپانے لگی ہو، ایسا کیا ہو گیا ہے جو کہ مجھ سے چھپانا ضروری ہے؟''

میری بات سن کر نمو نے مسکرا کر میرے گالوں کو سہلاتے ہوئے کہا ''اب تو وقت آیا ہے عرش تجھے ہر بات بتانے کا، تجھے یاد ہے کہ تیری شادی سے پہلے مشی کے گھر سے میں آئی تھی اور تھوڑی چپ چپ سی تھی جس پر مشی نے کہا تھا کہ پہلی نظر کا پہلا پیار ہو گیا مجھے۔ عشق کا روگ لگ گیا۔''

''ہاں! یاد ہے مجھے' جب سے ہی تو دیکھ رہی ہوں کہ تم دونوں اتنا بدل گئی ہو کہ مجھے اگنور کرنا شروع کر دیا، بھلا کوئی دوست ایسا کرتا ہے؟''

''ٹھیک ہے میں بتاتی ہوں تجھے عرشو کہ نمو اور میرے درمیان کیا کیا باتیں ہوتی تھیں اور ہم آج کل کیا کیا کرتے ہیں؟ اپنا دل ذرا تھام لینا۔ تجھے تو پتا ہی ہے کہ نمو کو میرا لائف اسٹائل اچھا لگتا ہے۔ میری ماما کی طرف سے مجھے کوئی روک ٹوک نہیں ہے وہ سب جانتی ہیں کہ میں کسی ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اپنے بوائے فرینڈ چینج کرتی رہتی ہوں اور ان کے ساتھ فزیکلی ریلیشن میں بھی ہوں۔''

''مشی کی بات پر میں چونک اٹھی۔ مجھے یہ تو پتا ہی تھا کہ مشی کو نئے نئے لڑکوں سے دوستی کرنا اچھا لگتا ہے مگر یہ بات اس نے مجھ سے پہلے کبھی ڈسکس نہیں کی تھی کیونکہ اسے پتا تھا کہ میں اسے سمجھاؤں گی اور اس سے اپنی دوستی بھی ختم کر دوں گی اور نمو کو بھی

مشی سے ملنے سے روکوں گی ۔ میں بہت زیادہ حیران تھی ۔ مجھے حیران دیکھ کر مشی نے مسکراتے ہوئے کہا

''عرشو اتنی حیران کیوں ہو رہی ہے آج کل یہ سب نارمل بات ہے۔ یہی تو لائف ہے یار۔ بہت مزہ آتا ہے ۔ نئے نئے لڑکوں کے ساتھ نیا نیا ایکسپیرینس اور یو نو واٹ نمو کو بھی شروع ہی سے میرے جیسی لائف گذارنے کا شوق تھا، جو میں نے پورا کرادیا، کیوں نمو۔ ہا ہا ہا؟ میرے پاپا تو یہاں ہوتے ہی نہیں وہ تو ملک سے باہر ہوتے ہیں اور انسان کی کچھ نیڈز ہوتی ہیں، اس لیے میری ماما بھی اپنی نیڈز پوری کر لیتی ہیں اور میں نے بھی انہی سے اپنی نیڈ پوری کرنا سیکھ لیا۔ یو نو عرشو! میرج بیورو کا آفس تو بس ایک بہانا ہے، ایکچولی وہاں میرج بیورو کے نام پر کوئی اور دھندہ چلایا جاتا ہے۔ رشیدہ آنٹی، ماما اور حستان یہ تینوں مل کر یہ کام کرتے ہیں' اپنی گلی میں جو حیدر انکل تھے ان کی ڈیتھ کے بعد سے ان کی تینوں بیٹیوں کو ماما ہی تو اپنے ساتھ لے کر جاتی ہیں، اور بھی آگے پیچھے گلی کی بہت سی لڑکیاں ماما کے ساتھ کام کرتی ہیں اور میری کافی ساری کالج کی فرینڈز کو میں نے ماما سے ملوادیا ہے۔ ماما تو مجھے کب سے کہہ رہی تھیں کہ میں تم دونوں کو بھی ان کے پاس اسی کام کے لیے لے کر جاؤں مگر میں نے منع کر دیا تھا کہ تو تو ہمارا نام بدنام کر دے گی ابھی جو کام چھپ کر ہو رہا ہے وہی ٹھیک ہے۔''

مشی کی باتیں میرے ذہن و دل کو چھلنی کر رہی تھیں ۔ مجھے مشی کسی چنڈال سے کم نہیں لگ رہی تھی، اس کا یہ روپ میرے لیے بالکل نیا تھا اور قیامت سے کم بھی نہیں تھا جبکہ نمو اسی طرح ری ایکٹ کر رہی تھی جیسے اسے یہ سب سن کر کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ انتہائی نارمل انداز میں بیٹھی اور مسلسل مسکرا رہی تھی ۔ میں شوکڈ تھی اور بس بت بنی ان دونوں کو دیکھے جا رہی تھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں' کیا بولوں؟ پھر بھی میں نے مشی سے غصے میں کہا تھا۔

''مشی تو اتنی چنڈال نکلے گی میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے یہ تو پتا تھا کہ تو ایک آزاد خیال لڑکی ہے مگر تو چنڈال ہو گی، یہ تو میرے ذہن و گمان میں بھی نہیں تھا تو تو اس ڈائن سے بھی بدتر ہے جو لوگوں کا کلیجہ نکال لیتی ہے۔ کم از کم وہ سات گھر چھوڑ کر ایسا کرتی ہے مگر تو نے تو اپنی دوستوں تک کو نہیں چھوڑا۔ اپنے ہی محلے کی تمام لڑکیوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھایا؟''

''ہر ایک مجبور بھی نہیں ہوتا۔ بہت سی لڑکیاں اپنی خوشی سے یہ کام کر رہی ہیں۔ اپنی ضروریات خود پوری کرتی ہیں۔ او میری بھولی دوست یہاں اتنے انسٹیٹیوٹ ایسے ہیں جہاں یہی کام ہوتا ہے۔ اسکول کالجز کی لڑکیاں اپنی مرضی اور خوشی سے یہ کام کر رہی ہیں' اب تو نمو کو ہی دیکھ لے۔ نمو بھی تو کئی بار میرے ساتھ تیری شاپنگ کے دوران ڈیفنس جا چکی ہے اور جب ہم ڈیفنس نہیں جا پاتے تو ماما گھر میں ہی سب کچھ ارینج کر دیتی ہیں ۔ رشیدہ آنٹی اکثر آتی رہتی ہیں۔''

نمو کا نام سنتے ہی جیسے مجھ پر قیامت ہی ٹوٹ گئی ہو۔ نمو میری بچپن کی دوست' بہن اور تایا ابو کی بیٹی ہم ایک ہی خاندان کے اور وہ بھی ایسے خاندان سے تعلق رکھنے والے جہاں عزت اور غیرت پر جانیں بھی قربان کر دی جاتی ہیں۔ میں اسی سوچ میں حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی کہ جب یہ ساری باتیں تایا ابو، تائی امی، ابو جان اور امی جان کو پتا چلیں گی تو کیا ہوگا؟ اور اگر عرش کو پتا چلا تو وہ تو نمو کو جان سے ہی مار ڈالیں گے۔ نمو نے جب مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھا

تو مجھے ہلا کر کہا

”عرشو کیا سوچ رہی ہے؟ سچ میں یار یہ دنیا بہت اچھی ہے۔ بڑی رنگین ہے۔ بہت مزہ آتا ہے۔“

نمو کے منہ سے اس طرح کی باتیں سن کر مجھے انتہائی غصہ آیا۔ میں نے اسے تھپڑ مارا تو نمو نے مجھ پر ہاتھ اٹھا دیا، جسے مشی نے روک لیا اور ہنستے ہوئے بولی

”نہیں نمو عرشو پر ہاتھ مت اٹھانا، یہ تو بیچاری سیدھی سادی ہے نا اسے لائن پر آتے ہوئے وقت لگے گا۔“

مشی کی بات سنتے ہی مجھے انتہائی غصہ آیا اور میں نے غصے میں کہا

”مشی اپنی بکواس بند کر اور چلی جا یہاں سے، آج کے بعد ہمارے گھر میں اپنے منحوس قدم مت رکھنا اور نمو آج کے بعد تیرے ساتھ کہیں نہیں جائے گی سمجھی تو نمو میرے ساتھ نیچے چلو۔“

”شٹ اپ عرش میں کہیں نہیں جانے والی، اور مشی بھی کہیں نہیں جائے گی اور تو اپنا منہ بند رکھے گی۔ اگر......!“

”اگر! اگر کیا؟ نمو تو جانتی بھی ہے کہ تو کیا کہہ رہی ہے، دیکھ نمو یہ بہت غلط ہے، یہ دنیا اچھی نہیں ہے، اس میں سوائے بدنامی اور ذلت کے کچھ نہیں رکھا، ہمارے خاندان کا نام خراب ہوگا، ہمارے والدین بدنام ہو جائیں گے، جب عرش کو یہ سب پتا چلے گا تو وہ ٹوٹ جائیں گے۔ وہ تیری شادی کی تیاری کرنے میں مصروف ہیں پلیز نمو! ایسا کچھ مت کر۔ چھوڑ دے یہ سب کچھ۔“

میں نمو کا ہاتھ پکڑ کر اسے مسلسل سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مشی نے نمو کا ہاتھ چھڑوا کر کہا۔

”عرشو بس کر۔ اپنی بکواس بند کر، اگر تو نے کسی کو کچھ بھی بتایا تو میں کیا کر سکتی ہوں، اس کا تو اندازہ بھی نہیں لگا سکتی۔“

مشی کی یہ بات سن کر میں نے زور سے ایک تھپڑ رسید کیا، مشی نے نمو کو کچھ اشارہ کیا تو نمو نے مشی کا موبائل اٹھا کر مجھے اس میں سے ایک وڈیو دکھائی جسے دیکھ کر میں نے مشی کا موبائل ہاتھ میں لیا اور چھت پر رکھی چارپائی پر بیٹھ گئی اور میری آنکھوں سے مستقل آنسو گر رہے تھے۔ نمو اور مشی دونوں تالی مار کر ہنس رہی تھیں۔ مجھے اس وقت وہ دونوں چنڈال لگ رہی تھیں کہ کیا کوئی اتنا بھی گر سکتا ہے کہ اپنی بچپن کی دوست کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ پر یہ سب تو حقیقت تھا۔ یہ وڈیو میری اور عرش کی تھی شادی کی پہلی رات کی۔ میں انتہائی شوکڈ حالت میں تھی کہ مشی نے میرے ہاتھ سے اپنا موبائل لیا اور بولی

”عرشو جب تو بڑے سے گھونگھٹ میں بیٹھی عرش کا انتظار کر رہی تھی تب ہم دونوں نے کمرے میں آ کر موبائل ایسی جگہ چھپا دیا تھا جہاں تجھے اور عرش کو پتا نہ چلے اور تم دونوں کی وڈیو بھی بن جائے، صرف موبائل ہی نہیں ہم نے وہاں ایک مائیکرو کیمرہ بھی لگا دیا تھا، ہمارے پاس صرف اس موبائل میں ہی نہیں بلکہ اس کیمرے میں بھی ریکارڈنگ موجود ہے۔“

”کیونکہ ہمیں پتا تھا کہ تو ہمارے لیے ایک دن مصیبت ضرور بنے گی۔ تجھے قابو کرنے کے لیے کچھ تو وجہ ہونی چاہیے ہا ہا ہا، نمو بھی بہت گھٹیا انداز میں بولی۔

ان دونوں کی باتوں نے مجھے توڑ ہی ڈالا تھا۔ میں کب بے ہوش ہو کر گری تھی مجھے کچھ پتا ہی نہیں چلا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے روم میں تھی اور تایا ابو اور تائی امی میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں ان

کو سب کچھ بتانا چاہتی تھی، لیکن مشی اور نمو موبائل دکھا کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ تائی امی اور تایا ابو مجھے آرام کرنے کا کہہ کر چلے گئے اور ساتھ ہی نمو کو میرے پاس رات سونے کا کہہ دیا۔ مشی تو چلی گئی، رات بھر نمو میرے برابر میں لیٹی مشی کے انداز میں بیہودہ باتیں کرتی رہی اور میں چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ اس رات میں نے عرش کی کال بھی ریسیو نہیں کی۔ موبائل سائلنٹ کر کے آنکھیں بند کر کے لیٹی رہی اور مشی نمو کی دھمکی کا سوچتی رہی۔

☆☆☆

یا اللہ! میری بچی کو جانے کس کی نظر لگی ہے جو ہنستی بولتی بچی اتنی بیمار ہوگئی۔ میری بچی کو صحت یابی عطا فرما۔ سلمیٰ بیگم کو جائے نماز پر بیٹھ کر رو رو کر دعائیں مانگتے دیکھ کر انوار احمد بھی رونے لگے۔ سردار احمد نے بھائی کو چپ کراتے ہوئے کہا تھا:

''بس کرو انوار، بس کرو، ہماری بچی بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ نجمہ اور نمو گئی ہیں اسپتال، شام میں تم سلمیٰ کو لے جانا، رات سلمیٰ اسپتال میں رک جائے۔ کل پھر نمو کو چھوڑ دیں گے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ تسلی رکھو۔''

''بھائی جان آخر ایسی کیا بات ہوگئی تھی جو میری بچی اتنی بیمار ہوگئی۔ آخر کس بات کا صدمہ لگ گیا میری بچی کو۔ کون سی ایسی بات ہے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔ کسی سے کچھ بات بھی نہیں کرتی بس گم صم رہتے رہتے اب اسپتال پہنچ گئی ہے۔''

''صبر کرو سلمیٰ اس طرح رونے سے عرشال کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو جائے گی، انوار تم سلمیٰ کو سنبھالو، میں عرش کو کال کر کے پوچھتا ہوں کہ آخر کب تک پہنچے گا وہ پاکستان کے لیے روانہ تو ہو چکا ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں، تم خیال رکھو سلمیٰ کا۔''

''انوار آخر ہماری پھول سی بچی کو کس بات کا صدمہ لگا ہے جو اسے ہوش تک نہیں آ رہا۔ میری بچی کبھی زندگی میں اتنی بیمار نہیں ہوئی۔ ایک بچہ پہلے ہی کھو چکی ہوں۔ میں انوار اپنی بیٹی کو کھونا نہیں چاہتی۔ اسے ہوش کیوں نہیں آ رہا۔ انوار وہ کب ہوش میں آئے گی۔ پانچ دن سے بے ہوش ہے میری عرشو۔''

بیوی کا اس طرح زار و قطار روتا دیکھ کر انوار احمد کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ فکر تو انہیں بھی تھی کہ اچانک ہنستی بولتی عرشال کو کس کی نظر کھا گئی چپ چپ رہتے۔ وہ اتنی بیمار ہوگئی کہ پچھلے پانچ دنوں سے بے ہوش اسپتال میں پڑی ہے۔

☆☆☆

''یار مشی عرشو کو تو ہوش ہی نہیں آ رہا۔ وہ اتنی حساس نکلے گی مجھے اندازہ نہیں تھا۔ بھائی بھی اسپتال پہنچنے والے ہیں۔ اگر عرشو نے ہوش میں آنے کے بعد سب کو سب کچھ بتا دیا تو کیا ہوگا؟''

نمو فون پر چپکے سے مشی سے سرگوشی میں بات کر رہی تھی کہ اسے باتیں کرتا دیکھ کر عرش نے اس کے پاس آ کر کہا

''مجھے آئے ہوئے آدھا گھنٹہ گذر گیا، تم آدھے گھنٹے سے موبائل پر بات کر رہی ہو۔ وہاں تمہاری بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں اور تم!''

''بھائی آئی ایم سوری، مشی کی کال ہے وہ بھی عرشو کی خیریت معلوم ہی کر رہی تھی بس۔ اس کی بھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا جبھی کال پر......''

''اچھا بس تم یہ سب چھوڑو یہ بتاؤ آخر یہ سب کیسے ہوا؟ تم اس کے بہت قریب ہو، بچپن سے اس کی دوست ہو۔ کچھ تو بتایا ہوگا عرشو نے تمہیں کہ کس بات کو لے کر وہ اتنا ٹینس ہے۔ پلیز نمو مجھے بتاؤ۔ آخر ایسی کون سی بات ہے جو عرشو اس حد تک

پریشان کر گئی وہ اتنے دن سے بے ہوش ہے؟''
بھائی کے سوالوں سے گھبرا کر نمو بجائے کوئی جواب دینے کے ماں کے پاس بیٹھ کر رونے لگ گئی تھی۔

☆☆☆

''میں چھ سے سات دن اسپتال میں بے ہوش رہی، اس دن چھت پر نمو اور مشی کی دھمکیوں نے میرے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا کہ میں بہت پریشان رہنے لگی تھی، ٹھیک سے عرش سے بات بھی نہیں کر پا رہی تھی، فوراً خود کو چور سمجھنے لگی تھی۔ مشی اور نمو مسلسل مجھے اپنا کام کرنے پر مجبور کر رہے تھے کہ اب یہ دھمکیاں نہ صرف مجھے نمو اور مشی کی طرف سے موصول ہو رہی تھیں بلکہ اب تو آئے دن مشی کی ماما طاہرہ آنٹی بھی گھر آ جاتیں اور مجھے تایا ابو اور تائی امی سے نظر بچا کر دھمکیاں دیتیں کہ اگر میں نے ان کی بات نہ مانی تو وہ میری اور عرش کی وڈیو سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کر دیں گی۔ ان کے ساتھ مجھے رشیدہ اور حسان کی بھی دھمکیوں بھری کالز آنے لگیں۔ میں دن بہ دن بیمار رہنے لگی تھی۔ عرش بھی تنگ آ گئے تھے کہ میں انہیں ٹائم نہیں دے پا رہی تھی۔ ابو امی بھی میری دن بہ دن بگڑتی طبیعت کی وجہ سے بہت فکر مند تھے ادھر تایا ابو اور تائی امی بھی پریشان رہنے لگے تھے، کھانا پینا چھوٹ گیا تھا کہ ایک دن تائی امی نے کہا تھا
''عرشو بیٹا طاہرہ بھابی نے آج شام کو مشی کی سالگرہ کی پارٹی رکھی ہے۔ دعوت دے کر گئی ہیں شام، میں اور تم دوا لے کر سو رہی تھیں، نمو کے ساتھ چلے جانا رات کا کھانا وغیرہ وہیں کھانے کا کہا ہے انہوں نے، تھوڑا دل بہل جائے گا۔ اچھا لگے گا۔''
تائی امی کی بات سن کر میں مزید ڈر گئی تھی کہ اس چنڈال پارٹی میں میں اکیلی کیا کروں گی، کہیں ان لوگوں نے میرے ساتھ کچھ غلط کر دیا تو...... نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گی۔
''تائی امی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ آپ منع کر دیں نمو کو میں نہیں جا رہی۔''
''ارے ایسے کیسے نہیں جاؤ گی تم، میں نے تو اپنے کپڑوں کے ساتھ ساتھ تمہارے کپڑے بھی پریس کر دیے ہیں، طبیعت اچھی ہو جائے گی ابو جان آپ کہیں نا عرشو کو' آپ کی بات تو کبھی نہیں ٹالے گی۔''
نمو کی بات سن کر تایا جان نے بھی جانے کا حکم نامہ سنا دیا تھا۔ میں انتہائی ڈری ہوئی تھی پھر بھی مجھے تیار ہو کر وہاں جانا پڑا۔ میں خود کو مضبوط اور بہادر بنانے کی کوشش کرتی رہی، مگر بہت مشکل لگ رہا تھا۔ جب میں اور نمو مشی کے گھر پہنچے تو وہاں حیدر انکل مرحوم کی تینوں بیٹیاں بھی تھیں' ان کے علاوہ محلے کی کچھ اور لڑکیاں موجود تھیں اور کافی مرد بھی تھے، مجھے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ نمو اور مشی سب لڑکوں اور آدمیوں سے گلے مل کر باتیں کر رہے تھے کہ طاہرہ آنٹی میرے آ گئی تھیں اور میرے بازو زور سے پکڑ کر رشیدہ نامی خاتون کے پاس لے گئی تھیں۔ اس خاتون کو میں پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اس عورت کا چہرہ بہت عجیب تھا اور اس سے سختی عیاں ہو رہی تھی۔ خوفناک سے نقوش تھے۔ وہ ایک چنڈال عورت کا روپ تھا۔ طاہرہ آنٹی بھی اسی روپ کا عکس تھیں اور آج تو مجھے نمو اور مشی کے ساتھ ساتھ وہاں موجود لڑکے اور لڑکیاں اور مرد جن بھوتوں سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ میں خود کو نہایت مجبور اور بے سہارا محسوس کر رہی تھی کہ رشیدہ نامی عورت نے مجھے حسان پر زور سے دھکا دے دیا۔ میں اس سے بری طرح ٹکرائی اور اس نے مجھے اپنی بانہوں میں زور سے جکڑ لیا، اور مجھے زبردستی ایک روم میں لے جانے لگا۔ میں رو رو

کر نمو اور مشی سے مدد مانگتی رہی مگر وہ سب ہنستے رہے مجھے نمو پر انتہائی غصہ اور دکھ تھا حسان نے کمرے میں لے جا کر مجھے بیڈ پر دھکا دیا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے جگہ جگہ رکھے کیمرے اسٹارٹ کر دیے، اس نے میرے ساتھ زبردستی کرنی چاہی ،اپنا بچاؤ کرتے کرتے میں نے لیمپ حسان کے سر پر دے مارا، اس کے سر سے بہت زیادہ خون بہنے لگا وہ بہت زور سے چیخا تھا۔ میں ڈر گئی تھی۔ اب باہر سے دروازہ بجانے کی آواز آ رہی تھی۔ میں بری طرح ڈر گئی تھی کہ اگر وہ لوگ اندر آ گئے تو میرے ساتھ کیا کریں گے۔ میں کمرے کی ونڈو کھول کر گلی میں نکل تھی اور اپنے امی ابو کے گھر جا پہنچی تھی۔ وہ لوگ مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ میں چکرا کر کب گری تھی مجھے نہیں پتا اور میرا سر دیوار سے ٹکرا کر زخمی ہو چکا تھا اس کے بعد سے میں ہاسپٹل میں تھی۔

سب یہ جاننے کے لیے پریشان تھے کہ آخر مجھے ہوا کیا تھا؟ میں اس دن سالگرہ کی تقریب سے امی ابو کے گھر کیوں چلی گئی تھی اور اتنا کیوں روئی تھی ۔رو رو کر امی ابو کی طبیعت انتہائی خراب ہو چکی تھی۔

آٹھ دن کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو رات میں اسپتال کے روم میں صرف عرش میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر وہ مجھے گلے لگا کر بہت روئے۔ میں تو کب سے ان سے مل کر رونے کے لیے بے قرار تھی، مجھے چپ کروا کر جوس پلا کر کچھ بسکٹ کھلا کر وہ بولے تھے

''یہ کیا حالت بنالی ہے تم نے عرشو! میں تمہیں اس طرح تو نہیں چھوڑ کر گیا تھا نا؟ تم تو بالکل ٹھیک تھیں۔ پھر اچانک کیا ہو گیا یہ سب؟ پلیز مجھے کچھ تو بتاؤ ایسی کون سی بات ہے جو تمہیں اتنا پریشان کر رہی ہے؟ پلیز کچھ تو بتاؤ عرشو!''

''کیا بتاؤں عرش۔ سب کچھ ختم ہونے جا رہا ہے۔ میں نے بچانے کی کوشش کی ہے مگر بہت کچھ ختم بھی ہو چکا ہے۔ میں کیا بتاؤں آپ کو؟''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو عرشو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ اچھا چلو ٹھیک ہے تم آرام کرو میں گھر کال کر کے سب کو بتا دیتا ہوں کہ تمہیں ہوش آ گیا ہے۔ نمو تو بہت بے چین تھی جاتے جاتے بار بار کہہ کر گئی ہے تمہارے ہوش میں آنے کی اطلاع سب سے پہلے میں اسے کروں...... اسی کو کال کیے دیتا ہوں۔''

''نہیں نمو کو مت بتانا کہ مجھے ہوش آ گیا ہے۔ اسے مت بتانا پلیز مجھے یہاں سے دور لے چلیں مجھے یہاں نہیں رہنا۔''

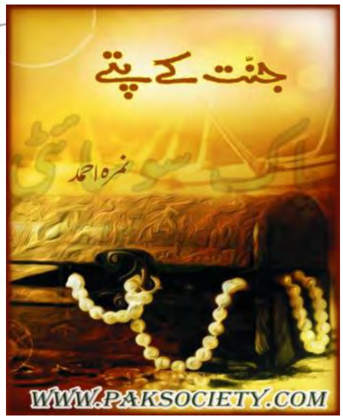
''تم رو کیوں رہی ہو عرشال، اور نمو کو کیوں نہیں بتاؤں وہ تو تمہاری بچپن کی دوست بھی ہے نا پھر تم منع کیوں کر رہی ہو؟''

''وہ میری دوست نہیں ہے' سب سے بڑی دشمن ہے۔ وہ...... وہ۔ پلیز اسے کچھ مت بتانا اور نہ ہی مہ وش کو' وہ لوگ مجھے برباد کر دیں گے۔ مجھے کسی قابل نہیں چھوڑیں گے مجھے آپ کے قابل بھی نہیں رہنے دینا چاہتے عرش! میں مر جاؤں گی کبھی آپ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی حرام سمجھتی ہوں۔''

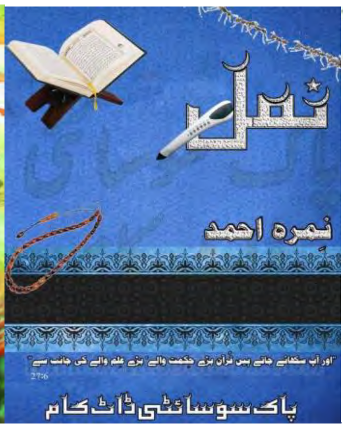
''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو عرشو! نرمین کے بارے میں اس طرح کی باتیں؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ سب کیا بکواس لگا رکھی ہے آخر بات کیا ہے بتاؤ مجھے؟''

جب میں نے عرش کو ان کے دوبئی جانے کے بعد کی تمام روداد سنائی تھی تو انہیں یقین نہیں آیا کہ نرمین کبھی ایسا بھی کر سکتی ہے؟ میں بہت ڈری اور سہمی ہوئی تھی' دو دنوں بعد مجھے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا' عرش مجھے امی ابو کے گھر لے آئے، مجھے

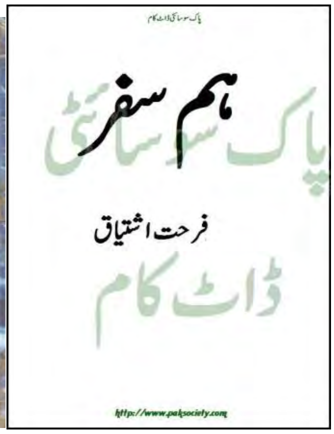
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

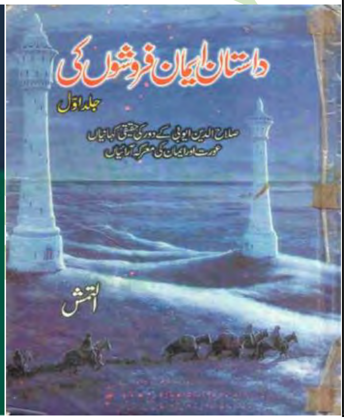




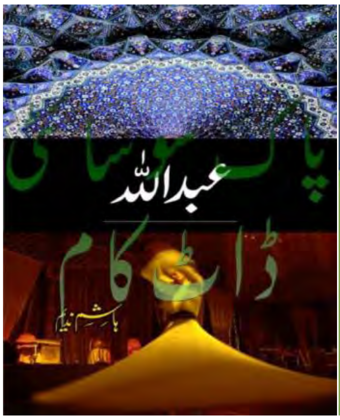


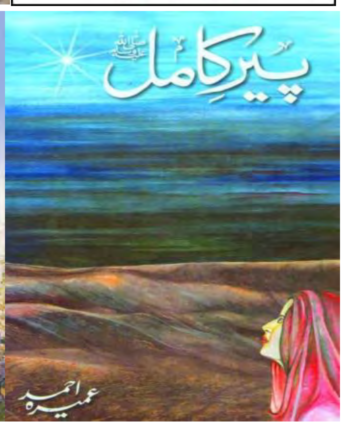


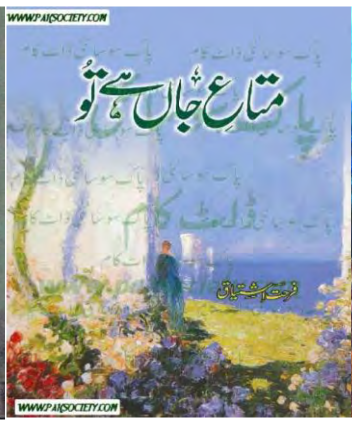


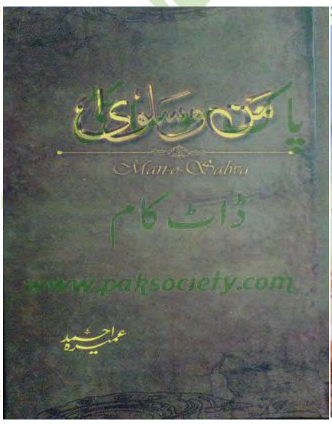




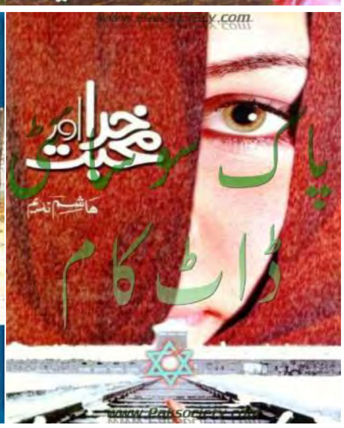


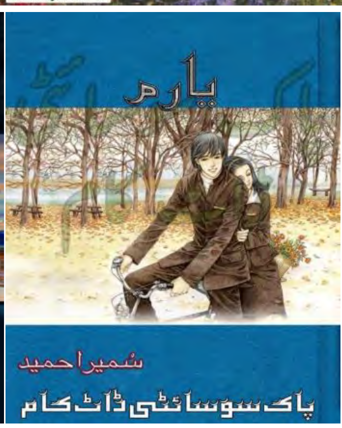




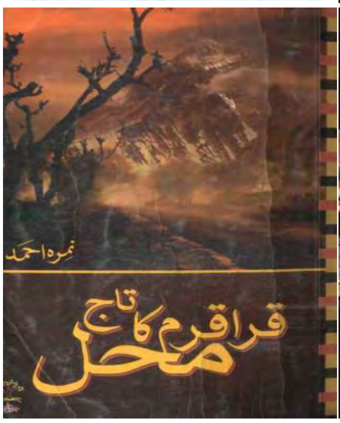












مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح

محترمہ فاطمہ جناح قائداعظم کی بہن تھیں۔ وہ ۱۸۹۳ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ۱۹۲۸ء میں دندان سازی کا کورس مکمل کیا اور پھر پاکستان بنانے کی جدوجہد میں قائداعظم کے ساتھ شامل ہوگئیں۔

پاکستان بننے کے بعد وہ پہلی خاتون اوّل تھیں۔ جنہوں نے ۱۹۶۴ء میں صدر ایوب کے خلاف صدارتی الیکشن میں حصہ لیا لیکن کامیاب نہ ہوسکیں۔ ان کا انتقال ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء کو کراچی میں ہوا اور کراچی میں ہی اپنے بھائی بانی پاکستان قائداعظم کے مزار کے احاطے میں سپردخاک ہوئیں۔

وہاں چھوڑ دیا' نرمین پر کچھ بھی ظاہر کیے بغیر خود تحقیقات میں لگ گئے۔ جب محلے کے لڑکوں سے پتا چلا اور خود انہوں نے رشیدہ اور حسان کو وہاں آتے جاتے دیکھا، طاہرہ آنٹی اور مہوش پر بھی نظر رکھی۔ ڈیفنس کا اڈہ بھی دیکھا جو میرج بیورو کے نام سے چلایا جارہا تھا۔ عرش اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے کیونکہ نمو کا بدلا روپ سب کے لیے ہی سرپرائز تھا' مہ وش کے ساتھ جب نمو کو اس کی کار میں دیکھا تو عرش بہت شوکڈ رہ گئے کہ وہ تو انکوائری کرنے نکلے تھے نرمین اسی میرج بیورو میں مہ وش کے ساتھ گئی اور وہاں پہنچ کر عرش نے اندر جا کر دیکھا تو نمو لڑکوں کے ساتھ نازیبا حالت میں تھی۔ اور وہ نرمین کو اپنے ساتھ لے کر آئے اور گھر پر آ کر خوب مارا اور خوب روئے۔ تایا ابو کو ہارٹ اٹیک ہوگیا اور وہ اسی صدمے سے چل بسے، ہمارا ہنستا بولتا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

نمو ایک زندہ لاش کی طرح بن کر رہ گئی تھی کہ اس کی وجہ سے تایا ابو کا انتقال ہوگیا تھا۔ عرش وہ محلّہ چھوڑ کر نئے ایریا میں گھر لے چکے تھے۔ ابو امی بھی ہمارے ساتھ ہی شفٹ ہوگئے تھے۔ تائی امی بھی نمو سے بات نہ کرتی تھیں۔ عرش تو نمو کو دیکھتے ہی نہیں تھے، نمو کو تو لت لگی ہوئی تھی۔ کچھ دن تو وہ گھر میں چپ چاپ رہی، موقع دیکھ کر اس نے حسان کو عرش کے موبائل سے کال کر کے بلایا اور کاغذ پر ایک نوٹ چھوڑ کر گھر سے چلی گئی۔ نہیں پتا نمو کہاں چلی گئی اور عرش نے تو اس کا نوٹ پڑھ کر بھی اسے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ نمو نے اپنے نوٹ میں لکھا تھا کہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کریں۔

مہ وش' طاہرہ آنٹی' رشیدہ اور حسان یہ لوگ انسان نہیں ہیں یہ انسان کے لبادہ میں چنڈال ہیں جو کہ ہنستے بستے گھروں کو جہنم بنادیتے ہیں، کاش نمو نے عقل سے کام لیا ہوتا اور وہ رنگین دنیا کے خواب نہ دیکھتی، اس سے متاثر نہ ہوتی تو وہ بھی انسان ہی رہتی نہ کہ چنڈال۔ انسان کے بہت سے روپ ہیں جن میں سے انسان کا ایک روپ ہے چنڈال ایک عورت ہی کیسے کسی دوسری عورت کا گھر اور کردار تباہ کرسکتی ہے۔ عورت کا چنڈال روپ میں کبھی نہیں بھول سکتی کاش نمو بھی رنگینوں سے متاثر نہ ہوتی، کاش مہ وش بچپن کی طرح شرارتی ہی رہتی، بس خراب نہ ہوتی، کاش طاہرہ آنٹی سعید انکل کے ملک سے باہر جانے کا فائدہ نہ اٹھاتیں، کاش رشیدہ کے دل میں انسانیت ہوتی، کاش میں ایک عورت کا ایسا بہروپ نہ دیکھتی کاش...... کاش...... کاش!

☆☆☆

اس ماہ کی خصوصی کہانیاں

دوسری کہانی

مجرم کون؟

راحت وفا راجپوت

ایک بہو کی کہانی جس کے سسر کی نظریں بدل گئی تھیں



جس دن امّی جان نے مجھے چائے لے کر ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے سامنے آنے کا کہا تھا، میں اسی دن سمجھ گئی تھی کہ میرا اِس گھر سے جانے کا وقت آ گیا ہے اور ہُوا بھی یہی، میرے لیے آنے والا پہلا ہی رشتہ قبول کر لیا گیا، میں چائے لے کر ڈرائنگ روم میں گئی تو میری نظریں جھکی ہوئی تھیں اور ہاتھوں میں پکڑی ٹرے دھیرے دھیرے لرز رہی تھی۔

''اِدھر آؤ بیٹی! میرے پاس بیٹھو!'' ایک نرم آواز پر میں نے سامنے دیکھا، پچاس، پچپن سال کے ایک صاحب سامنے بیٹھے تھے، میں نے امی جان کی طرف دیکھا تو انہوں نے اشارے سے مجھے اُن صاحب کے پاس جانے کو کہا، میں نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور ان کے قریب بیٹھ گئی، وہ مجھ سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھتے رہے، میں آہستہ آواز میں جواب دیتی رہی، پھر امی جان نے مجھے کچن میں جا کر کھانا دیکھنے کا کہا، میں اٹھی تو میری نظر دوسری طرف بیٹھے لڑکے پر پڑی وہ مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا، مجھے پہلے اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا تھا، میں نروس ہو کر تیزی سے باہر نکل آئی، بعد میں پتہ چلا وہ سلمان تھے جن سے بعد میں میری شادی ہوگئی۔

میرا نام کرن ہے، بی اے کرنے کے بعد میں نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے امی جان نے فیصلہ کیا کہ اگر مزید نہیں پڑھنا تو شادی کر کے اپنے گھر جاؤ، میں دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی، بڑے بھائی اور مجھ سے چھوٹا بھائی، دونوں مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، میں امی ابو کی بھی لاڈلی تھی، ہمارا گھرانہ مالی طور پر بھی خوشحال تھا، اس لیے میں فطرتاً لاابالی تھی۔

میرے شوہر سلمان بٹ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا، میرے سسر وقار بٹ فوج سے ریٹائر ہو چکے تھے، سلمان ایک پرائیویٹ فرم میں اچھی پوسٹ پر تھے، اس کے علاوہ ایک بہترین علاقے میں ان کا ایک اور گھر بھی تھا جس کا ٹھیک ٹھاک کرایہ آتا تھا، وقار انکل کی پنشن بھی آتی تھی، میرے گھر والوں کو یہ رشتہ آئیڈیل لگا۔ یوں میں بیاہ کر سلمان کے گھر آ گئی تھی ۔ گھر بہت شاندار اور بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا، ہمارا بیڈ روم بہت کشادہ اور خوبصورت تھا۔ انکل کا کمرہ الگ تھا، اس کے علاوہ لاؤنج اور ڈرائنگ روم بھی تھا، گھر کی چھت پر بھی ایک کمرہ بنا ہوا تھا جس میں فالتو سامان رکھا ہوا تھا، میرے جہیز کے سامان کی وجہ سے پرانا فرنیچر اوپر رکھا گیا تھا۔

شادی کی پہلی رات ہی سلمان نے اپنی باتوں سے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، بلاشبہ وہ بہت خوبصورت انسان تھے۔ میں بھی خوبصورت چہرے اور سراپے کی مالک تھی، میرے بال بھی بہت گھنے اور سیاہ تھے ۔ مجموعی طور پر میں ایک حسین لڑکی تھی، دوسرے لفظوں میں ہماری جوڑی کمال کی تھی۔

شادی کے بعد پہلی صبح سلمان ابھی سو رہے تھے، میں تیار ہو کر باہر آئی تھی۔ سوچا تھا کہ میری آؤ بھگت کرنے والا گھر میں کوئی نہیں ہے تو خود ہی چائے بنالوں، میں باہر آئی تو ڈائننگ ٹیبل پر انکل وقار بیٹھے تھے، وہ جوس پی رہے تھے۔ میں نے سلام کیا' کہنے لگے

''آؤ بیٹی! اس گھر میں آج تمہارا پہلا دن ہے، تمہاری ساس ہوتیں تو تمہارے لیے ناشتہ بناتیں، اس لیے اب میں تمہارے لیے بہت اچھا سا ناشتہ بناتا ہوں۔''

''نہیں، انکل! میں خود بنالوں گی، آپ بتایئے کیا کھائیں گے؟ میں آپ کے لیے بھی ناشتہ

بناتی ہوں۔'' مگرانہوں نے مجھے کچھ نہیں کرنے دیا اور میرے لیے بہت اچھا ناشتہ بنا لائے، ناشتہ کرتے ہوئے باتیں کرتے رہے، میری جھجک بھی دور ہوگئی، وہ بہت اچھی طبیعت کے مالک تھے۔

شام کو ہم امی کی طرف چلے گئے، وہاں سے رات کو ڈنر کے بعد واپس آئے، گیٹ کی چابی ہمارے پاس بھی تھی، انکل سو چکے تھے۔ آنے والے چند دنوں میں ہی میں نئے گھر میں ایڈجسٹ ہوگئی، میرے گھر والے بہت مطمئن تھے کہ ان کی بیٹی کو بہت اچھا سسرال ملا تھا۔

ایک ہفتے بعد ہم ہنی مون کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف نکل گئے تھے، پندرہ دن کے بعد واپس آئے۔ ہمارے آنے پر انکل بہت خوش تھے اتنے دن اکیلے جو رہے تھے۔

سلمان کی چھٹیاں ختم ہوگئیں تو وہ آفس جانے لگے، میں نے گھر مکمل طور پر سنبھال لیا تھا۔ سلمان صبح نو بجے آفس جاتے تھے، میں ناشتہ بنا کر ان کی تیاری میں مدد کرتی، ان کے جانے کے بعد اپنا اور انکل کا ناشتہ تیار کرتی۔ انکل صبح سویرے واک کے لیے جاتے تھے۔ وہاں سے آکر لیٹ جاتے اور دس بجے ناشتہ کرتے تھے۔ واک کے بعد وہ پہلے جوس پیتے تھے، ناشتہ کرنے اور اخبار پڑھنے کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھتے رہتے۔ اس دوران میں صفائی اور کپڑے وغیرہ دھونے کا کام کرلیتی، ساتھ ساتھ ٹی وی بھی دیکھتی رہتی۔ دوپہر صرف ہم دونوں ہوتے تھے، اس لیے ہلکا پھلکا لنچ کرتے، البتہ رات کو کھانے پر اہتمام ہوتا۔ لنچ کے بعد انکل اپنے کمرے میں جا کر سو جاتے۔ میں بھی ریسٹ کرتی اور پانچ بجے خود تیار ہوکر چائے وغیرہ بنالیتی۔ سلمان آتے تو ہم دونوں اکٹھے چائے پیتے۔ رات کے کھانے کے بعد انکل واک کے لیے نکل جاتے، میں کچن سمیٹتی، پھر میں اور سلمان صبح ناشتے کے لیے سامان وغیرہ لینے قریبی اسٹور پر چلے جاتے، رات کو میں انکل کو ایک گلاس دودھ دے کر اپنے بیڈروم میں آجاتی تھی۔

میری زندگی بہت خوبصورت ہوگئی تھی۔ محبت کرنے والا شوہر اور خیال رکھنے والا سسر تھا۔ انکل اکثر کاموں میں میرا ہاتھ بٹا دیتے تھے۔ اکثر ہم فلم دیکھتے اس پر تبصرہ کرتے، ٹاک شو پر بحث کرتے۔ سلمان خوش تھے کہ میں اس کے والد کا بہت خیال رکھتی تھی۔

دن گذرتے گئے اور ہماری شادی کو ایک سال ہوگیا۔ ابھی ہمارا بچے کی طرف دھیان نہیں تھا، امی کہتی تھیں کہ میں کسی ڈاکٹر کو چیک کرالوں مگر سلمان کا خیال تھا کہ ابھی دو سال تک ہمیں زندگی کو انجوائے کرنا چاہیے، اس لیے بچہ کی ذمہ داری میں نہیں پڑنا چاہیے۔ میں بھی ان کے اس خیال سے متفق تھی۔

ہماری شادی کی پہلی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کا فیصلہ انکل کا تھا۔ بڑے پیمانے پر تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ انکل نے مجھے اور سلمان کو تحفے کے طور پر پچاس ہزار روپے دیئے تھے کہ ہم اپنی مرضی سے گفٹ خریدلیں۔ سارا انتظام بھی انہوں نے کیا تھا۔ اس تقریب میں سلمان کے عزیز رشتے دار، میرے میکے والے اور دوست احباب سب مدعو تھے وہ نومبر کا خوشگوار موسم اور مہینہ تھا سلمان نے مجھے سرخ اور سبز رنگ کی بنارسی ساڑھی اور گولڈ کا سیٹ دیا تھا، مہمان آنے میں ابھی دیر تھی۔ میں اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھی، سلمان میرے لیے گجرے لینے گئے ہوئے تھے۔ میں نے ساڑھی کو استری کرکے بیڈ پر پھیلا رکھا تھا اور بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں ملبوس ڈائر سے اپنے بال سکھا رہی تھی،

شادی کے بعد آسودگی سے میرا جسم بھر سا گیا تھا، ساڑھی سلمان کو بہت پسند تھی اور ان کی خواہش تھی کہ میں تقریب میں دلہن بنی نظر آؤں۔ اس لیے میری تیاری بھی ویسی ہو رہی تھی۔ میں گنگناتے ہوئے بال سکھا رہی تھی کہ بیڈروم کا دروازہ کھلا۔ میں سمجھی سلمان آئے ہیں، میں مڑی تو دروازے پر وقار انکل کھڑے تھے، میں چند لمحے تو ناسمجھی سے انہیں دیکھتی رہی، پھر تیزی سے سائیڈ پر پڑا تولیہ اٹھا کر اپنے سینے پر پھیلا لیا، انکل چند لمحے حیران کھڑے رہے پھر تیزی سے پلٹ گئے۔ مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوئی اتنے میں سلمان آ گئے وہ تیاری میں میری مدد کرنے لگے۔ ذرا دیر میں ہی میں سب کچھ بھول چکی تھی۔

سالگرہ بہت شاندار رہی تھی، سب نے ہمیں بہت خوبصورت تحائف دیئے تھے چند دن گزرے تو میں نے محسوس کیا کہ انکل بہت چپ چپ رہنے لگے ہیں سلمان نے انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا کہا تو انہوں نے انکار کر دیا، پھر دو چار دن بعد وہ پہلے کی طرح ہو گئے اور گھر میں اب وہی روٹین تھی۔ سارا دن گھر کا کام کر کے انکل سے گپ شپ کرتے گزر جاتا۔ مگر کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ انکل اکثر مجھے بہت غور سے دیکھنے لگتے تھے، لیکن جب میں متوجہ ہوتی تو وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگتے تھے۔

ایک دوپہر میں کپڑے دھو کر فارغ ہوئی تو میں نے سوچا لاؤنج بہت گندا ہو رہا ہے اسے دھولوں، میں پائپ لگا کر دھونے لگی اس وقت انکل سو رہے تھے، اس لیے میں سکون سے اپنا کام کر رہی تھی۔ میرے سارے کپڑے گیلے ہو چکے تھے۔ میں گنگنا رہی تھی کہ اچانک مجھے عجیب سا احساس ہوا، میں نے پلٹ کر دیکھا تو انکل اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑے مجھے گھور رہے تھے، میں دوپٹے کے بغیر تھی اور کپڑے گیلے ہو کر جسم سے چپک رہے تھے میں نے صوفے پر پڑا دوپٹہ اٹھا کر گلے میں ڈال لیا۔ مجھے ایک دم ہی احساس ہوا کہ انکل کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ہیں جو ایک باپ کے ہرگز نہیں تھے، عورت کو اللہ نے ایک ایسی حس دی ہے جو وہ سامنے والے مرد کی نظروں کو پہچان جاتی ہے۔ پھر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں پریشان سی وہیں بیٹھ گئی، کچھ دیر سوچتی رہی پھر خود ہی اپنے آپ کو دلاسہ دے دیا کہ مجھے ایسی ویسی بات نہیں سوچنی چاہیے۔

پانی میں بھیگنے سے مجھے بخار ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے کھانا بنایا اور اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ سلمان گھر آئے تو مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ واپس آ کر مجھے چائے بنا کر دی۔ میں دوائی کھا کر دوبارہ سو گئی تھی۔ صبح آفس جاتے ہوئے سلمان نے مجھے جگایا اور آرام کرنے کی تاکید کرتے ہوئے آفس چلے گئے تھے۔ دوائی کی وجہ سے میں غنودگی میں تھی، ویسے ہی لیٹے رہی تھی۔

غنودگی میں پتہ نہیں کتنی دیر ہو گئی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے چہرے پر ہاتھ پھیر رہا ہے، میں نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں تو کوئی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بند ہوتی آنکھوں میں مجھے انکل کا چہرہ نظر آیا، پھر مجھے ہوش نہ رہا تھا۔ دوپہر کو سلمان آفس سے آ گئے تھے اور مجھے ڈبل روٹی کے ساتھ چائے دی تھی۔ شام کو وہ مجھے دوبارہ ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ اب بخار کافی ہلکا ہو گیا تھا۔

اگلی صبح میری طبیعت کچھ بہتر تھی پھر بھی انکل نے خود ناشتہ بنا کر سلمان اور مجھے دیا تھا، سلمان چھٹی کرنا چاہتے تھے مگر انکل نے انہیں زبردستی آفس بھیج

دیا تھا، اب میں انکل کی طرف سے کھٹک گئی تھی، سو میں نے دوائی نہیں کھائی کیونکہ دوا کھانے سے بہت زیادہ غنودگی ہو جاتی تھی۔ میں لیٹی رہی۔ تقریباً دس بجے کا ٹائم تھا کہ میرے بیڈروم کا دروازہ آہستہ سے کھلا، میں نے آنکھیں بند کر لیں، انکل میرے بستر کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے، پھر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور جھک کر اپنے گال پر رکھ لیا، میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے، اب میں انکل کی نیت کو سمجھ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ چھڑایا اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''لیٹی رہو!'' وہ مصنوعی ہمدردی سے بولے ''میں دیکھ رہا تھا اب تمہیں بخار ہے یا نہیں؟ تمہیں بھوک لگی ہے تو کچھ بنا لاؤں۔'' وہ کہہ رہے تھے اور میرا سارا وجود زلزلوں کی زد میں تھا پھر وہ باہر چلے گئے، میں نے جلدی سے اٹھ کر اندر سے دروازے کی کنڈی لگا لی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، میری ہنستی کھیلتی زندگی پر یہ کیسا سایہ آن کھڑا ہوا تھا۔ میں رو رو کر خدا سے فریاد کرنے لگی تھی۔

یہ مرد کی فطرت ہے کہ جب تک اس کی نیت چھپی رہے اس میں کچھ جھجک رہتی ہے مگر جب نیت کھل جائے تو وہ اور بیباک ہو جاتا ہے۔ انکل کو بھی جب یہ اندازہ ہوا کہ میں ان کی نیت بھانپ گئی ہوں تو وہ کھل کر سامنے آ گئے۔

اب میں گھر کا کام کاج کر کے اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔ انکل بہانے بہانے سے میرے ارد گرد رہتے، کبھی میرا ہاتھ پکڑ لیتے تو کبھی گزرتے ہوئے میری کمر کو چھو لیتے، میں لرز کر رہ جاتی تھی۔ یہ صورت حال میں سلمان کو بتا سکتی تھی اور نہ اپنے گھر والوں کو، سلمان کبھی بھی اپنے باپ کے بارے میں ایسی بات پر یقین نہیں کرتے بلکہ ہو سکتا تھا مجھے گھر سے نکال دیتے۔ خوف کے مارے میرا خون خشک ہوتا رہتا تھا، دن بہ دن میں اندر سے کمزور ہوتی جا رہی تھی، رنگ زرد ہو گیا تھا۔ امی کے گھر جاتی تو وہ پوچھتیں کہ ''کیا بات ہے سلمان تمہارا خیال نہیں رکھتے؟'' میں انہیں جھوٹی تسلیاں دیتی رہتی۔ سلمان پوچھتے تو تھکاوٹ کا بہانہ کر دیتی۔ اس مسئلے سے نجات کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دوسری طرف انکل میری خاموشی کو میری کمزوری اور بے بسی سمجھ رہے تھے۔ وہ موقع ملتے ہی ایسے ذومعنی جملے بولتے کہ میں شرم سے کٹ کر رہ جاتی، مگر میں چہرے کو سپاٹ رکھتی تھی۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

ایک شام سلمان آفس سے آئے تو کہنے لگے میرے دو سوٹ نکال کر اور ضروری سامان بریف کیس میں رکھ دو، میں دو دن کے لیے فیصل آباد جا رہا ہوں، آفس والے مجھے ایک ضروری کام سے بھیج رہے ہیں۔ یہ بات سن کر میں تو خوفزدہ ہو گئی اور میں نے بہت کوشش کی سلمان نہ جائیں یا پھر جاتے ہوئے مجھے امی کے گھر چھوڑ دیں مگر سلمان کے پاس ٹائم کم تھا، انہوں نے کہا تھا کہ ''ابو تمہیں صبح چھوڑ آئیں گے اور میں واپس آ کر تمہیں لے آؤں گا''...... یہ بات سن کر میں چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ سلمان چلے گئے تھے۔ میں نے کھانا بنایا، انکل کو کھانا کمرے میں دے کر میں نے برتن وغیرہ سمیٹے اور طبیعت کی خرابی کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی، میرا دل بہت پریشان ہو رہا تھا، کھانا کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا اور پھر سوچتے سوچتے نہ جانے کب میں سو گئی کہ اچانک دروازے پر تیز تیز دستک ہوئی، میں ڈر کے اٹھ گئی۔

''کرن! دروازہ کھولو، میرے سینے میں شدید تکلیف ہو رہی ہے، مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔''

باہر سے انکل کی کرب انگیز آواز آئی۔ میں سب کچھ بھول کر دروازہ کھولنے بڑھی۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ انکل کی کوئی چال نہ ہو، میں رک گئی۔ وہ دروازہ کھٹکھٹاتے رہے اور پھر تھک کر شاید واپس چلے گئے تھے تو میں نے سکون کی سانس لی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا تھا اور کچن میں آ گئی تھی۔ بھوک سے میرے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے، میں چائے بنانے لگی تھی کہ اچانک انکل نے پیچھے سے آ کر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا اور گالی دیتے ہوئے بولے تھے

''کب تک مجھ سے بچو گی؟''...... میں تو ان کے منہ سے گالی سن کر ششدر رہ گئی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں نے پوری قوت سے اپنے آپ کو چھڑایا تھا اور کچن سے بھاگ کر باہر آ گئی تھی مگر اس سے پہلے کہ میں کمرے میں گھس جاتی، انہوں نے مجھے پیچھے سے پکڑ لیا تھا۔ میں لڑکھڑا گئی تھی۔

''کب تک بچو گی، میرے اندر آگ لگا کر اب دور بھاگتی ہو؟'' ان کے منہ سے جیسے آگ نکل رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو چھڑایا تھا اور ادھر اُدھر بھاگنے لگی تھی، وہ میرے پیچھے بھاگتے بھاگتے ہانپ رہے تھے۔

''آج تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ میرے قریب آ چکے تھے۔ اب میں صوفے کے گرد بھاگ رہی تھی، پھر اچانک انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ میں آگے ہوئی تھی تو انہیں جھٹکا لگا تھا۔ وہ تھک چکے تھے لڑکھڑائے اور نیچے گر گئے۔ درمیان میں سینٹر ٹیبل پڑا تھا، ان کا سر اس سے ٹکرایا تھا اور وہ دھڑام سے نیچے گر گئے تھے۔ ان کے سر سے خون کا جیسے فوارہ نکلا تھا۔ میں ہکا بکا کھڑی تھی جبکہ وہ بالکل بے سدھ پڑے تھے۔

میں نے اپنا دوپٹہ لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالا تھا، بال ٹھیک کیے تھے اور باہر کا دروازہ کھول کر ہمسائے کے گھر زور زور سے دستک دینے لگی تھی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ارد گرد لوگ اکٹھے ہو گئے تھے تو میں نے انہیں بتایا تھا کہ...... ''میں اپنے کمرے میں سوئی ہوئی تھی، پانی پینے کے لیے اٹھی اور اپنے کمرے سے باہر آئی تو باہر انکل گرے ہوئے تھے۔ شاید باہر سے آئے تھے، چوٹ لگ گئی تو بے ہوش ہو گئے۔'' یہ کہہ کر میں رونے لگی تھی۔

انکل کو اسپتال پہنچایا گیا مگر وہ مر چکے تھے۔ سلمان کو اطلاع دی گئی وہ پہلی فلائٹ سے پہنچ گئے۔ ان کی حالت دیکھنے والی نہ تھی، ماں تو پہلے ہی نہیں تھی اب باپ بھی چلا گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر رو رہے تھے اور میں اپنے دکھ کو رو رہی تھی اور پھر انکل کی تدفین ہو گئی۔ قل ہو گئے، تمام عزیز رشتے دار اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ میں سلمان کو سنبھالتے سنبھالتے تھکنے لگی تھی۔ ان کا صدمہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔ کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا، آخر دس دن گذر گئے، سلمان کو ان کے آفس کے دوست زبردستی آفس لے جانے لگے تھے۔

میں اب اندر سے بہت خوفزدہ تھی اور اس احساس جرم سے بے حال ہو رہی تھی کہ میرے ہاتھوں ایک قتل ہو چکا تھا۔ میری وجہ سے انکل اس دنیا سے چلے گئے تھے، مجھے اپنا آپ قاتل لگتا تھا۔ مجھے پہلے کوئی اور دکھ تھا اور اب کوئی اور روگ میری جان کو چمٹ گیا تھا۔ میری حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔

سلمان اب مکمل طور پر سنبھل چکے تھے اور اب انہیں میری فکر رہنے لگی تھی۔ انہی دنوں مجھے ماں بننے کی خبر بھی ملی تھی۔ میری حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اکثر خواب میں انکل نظر آتے

تو میں چیخ مار کر اٹھ جاتی، میری لیڈی ڈاکٹر نے سلمان سے کہہ دیا تھا آپ کی بیوی اگر اسی طرح ٹینشن لیتی رہی تو آپ ہونے والے بچے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ سلمان یہی سمجھ رہے تھے کہ مجھے انکل کی وفات کا دکھ ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میں اپنے آپ کو انکل کی قاتل اور مجرم سمجھ رہی ہوں۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ میں تھانے چلی جاؤں اور اقرار جرم کرلوں۔ اور پھر سلمان نے مجھے امی کے پاس بھیج دیا تھا کہ میرا دل سنبھل سکے۔

امی کے گھر آ کر میں ویسے ہی تھی، گم صم اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر چیخنا چلاّنا اور پھر اونچی آواز میں رونا۔ میرے ماں باپ میری حالت بہت پریشان تھے۔ ایک دن میں ناشتے کے بعد لاؤنج میں بیٹھی تھی اور بے دھیانی میں دیکھ تو ٹی وی رہی تھی لیکن میرے ذہن میں وہی ایک فلم چل رہی تھی' انکل کا مجھے پکڑنا، میرے پیچھے بھاگنا اور پھر گر جانا' خون نکلنا...... میرا دل متلانے لگا تھا، میں اٹھ کر واش روم میں گئی تھی' قے کرنے کے بعد کچھ سکون ملا تھا' میں نے وضو کیا تھا اور جائے نماز پر روتے ہوئے سجدے میں سر رکھ کر خدا سے سکون کی دعا مانگنے لگی تھی اور روتے روتے وہیں سوگئی تھی۔

اگلے روز میری ایک دوست کی آمد ہوئی تھی، اس نے مجھے ایک بزرگ کے بارے میں بتایا تھا جو روحانی اور نفسیاتی مسائل کا حل بتاتے تھے۔ میں نے سہیلی کے دیے ہوئے فون نمبر پر ان سے رابطہ کیا اور ملنے کی اجازت لی۔ انہوں نے اگلے دن دوپہر کو آنے کا کہا تھا۔ اگلے دن میں امی جان سے ضروری شاپنگ کا بہانہ کیا اور ان کے پاس پہنچ گئی' میں نے اپنا سارا جسم اور آنکھوں کے سوا چہرہ بھی ڈھانک رکھا تھا۔ وہ نورانی چہرہ بزرگ تھے۔ میں نے تعارف کرایا تو انہوں نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا تھا۔

''جی بیٹی! فرمایئے آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی تھیں؟'' انہوں نے شفقت سے پوچھا میں خاموش رہی تو کہنے لگے'' آپ تسلی سے بلا جھجک اپنا مسئلہ بیان کریں، اس کمرے سے کوئی بات باہر نہیں جائے گی۔''

میں نے ہمت کی اور انہیں شروع سے ہر بات بتانے لگی، اپنی شادی، اپنا رہن سہن، سلمان اور انکل وقار کی عادتیں اور وہ بھیانک حادثہ سب کچھ بتادیا، وہ سر جھکائے سنتے رہے۔ میری بات ختم ہوگئی تو بھی کتنی دیر خاموش رہے۔ پھر پانی کا گلاس میری طرف بڑھایا اور بولے

''بیٹی پانی پی لو۔'' میں پانی پی کر ذرا ریلکس ہو کر بیٹھ گئی۔ دل کا بوجھ ہلکا ہونے سے میرا جسم بھی ہلکا پھلکا ہوگیا تھا پھر وہ کہنے لگے

''بیٹی! جو کچھ بھی ہوا اس میں قصور آپ کا زیادہ ہے۔''

''جی!'' میں نے چونک کر انہیں دیکھا'' میں تو انہیں اپنے والد کی جگہ سمجھتی تھی اور شوہر کا باپ ہونے کے ناتے ان کا احترام کرتی تھی۔''

''یہی تو آپ کی غلطی ہے، بیٹی ہمارا دین ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں جہاں ہر چیز کی حد مقرر کی گئی ہے وہاں ہر رشتے کی بھی حد مقرر ہے۔ سسر' دیور اور جیٹھ وغیرہ بھی نامحرموں میں آتے ہیں بلکہ دیور کو تو بھائی کی موت کہا گیا ہے، آپ کا قصور یہ ہے کہ آپ اس گھر میں بہو بن کر گئی تھیں' ظاہر ہے آپ کی ساس نہیں تھیں، اور آپ کو ہی اپنے سسر کی ضروریات کا خیال رکھنا تھا، مگر اس چکر میں آپ ان اخلاقیات اور حدود کو بھول گئیں جو ہمارے دین نے مقرر کی ہیں۔ آپ بغیر دوپٹے کے ان کے سامنے پھرتی تھیں، ان کے ساتھ بیٹھ کر فلمیں دیکھتی تھیں،

ہنسی مذاق بھی کر لیتی تھیں، بلا دھڑک ان کے کمرے میں چلی جاتی تھیں، میں یہ نہیں کہتا کہ آپ میں کوئی خرابی تھی، آپ تو ایک بیٹی کا فرض نبھا رہی تھیں مگر شیطان ہر لمحہ انسان کی تاک میں رہتا ہے کہ کب اسے بہکا دے' اگر اس دن آپ اپنا کمرا بند کر کے تیار ہو رہی ہوتیں تو آپ کے سسر کبھی بھی کمرے میں بلا اجازت نہ آسکتے تھے۔ آپ نے خود شیطان کو موقع دیا اور پھر جب ان کی نیت کھل گئی تھی تو ضروری تھا کہ آپ اپنی والدہ کو اعتماد میں لے لیتیں مگر آپ خود ہی اندر اندر گھٹتی رہیں اور آپ کی خاموشی نے انہیں حوصلہ دے دیا۔ اگر آپ سختی سے انہیں یہ باور کرا دیتیں کہ آپ ان کی حرکات اپنے گھر والوں کو یا سلمان کو بتا دیں گی تو شاید وہ ڈر جاتے مگر تقدیر کا لکھا ہو کر ہی رہتا ہے۔ ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔"

"بیٹی ہم نے ماڈرن بننے کے چکر میں اپنی روایات کو بھلا دیا ہے، اپنی حدوں سے تجاوز کر لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں اس قدر بے حیائی پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کی والدہ کو یہ ضرور آپ کو سمجھانا چاہیے تھا کہ آپ نے سسر کے ساتھ اکیلے گھر میں کس طرح رہنا ہے، آپ کو چادر لے کر سسر کے سامنے آنا چاہیے تھا۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھتیں مگر ایک فاصلے پر رہ کے۔ اس طرح وہ بھی آپ کا مزاج سمجھ جاتے اور گریز کرتے۔ آپ نے خود انہیں بے باکی کا موقع فراہم کیا"......

میں نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا، واقعی وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ مجھے فاصلہ رکھنا چاہیے تھا۔

"بیٹی! اب آپ اپنے دل سے احساسِ جرم نکال دو، قرآن پڑھ کر ان کی مغفرت کی دعا کیا کرو، اب اپنے شوہر کو یہ سب بتا کر آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جس بات کا پردہ اللہ نے رکھا ہوا ہے آپ کو حق

قطعہ

شیریں لغاری

زندگی ہے کتاب کی صورت
اور تم پہلے باب کی صورت
زندگی اک بہار کی صورت
اور تم کھلے گلاب کی صورت

☆☆☆

نہیں پہنچتا کہ اسے افشا کرو۔ خدا سے اپنی لغزش کی معافی مانگو اور اپنے آپ کو اسلامی طریقے پر ڈھال لو، آپ کی آنے والی نسل بھی سنور جائے گی کیونکہ ایک ماں پوری نسل کو سنوار یا بگاڑ سکتی ہے۔ آپ نے اپنے سسر کو نہیں مارا، وہ خدا کی رضا سے اس حادثے کا شکار ہوئے ہیں اور خدا نے ان کا بھی ان کے بیٹے اور دنیا والوں کے سامنے پردہ رکھ لیا ہے اور جب خدا نے ان کا اور آپ کا پردہ رکھا ہے تو اسی میں بہتری ہے کہ خاموش رہو، خدا سے معافی مانگو اور ان کی بخشش کی دعا کرو۔"

اس دن میں ان بزرگ سے مل کر واپس آئی تو میری زندگی بدل چکی تھی۔ میں نے خدا سے معافی مانگی، اپنے آپ کو چادر میں رکھنے کی عادت ڈال لی۔ پردہ کرنے لگی اور جب خدا نے مجھے بیٹی دی تو میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی بیٹی کو بھی اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنا سکھاؤں گی......

اس لیے کہ عورت کا تو مطلب ہی پردہ ہے، اور مرد کے لیے بھی حکم ہے کہ نگاہیں نیچی رکھا کریں، مرد اور عورت دونوں اپنے آپ کو اسلامی طریقوں پر ڈھالیں گے تو آئندہ نسل نیک اور پرہیز گار ہوگی۔

☆☆☆

اس ماہ کی خصوصی کہانیاں

تیسری کہانی

دشمنِ جاں

نگین افضل وڑائچ

ایک مدرسے میں جنم لینے والی محبت کی روداد خاص



''مہر بنت ذیشان کی تمام روداد سننے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جاوید شاہ ولد رحیم علی شاہ کو مہر بنت ذیشان کی زندگی برباد کرنے کی پاداش میں ان سے نکاح کرنا ہوگا۔''

شاہ بابا کی پاٹ دار آواز کمرے میں گونجی تھی۔ یہ مہر بنت ذیشان کی پہلی فتح کا آغاز تھا جبکہ جاوید علی شاہ اپنی تمام تر وجاہت اور حیثیت کے باوجود ہارے ہوئے جواری کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا، مہر بنت ذیشان نے جاوید شاہ کا تکبر او رغرور خاک میں ملا دیا تھا۔ اس وقت سوچوں اور بری یادوں کا ایک طوفان سا اس کی آنکھوں میں امڈ آیا تھا۔

☆☆☆

آج شاہ بابا علالت کے باعث نہیں آئے تھے۔ تمام لڑکیاں ان کے گھر سے ملحقہ اس اقامتی مدرسے میں پوری دلجمعی سے پڑھنے میں مصروف تھیں۔ شاہ بابا کا کنبہ انتہائی چھوٹا تھا۔ شاہ بابا کی زوجہ وفات پا چکی تھی' ایک ہی بیٹا جاوید علی شاہ تھا جو انگلینڈ سے ہائر ایجوکیشن حاصل کر چکا تھا۔ شاہ بابا کے پاس زمینوں اور بینک بیلنس کی فراوانی تھی مگر مدرسہ ان کا خواب تھا۔ آج کل جاوید علی شاہ پاکستان آیا ہوا تھا' اس لیے اگر کبھی شاہ بابا مدرسے نہ جا سکتے تو وہ وقتی طور پر مدرسے کا انتظام دیکھتا تھا۔ اس مدرسے میں جدید علوم کے ساتھ قرآن پاک کی تفسیر ترجمہ اور اس کے علاوہ حفظ بھی کروایا جاتا تھا۔ یہ مدرسہ ان کے آباء واجداد نے شروع کیا تھا' اس کی تمام طلبا وطالبات شاہ بابا کو بہت عزیز تھیں۔ مہر بنت ذیشان بھی انہی طلبا میں سے ایک تھی، اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا وہ اپنے چچا کے رحم وکرم پر تھی' شاہ بابا کی اس پر خاص عنایت تھی' اس لیے اسے اس مدرسے میں بالکل مفت تعلیم اور وظیفہ بھی دیا جاتا تھا' مدرسے میں داخلے کی آج آخری تاریخ تھی، شاہ بابا بیمار پڑ گئے جس کی وجہ سے جاوید علی شاہ کو ان کی جگہ آ کر فرائض انجام دینا پڑے وہ پوری تندہی سے کام کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ لڑکیوں کی اپنے اوپر کی جانے والی کمنٹری بھی سن رہا تھا۔

''مولانا کے اکلوتے چشم و چراغ ہیں یہ انہیں چھوٹے مولانا کہیں یا پھر سر!'' کسی شریر سی لڑکی نے سرگوشی کی تھی۔

''شاہ بابا کے بیٹے ہیں مگر شاہ بابا تو نہیں کہ انہیں بھی شاہ بابا بولیں۔''

یہ مہر بنت ذیشان کی آواز تھی' آواز میں کچھ ایسا تھا کہ خلاف عادت جاوید علی شاہ کو نظر اٹھا کر دیکھنا پڑا، جس قدر آواز پراعتماد تھی وہ خود اتنی ہی معصوم اور خوبصورت تھی' دیکھنے والا سوچتا کہ شاید میری ہی پہلی نظر اس کے بے داغ چہرے پر پڑی ہے' شہد رنگ آنکھیں، پتلی ستواں ناک اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نرم و نازک ہونٹ گویا وہ حسن اور دلکشی کی مکمل تصویر تھی۔ جاوید علی شاہ جیسے بدیسی سوچ اور دماغ رکھنے والے بندے نے پہلی ہی نظر میں اسے اپنے لیے منتخب کر لیا تھا' وہ صرف اور صرف اس کی قربت چاہتا تھا' اس کے نزدیک محبت یہی تھی وہ پرانا کھلاڑی تھا اس کے لیے یہ محاذ شکست آمیز

ثابت نہیں ہوسکتا تھا' شاہ بابا کی شرافت اور زندگی بھر کی ریاضت اس کے لیے بہترین سہارا تھی۔

☆☆☆

مسلسل بیماری نے شاہ بابا کو نڈھال کر دیا تھا تو انہیں اپنے مدرسے کی تمام ذمے داریاں اپنے بیٹے کے سپرد کرنا پڑیں، وہ بیٹے کو بھی اپنی طرح عاجزی اور پرہیزگاری کا منہ بولتا ثبوت سمجھتے تھے' وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ مختلف حالات کی پیداوار ہے اس کی سوچیں اس ماحول میں پروان چڑھی ہیں جہاں زندگی کی خوشیاں نفسانی خواہشات کے ترازو میں تولی جاتی ہیں، بظاہر یہ اس کا رویہ بالکل ٹھیک تھا' اس نے مدرسے میں کافی اصلاحات بھی کی تھیں۔ ان دنوں دوسرے شہر میں مقابلہ قرأت اور تقریر وغیرہ کے سلسلے میں باقی طلبا کو بھی تیاری کروائی جارہی تھی' تقریر کے لیے مہر کو منتخب کیا گیا تھا، جب جاوید شاہ ہال میں داخل ہوا تو مس صائمہ طالبات کو تقریری مقابلے کی تیاری کروا رہی تھیں۔

''کس اسٹوڈنٹ کو تقریر کے لیے منتخب کیا گیا ہے؟'' اس نے مس صائمہ سے استفسار کیا تو انہوں نے مہر کا نام لیا۔

''ٹھیک ہے تقریر کی تیاری میں کرواؤں گا' آخر ہمارے ادارے کی عزت کا سوال ہے۔''

جاوید شاہ نے کمال اعتماد سے تمام کام اپنے ذمے لے لیا۔ دوسری طرف مہر ہچکچاہٹ محسوس کررہی تھی مگر ناچار اسے اسی کے پاس تیاری کرنی تھی۔

مہر نے تقریر کی پوری تیاری کرلی تھی۔ وہ ڈائس پر کھڑی جاوید شاہ کو تقریر کر کے بتا رہی تھی مگر وہ مسلسل اسے کنفیوژ کرنے کوشش کررہا تھا۔

''مہر باتوں میں تو آپ کی خوب آواز نکلتی ہے' اب کیا ہوگیا' میرے سامنے بولا نہیں جارہا۔'' وہ اسے نروس کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ جواباً وہ صرف برداشت کررہی تھی اور پھر جیسے تیسے یہ مرحلہ گزر ہی گیا مگر اب مہر کو جاوید شاہ سے شدید چڑ ہوگئی تھی، وہ وقتاً فوقتاً نہ صرف اسے گھورتا رہتا بلکہ بہانے سے آفس روم میں بھی بلالیتا۔ اس روز تو حد ہی ہوگئی جب اس نے پانی تھماتی ہوئی مہر کے ہاتھ کو مس کرنے کی کوشش کی۔ گلاس مہر کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی وہاں سے نکل گئی تھی۔

جاوید شاہ کو لگ رہا تھا کہ یہاں کسی کو بھی ورغلانا اور اپنی باوقار شخصیت سے متاثر کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر ناکام رہا تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش سے مہر کو پھانسنے کی کوشش کی تھی مگر بے سود' وہ بن ماں باپ کی بچی اپنے روحانی باپ کا مان کیسے توڑ سکتی تھی اور پھر جاوید شاہ اچانک مدرسے سے کچھ روز کے لیے غائب ہوگیا اور جب وہ کافی دنوں بعد مدرسے آیا تو بڑھی ہوئی شیو اور ملگجے کپڑوں کے ساتھ آفس روم میں جاتے ہی اس نے مہر کو بلالیا۔ مرتی کیا نہ کرتی کہ مترادف اسے جانا پڑا۔ آخر اتنے احسان تھے اس شخص کے باپ کے اس پر، کمرے میں گہری خاموشی کا بسیرا تھا۔ مہر نے کمرے کا سکوت توڑتے ہوئے اسے مخاطب کیا

"آپ نے مجھے بلایا؟"

"جی مہر بنت ذیشان مجھے آپ سے کچھ چاہیے۔" جاوید شاہ نے نظر اٹھائے بغیر کہا تھا۔ جولباً مہر نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا تو وہ دوبارہ گویا ہو۔

"شادی کرلو مجھ سے بہت چاہتا ہوں تمہیں' کانچ کی طرح رکھوں گا اور زندگی کی طرح چاہوں گا۔" وہ اور پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا مگر مہر صرف اسے بے یقینی کی کیفیت میں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔

"میں شاہ بابا سے بات کروں گا، سب کچھ ان کی مرضی سے ہوگا۔" اس نے اپنے باپ کا نام لے کر مہر کو مزید یقین دلانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

اس واقعہ کے بعد جاوید شاہ مہر کو اپنی بے لوث محبت کا یقین دلانے میں کامیاب تو ہوگیا مگر اب مہر کے لیے پریشانی کی بات یہ ہوگئی تھی کہ وہ اکثر اس کے بہت زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتا۔ ایسے میں وہ اسے یہ کہہ کر لاجواب کردیتی تھی

"شادی ہوجانے دیں تاکہ میں شرعی طور پر آپ کے ساتھ منسوب ہوجاؤں۔ میں شریعت کے اصول جو آپ کے گھرانے نے مجھے سکھائے توڑ کر اپنی محبت بے مول نہیں کرنا چاہتی۔"

"اس کا مطلب تم مجھے غیر سمجھتی ہو؟" جولباً جاوید شاہ گھمبیر لہجے میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتا تو وہ بلک اٹھتی۔

"نہیں! میں نے دنیا میں موجود تمام رشتوں سے بڑھ کر آپ کے والد صاحب کو شفیق پایا ہے۔ آپ ان کے فرزند ہیں وہ میرے مرشد ہیں' اسی نسبت سے آپ بھی میرے مرشد ہیں' میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ ہماری محبت بھی پاکیزہ ہو۔"

اور پھر ایک دن جاوید شاہ نے مہر کو پیغام بھجوایا کہ مدرسے کے تہہ خانے میں شاہ بابا تمہارے منتظر ہیں وہ تم سے کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہیں۔ تہہ خانے کی طرف بڑھتے ہوئے مہر کے قدم اسے بربادی کی طرف لے جارہے تھے مگر وہ بے خبر تھی...... واپسی پر وہ تہہ داماں لوٹی، چند لمحوں میں اس سنگدل نے صرف اور صرف شیطان کے کہنے پر اسے بے مول اور بے سرو سامان کردیا تھا۔ وہ مدرسے کی چھت پر جاکر خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی یہاں تک کہ اس نے خودکشی بھی کرنی چاہی مگر ایسا ہو نہ سکا کہ قسمت نے اسے مزید رنگ دکھانا چاہتی تھی' وہ ایک ہی دن میں ٹوٹ کر رہ گئی تھی بکھرے ہوئے بال، سوگوار آنکھیں، اس کے خنداں چہرے پر اب صرف تاسف اور ملال دیکھنے کو باقی تھا۔ تمام کاروبار زندگی معمول کے مطابق چل رہے تھے......

☆☆☆

اگلی صبح تہجد کی نماز ادا کرنے کے بعد مہر نے اپنا سفری بیگ تیار کیا' سیاہ چادر اس طرح اوڑھی کہ کوئی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے' اس کا ارادہ ہر صورت شاہ بابا تک پہنچنے کا تھا۔ اسے اس بات

کا اچھی طرح علم تھا کہ شاہ بابا ان دنوں آرام کی غرض سے اپنی زمینوں پر گئے ہوئے ہیں سو اب اس کا سفر اسی جانب تھا۔

دروازے کی بیل پر ملازم نے دروازہ کھولا تھا۔ ''جی بی بی کس سے ملنا ہے؟''

''مجھے شاہ بابا سے ملنا ہے۔'' مہر نے چہرہ چھپائے ہوئے یہی کہا تھا۔

''اندر آجایئے بی بی۔'' سامنے ہی شاہ بابا ایزی چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا مگر پہچان نہ پائے قدرے جھجکتے ہوئے بولے ''کون ہو؟''

''آپ کے بیٹے کی مقتولہ۔'' مہر نے چہرے سے چادر ہٹاتے ہوئے ٹوٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا' وہ ان کے قدموں میں گر سی گئی۔

''شاہ بابا میں آپ کی سرپرستی میں آپ کے بیٹے کے ہاتھوں برباد ہوگئی۔'' وہ زاروقطار رو رہی تھی ''مجھے انصاف چاہیے' شاہ بابا، اگر میری میت پر آپ مدعی نہ بنے تو میں خدا پر معاملہ چھوڑ دوں گی۔'' وہ شاہ بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے سوال کر رہی تھی۔

شاہ بابا نے معاملے کی سنگینی کو سمجھتے ہوئے نہ صرف اسے پناہ دی بلکہ آگے کی منصوبہ بندی بھی کر ڈالی تھی۔ تمام معاملات مکمل راز داری سے سرانجام دیئے گئے اس کیس میں شاہ بابا مہر کے وکیل ہی نہیں بنے تھے بلکہ وہ اپنے بیٹے کے خلاف جج بھی بن گئے تھے جس کا فیصلہ تھا کہ...... جاوید علی شاہ کو مہر بنتِ شاہ سے شادی کرنا ہوگی۔

☆☆☆

مہر بابا کے ساتھ ان کے آبائی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ انہوں نے نوکر سے کہہ کر اسے جاوید شاہ کے کمرے میں شفٹ کروادیا تھا۔ مہر نے اپنے کپڑے الماری میں سیٹ کیے تھے اور خود بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں کہ دروازے کی زوردار آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوگئی' جاوید شاہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور سختی سے اس کی کلائی کو جکڑ لیا۔

''تم کیا سمجھتی ہو مجھ سے شادی کر لی ہے تو اب تم عزت بھی پالو گی۔ ہر روز تمہاری تذلیل کروں گا اور پھر دیکھوں گا کس طرح پھڑ پھڑاؤ گی۔''

''دور ہٹو مجھ سے، گھن آتی ہے مجھے تم سے' تمہاری باتوں سے اور خبردار جو میرے قریب آنے کی کوشش بھی کی۔'' مہر نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی تھی' اس کے اس قدر شدید ردعمل پر جاوید شاہ حیران تھا۔

''تذلیل کی بات کر رہے ہو نا تم۔ بھول گئے جو تمہاری تذلیل میرے ہاتھوں ہونے والی تھی، احسان مانو اپنے باپ کا کہ اس وقت یہاں کھڑے ہو ورنہ اپنی نام نہاد غیرت کا جنازہ اٹھا رہے ہوتے۔'' مہر حلق کے بل چیخ رہی تھی اور جاوید شاہ بت بنا سن رہا تھا، وہ یہ سب کہنے کے بعد باتھ روم میں بند ہوگئی تھی۔

☆☆☆

زندگی روز بروز اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی ایک دوسرے سے بات کرنا تو درکنار وہ ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گوارانہ کرتے تھے، شاہ بابا کو اس بارے میں کسی حد تک اندازہ تھا مگر وہ چاہتے تھے کہ وہ خود ہی اپنے معاملات سلجھالیں۔ رات دیر سے گھر آنا اور دن بھر غائب رہنا جاوید شاہ کا معمول تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو مہر بیڈ پر سو چکی تھی ، اس نے جان بوجھ کے چینی کا خوبصورت گلدان دیوار پر دے مارا ۔ اس اچانک آواز سے مہر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''اٹھو یہاں سے یہ میرا کمرہ ہے تمہارے باپ کا نہیں جو یہاں استحقاق سے پڑی ہو۔ تمہیں صرف اور صرف شاہ بابا کے گھر میں پناہ ملی ہے میرے کمرے اور میرے دل تک تمہاری رسائی ناممکن ہے۔''

''کمرے کی بات ہے تو وہ تم بدلو گے میں نہیں، اور ہاں تمہارے دل تک رسائی چاہیے کس کافر کو، یہ تو بالکل خالی ہے صرف اور صرف سائیں سائیں کی آوازیں ہیں غور سے سنو۔ انہیں اپنے لیے بچا کر رکھو یہ آوازیں تمہارا پیچھا کریں گی۔'' مہر اس کے روبرو کھڑی اس کے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''تنہائی تو تمہارے حصے میں آئے گی مہر بنت ذیشان کبھی نہ ختم ہونے والی تنہائی اور میری انا کو ہٹ کرنے کی کوشش بھی کی ناں تو کمرے سے نہیں اس گھر سے بھی نکال دی جاؤ گی۔''

جاوید شاہ نے اسے باہر دھکیلتے ہوئے دروازہ لاک کرلیا تھا۔ وہ بے دم سی ہوکر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔

مہر اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر چکی تھی۔ شاہ بابا اس کا بہت خیال رکھتے' اگر کبھی وہ جاوید شاہ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتے تو وہ منع کر دیتی' اس نے اپنی زندگی کا مدار خود کو اور شاہ بابا کو بنالیا تھا۔ اب وہ دوبارہ مدرسے جانے لگی تھی۔ ٹوٹے سلسلے کو دوبارہ بحال کیا تو منجمد زندگی میں تھوڑی ہلچل آئی۔ انہی دنوں جاوید شاہ نے دوسری شادی کرلی اور اپنی بیوی کو گھر لے آیا۔ شاہ بابا بیٹے سے سخت خفا تھے مگر مہر کے سمجھانے پر خاموشی اختیار کی۔ جاوید شاہ کی بیوی ارم مہر سے زیادہ خوبصورت تو نہ تھی مگر پہننے اوڑھنے کے ڈھنگ اور لچھے دار باتوں نے جاوید شاہ کو اس کا گرویدہ کر دیا تھا، شادی کی اصل وجہ مہر کو شکست دینا تھی۔

ان دنوں ارم امید سے تھی۔ جاوید شاہ اس کا خوب خیال رکھتا اگر کبھی مہر سے آمنا سامنا ہو جاتا تو بڑھ چڑھ کر ارم سے محبت جتاتا۔ ارم کی پریگننسی نے شاہ بابا کے اندر بیٹے کے لیے جمی محبت کو پھر سے پگھلا دیا۔ دوسری طرف مہر کو تو جیسے جاوید شاہ سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ شاہ بابا کو ناشتہ اور دوا کھلانے کے بعد وہ مدرسے چلی جاتی وہاں اب وہ درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی تھی، مدرسے میں جب بھی اسے مہر جاوید شاہ کے نام سے پکارا جاتا تو اس کے دل میں درد کی ٹیس اٹھتی۔

☆☆☆

اس روز جب وہ مدرسے میں کھلنے والے دروازے سے لان میں داخل ہوئی تو جاوید سامنے ہی چہل قدمی کر رہا تھا، آج خلاف معمول ارم اس کے ساتھ نہ تھی۔ مہر نے جلدی سے قدم آگے بڑھانے چاہے مگر اس کی آواز پر رک گئی۔

''رکو! یہ کچھ پیسے ہیں رکھ لو، شاپنگ کر لینا۔'' جاوید نے سپاٹ لہجے میں اسے کچھ رقم تھماتے ہوئے کہا تھا جواب میں کچھ نہیں بولی تھی، مگر اس کی کالی چمکدار آنکھوں کے کٹورے پانی سے بھر گئے تھے۔ اس نے جلدی سے اپنے خوبصورت ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑیں اور گویا ہوئی:

''فکر نہ کرو جاوید شاہ میں نے تمہارے سارے فرائض اور اپنے حقوق تمہیں معاف کر دیے ہیں۔ میں قیامت کے روز کوئی گلہ نہیں کروں گی۔'' وہ جو پہلے ہی کہیں نہ کہیں بے موقع محل اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ جاتی تھی آج اسے اور حیران کر گئی تھی ۔ وہ اکثر اس کی باتوں اور پختہ لہجے سے حیران ہو جایا کرتا تھا پھر کچھ یاد آنے پر جاوید نے اس کے خیال کو سختی سے جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

ارم کی ڈیلیوری کے بعد گھر میں چہل پہل تھی۔ جاوید نے اپنے بیٹے کا نام ہادی رکھا تھا۔ شاہ بابا بھی اس ننھے فرشتے کی آمد پر خوش تھے۔ ہادی چھ ماہ کا ہو چکا تھا۔ ان دنوں اچانک ہی ارم اور جاوید کا آپس میں جھگڑا معمول بن گیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ جاوید چاہتا تھا کہ وہ پاکستان میں رہے مگر ارم اسے انگلینڈ جانے پر اکسار ہی تھی ۔ جاوید شاہ بابا اور کاروبار کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا ، اس روز بھی وہ دونوں اسی بات پر آپس میں لڑ رہے تھے اور ارم نے پتہ نہیں جاوید سے کیا کہا تھا کہ جاوید کا اس پر ہاتھ اٹھ گیا تھا۔ ارم برداشت کرنے والوں میں سے نہیں تھی ، وہ فوراً ہی ہادی کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ جاوید نے طیش میں آ کر اسے طلاق دے دی تھی لیکن پچھتا نہیں رہا تھا۔ پچھلے ایک سال سے وہ دونوں یونہی بے چینی کا شکار تھے انہیں شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ٹھیک انتخاب نہیں ہیں۔

☆☆☆

مہر چھت پر آئی تو ہادی کے رونے کی آواز نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ کمرے میں جانا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے رونے میں مزید شدت آ گئی تو وہ رہ نہ سکی۔ اندر ہادی بیڈ پر لیٹا رو رہا تھا، اس کے پاس کوئی نہ تھا مہر نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اپنے اندر سمو لیا۔ وہ بھوک کی وجہ سے رو رہا تھا، فیڈر دینے کے بعد وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اسے سلا دیا' اس کے اوپر کمبل ٹھیک کرتے ہوئے وہ کمرے سے نکلنے ہی والی تھی کہ اندر داخل ہوتے جاوید سے بری طرح ٹکرا گئی۔ وہ جلدی سے سنبھل کر وہاں سے نکل گئی۔ کمرے میں بیڈ پر سوتے ہادی کو دیکھ کر جاوید کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مہر تمام تر ناراضگی اور تلخی کے باوجود، اپنی پیاری صورت کی طرح خوبصورت دل بھی رکھتی ہے۔

ارم نے ایک دفعہ بھی مڑ کر ہادی کی خبر نہ لی۔ جاوید کو بھی خاص اس کی پروا نہیں تھی، ہادی زیادہ وقت شاہ بابا کی گود میں رہتا، رات کو وہ مہر کے پاس اس کے کمرے میں ہوتا وہ اس سے مانوس ہو چکا تھا۔ مہر بھی دل و جان سے اس کا خیال رکھتی تھی۔ وہ اس سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس پیار کی وجہ شاید وہ رشتہ تھا جو ہادی کے باپ سے اس کا تھا' جاوید جب اس سے ملنے اس کے کمرے میں آتا تو وہ خاموشی سے باہر چلی جاتی۔ کوئی تاثر، کوئی جذبات اس کے چہرے سے عیاں نہ ہوتے تھے۔

☆☆☆

ہادی ایک سال کا ہوگیا تھا۔ وہ مہر کے سنگ لان میں ننھے ننھے قدم اٹھاتا جو شاہ بابا کو بہت اچھا لگتا۔ کھڑکی میں کھڑا جاوید بھی ان لمحات کے نا تھمنے کی دعا کرتا، ہادی مہر کو ماما، ماما کہتا۔ مہر کے پیچھے بھاگتا تو وہ نہال ہو جاتی۔ شاہ بابا اب قدرے مطمئن تھے کہ ہادی یقیناً ان دونوں کے درمیان دوریوں کی خلیج کم کر دے گا لیکن مہر ان سب کے برعکس اپنی زندگی کو یونہی گزار دینا چاہتی تھی کیونکہ وہ جاوید کو معاف کر کے اسے اپنا دل توڑنے کا موقع پھر نہیں دینا چاہتی تھی۔

اس شام مہر ہادی کے لیے دودھ بوائل کرنے کچن میں گئی تو جاوید کھڑا چائے بنا رہا تھا۔ نوکر چھٹی پر تھا اس لیے مزاج کے خلاف اسے خود کچن میں آنا پڑا تھا۔

''ہٹیں میں چائے بنا دیتی ہوں۔'' مہر نے اس کے ہاتھ سے کیتلی لیتے ہوئے کہا تو وہ ایک طرف ہوگیا۔ چائے کپ میں ڈالنے کے بعد وہ دودھ بوائل کر رہی تھی۔

''تم ہادی کا اتنا خیال کیوں رکھتی ہو؟''

جاوید اچانک ہی اس سے سوال کرنے لگا

''یہ کیسا بے تکا سوال ہے؟'' مہر نے ہڑ بڑا کر کہا تھا۔

''پھر بھی تم بتاؤ نا تمہیں برا نہیں لگتا جب وہ تمہیں ماما کہتا ہے۔''

''میں اتنی سنگدل نہیں ہوں کہ اپنی انا کی خاطر اس معصوم بچے کو دکھ پہنچاؤں۔'' مہر نے نارمل سا جواب دیا۔

''کیا اس معصوم بچے کے باپ کے لیے بھی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟'' جاوید نے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

''نہیں!'' وہ جواب دے کر فوراً پلٹی' مگر اپنے ہاتھ پر اس کی مضبوط گرفت کے سبب وہ جا نہ سکی۔

''چھوڑو مجھے' نہیں کر سکتی میں تمہیں معاف، جو زخم تم نے مجھے دیے ہیں وہ صرف اور صرف میری نفرت کے مرہم سے ہی مندمل ہو سکتے ہیں' جو میں تم سے اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے کرتی ہوں۔'' مہر الفاظ کی صورت میں نفرت اگل رہی تھی۔

''اگر میں کہوں کہ میری محبت میں اتنا دم ہے کہ وہ ہر زخم کو بھر دے گی تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟'' جاوید براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہا تھا' آج اس کی آنکھوں میں سچائی کی جھلملاہٹ تھی مگر مہر اس کی انہی آنکھوں میں

دکھنے والی سچائی اور محبت ہی کی توڑسی ہوئی تھی۔

''نہیں اعتبار مجھے تم پر۔ کیسے مان جاؤں میں کہ تم بدل گئے ہو؟''

مہر رو رہی تھی۔ جاوید اسے بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔

''مہر محبت تو مجھے تم سے تب بھی تھی، مگر اس وقت میں ایک عام سا انسان تھا، شیطان مجھ پر حاوی تھا، میں محبت میں آمریت پر یقین رکھتا تھا، یقین مانو تم ہر دن، ہر لمحہ خیال بن کر میرے دل میں رہی ہو، میری ضد اور انا نے مجھے تم سے دور رکھا آج میں تمام حدود اور ضوابط کو توڑ کر تمہارے پاس لوٹ آیا ہوں خدارا مجھے معاف کردو۔'' جاوید اس سے التجا کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں نے کردیا معاف، مگر محبت کا تقاضہ کرو گے تو خالی ہاتھ لوٹو گے کیونکہ وہ دم توڑ چکی ہے۔'' وہ یہ کہہ کر کچن سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

اس روز صبح ہی جاوید کسی کام کے سلسلے میں شہر چلا گیا، شاہ بابا صحن میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ مہر اور ہادی فٹ بال کے ساتھ کھینچا تانی میں مصروف تھے کہ صحن کا بڑا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا اور نوکر تقریباً بھاگتا ہوا شاہ بابا کے پاس آیا تھا:

''شاہ جی غضب ہوگیا۔ جاوید شاہ جی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے، گاؤں والی کچی سڑک پر ان کی گاڑی ٹرالی سے ٹکرا گئی ہے۔'' اس خبر نے ایک طرف تو شاہ بابا کو شدید دھچکا دیا تو دوسری طرف مہر کے لیے صور اسرافیل ثابت ہوئی، وہ بالکل بے حواس ہو کر زمین بوس ہوگئی۔ شاہ بابا مہر کو بھروسہ مند پرانی ملازمہ کے سپرد کر کے اسپتال روانہ ہوگئے ہادی کی دیکھ بھال بھی ملازمائیں کررہی تھیں۔ تقریباً دو گھنٹے بعد مہر کو ہوش آیا تو وہ زاروقطار رو رہی تھی۔

''یا اللہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے نہیں جینا مجھے۔'' وہ دیوانہ وار اپنی کلائیوں پر موجود کانچ کی چوڑیاں دیوار پر مار مار کر اپنے ہاتھ زخمی کررہی تھی۔ ملازمہ نے آکر اسے سنبھالا تھا، اس کے ہاتھ کافی زخمی ہوچکے تھے کہ اتنے میں شاہ بابا کی کال آگئی تھی۔ اللہ کے کرم سے جاوید شاہ بالکل ٹھیک ہے معمولی سی چوٹیں ہیں، مہر فوراً ہی اسپتال پہنچ گئی تھی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ جاوید شاہ بیڈ پر نیم بے ہوشی کی حالت میں لیٹا تھا۔ مہر اس کے قریب آئی تھی شاید اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ضبط کھو بیٹھی اور اس کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، وہ آنکھیں بند کیے یونہی رو رہی تھی کہ اچانک اپنے بالوں پر ہلکی سی جنبش محسوس کر کے اس نے فوراً اپنی آنکھیں کھولی تھیں

''آج ہی سارے آنسو بہا دو گی؟''

جاوید شاہ نے شرارت سے مہر کو خود میں سموتے ہوئے کہا تھا تو وہ جھینپ گئی تھی۔

انہیں ایک دوسرے کی محبت پر یقین آگیا تھا اس لیے آگے زندگی ان کے لیے خوشیوں سے بھرپور تھی۔ اور واقعی میں اب بہت بھرپور گزر رہی ہے۔ ☆☆

اس ماہ کی دکھی کہانیاں

ایسا بھی ہوتا ہے

نسیم سکینہ صدف

اس نوجوان کا قصہ حیرت جس کی جنس دیکھتے ہی دیکھتے بدل گئی



یاسر ایسا خوبرو تھا کہ یونیورسٹی کی لڑکیاں اس پر جان دیتی تھیں اور کیفے ٹیریا میں اس کے ساتھ چائے پینے کو زندگی کا پرلطف لمحہ سمجھتی تھیں۔ یاسر شرمیلا بہت تھا، وہ ان لڑکیوں میں سے بہت سوں کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرنا چاہتا تھا، لیکن ایسا نہ کر سکتا تھا۔ وہ ڈرتا بھی بہت تھا۔ یہ اس کی فطری کمزوری تھی جبکہ دیگر لوگ اسے مغرور سمجھتے تھے مگر بھلا غرور کاہے کا؟ وہ نہ تو امیر خاندان کا تھا اور نہ کسی بڑے افسر کا بیٹا' وہ بے چارہ تو متوسطے طبقے کا فرد تھا۔

یاسر ان تمام باتوں اور حالات کے قطع نظر ایک لڑکی کو بہت چاہتا تھا۔ رامین اس کی دور پرے کی رشتے دار تھی، وہ تھی بھی تو بہت خوبصورت، یاسر کو تو وہ بہت ہی پیاری لگتی تھی اور بس اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ نوکری لگتے ہی وہ رامین کا بر مانگ لے وہ خیالوں میں بھی رامین کے ساتھ بہت گھوما پھرا کرتا۔ اکثر یہ ہوتا کہ وہ دوکون آئسکریم لیتا، دوسری کس کے لیے بھلا؟ وہ ہوتا تو اکیلا تھا، ارے بھئی رامین کے لیے جو اس سے کوسوں دور سیالکوٹ میں بیٹھی تھی۔ یاسر ایک آئسکریم خود کھاتا دوسری اس کے ہاتھ میں پگھل جاتی اور کہیں نکلنے سے یاسر کو ہاتھ دھونے پڑتے اور ماں سے جھاڑ الگ کہ وہ روز زاپنی شرٹ کو گندا کر آتا تھا۔

بس ان ہی خیالوں میں کھوئے ہوئے یاسر یونیورسٹی میں پاس ہوا اور اس کے نصیب اچھے تھے جو کالج میں اسے لیکچرر شپ کی ملازمت مل گئی۔ اب وہ روز ماں سے رٹ لگائے رکھتا کہ وہ رامین کے والدین کے پاس جائیں اور ان سے بیٹی کا رشتہ مانگ لیں۔ آخر کار ایک دن ماں مان گئیں اور وہ انہیں اسی صبح تانگے پر بٹھا کر اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

اسٹیشن پہنچے تو ٹرین لیٹ تھی۔ سورج نکلنے میں ابھی کافی دیر تھی جبکہ ٹھنڈ بھی اچھی خاصی ہو رہی تھی۔ یاسر کو ڈر تھا کہ ماں کہیں اپنا ارادہ نہ بدل لے۔ وہ بھاگم بھاگ ماں کے لیے گرما گرم چائے لے آیا تھا۔ ویٹنگ روم جو خالی پڑا تھا وہاں ماں کو ایک آرام کرسی پر لٹا کر یاسر نے ماں کے گرد کمبل لپیٹ دیا تھا۔ اس کی ماں بیٹے کی حالت دیکھ کر دھیرے سے مسکرائی تھی اور اس نے بھی ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بیٹے کے لیے رشتہ لے کر ہی لوٹے گی۔ چنگا بھلا لڑکا تھا۔ ایم اے پاس۔ نوکری بھی تھی اور یاسر نے ماں کو یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ ان سے یہ ضرور کہیے گا کہ یاسر مقابلے کا امتحان ضرور پاس کرے گا۔

یاسر کی ذہانت کی بڑی دھوم تھی۔ پتہ نہیں کہ یہ دھوم کیسے ہوئی؟ ورنہ تو وہ اپنے متعلق بہتر جانتا تھا کہ خاصا بے وقوف ہے۔ بس یاسر کے جاننے والوں پر اس کا رعب سا پڑ گیا تھا۔ اور وہ بھی اپنا بھرم رکھنے کی خاطر بڑی بڑی باتیں کرتا تھا اور پھر اکیلا بیٹھ کر سوچتا کہ اس نے کہا کیا تھا۔ کچھ کتابوں کے ناموں سے وہ واقف تھا۔ کچھ لکھنے والوں کے بھی جو کہ دیگر نہ جانتے تھے، جان کیٹس (John Keats) کا نام وہ بڑی عقیدت سے لیتا' ٹھنڈا سانس بھر کر وہ بڑی ادا سے کہتا۔ کیٹس تو ایسے لگتا جیسے اس کی نظموں کا راز وہی سمجھ سکا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ کیٹس کی ایک لائن بھی اس کے پلّے نہ پڑی تھی، جھوٹا جہان تھا جس کا دور چلتا وہ کھرا اور وہ بھی ایسا ہی کھرا تھا۔ اب اگر وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کی خبر دے رہا تھا تو اس کے جاننے والوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا کہ جو یہ نہ سمجھتا کہ یاسر بس امتحان میں بیٹھے گا اور کامیابی اس کے قدم چومے گی۔ اس کا چہرہ ہی ایسا تھا کہ جیسے اس نے کائنات کے تمام رازوں کو جان لیا ہو۔

ٹرین برانچ لائن پر رکتی اور چلتی رہی اور آخر کار سیالکوٹ کا اسٹیشن آ ہی گیا۔ سیالکوٹ، اسے یہ

نام بڑا عجیب لگتا۔ اپنے ملک کے بعض دوسرے شہروں کے ناموں کی طرح دلچسپ اور مضحکہ خیز، جیسے ڈسکہ...... لیکن اب اسے وہ نام بہت بھلا لگا۔ جب یاسر کا تانگہ رامین کے گھر پر پہنچا تو اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔

کمرے میں بیٹھے یاسر کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور شربت کا گلاس تھامنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی دوران یاسر نے دیکھا کہ کوئی دروازے کی درزوں سے جھانک رہا ہے۔

''بیٹا تم نے نوکری بھی کر لی اور بتایا بھی نہیں؟'' درزوں سے جھانکنے والی کی ماں نے کہا' مگر وہ بھلا کیا جواب دیتا وہ تو شرمایا بیٹھا تھا۔ اتنے میں درزوں سے جھانکنے والی کا ابا بھی آ گیا جو ایک پولیس آفیسر تھا وہ اس سے بڑی شفقت سے ملا۔ اور ان کے مدتوں بعد آنے پر حیرت کا اظہار بھی کیا۔ گو سب ان کی آمد کا سبب جانتے تھے۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے اور شاید خدا کو بھی یہی منظور تھا۔

رامین اور یاسر کی شادی ہو گئی۔ درزوں سے جھانکنے والی کو وہ اپنے گھر لے آیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ رامین بڑی سگھڑ تھی۔ وہ اپنی قسمت پر بہت رشک کرتا اور سر دھنتا اور جب بھی سسرال والوں سے ملاقات ہوتی۔ مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا پکا ارادہ ظاہر کرتا۔ ایک دفعہ تو یاسر کی ساس نے اسے پولیس کی ٹوپی بھی پہنا دی تھی۔ اور وہ خیالوں میں افسر بنا، بڑے وقار سے بیٹھا معاشرے کی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ترکیبیں، اپنے اردگرد لوگوں کو سنانے لگا، کچھ لوگوں کو اپنے دفتر میں بیٹھے اپنی خوشامد کرتے بھی دیکھا، وہی جو اسے کمتر شخص سمجھتے بلکہ ایک کو تو اس نے دفتر کے باہر گھنٹوں کھڑے کیے رکھا کہ اپنے بیٹے کے رونے کی آواز نے اسے خواب سے جگا دیا۔

بیٹا کل سے بیمار تھا اور ابھی تک افاقہ نہیں ہوا تھا' کچھ دیر بعد وہ ایک ڈاکٹر کے گھر کے سامنے پلاٹ میں بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ حقیقت کی دنیا کتنی تلخ تھی، اور پھر آخر کار یاسر نے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا فیصلہ کر ہی لیا، کیونکہ اس کے سسر جو ترقی کر کے مزید بڑے افسر بن گئے تھے، اس سے اب الٹا ہاتھ ملانے لگے تھے' وہ اکثر یہی کہتے اور کرتے تھے کہ ہم افسر لوگ ہر ایرے غیرے سے ہاتھ نہیں ملاتے' سو اب شاید یاسر بھی ایرے غیرے کی لپیٹ میں دوسرے یا تیسرے نمبر پر پہنچ چکا تھا۔

یاسر جب مقابلے کا امتحان دینے گیا تو اس کی بیوی نے اس پر نہ جانے کیا پڑھ کر پھونک دیا تھا کہ رزلٹ آنے تک یاسر کچھ باعزت ہو گیا، لیکن رزلٹ نے اس کی عزت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ وہ امتحان میں ناکام ہو گیا تھا۔ اس دن یاسر کی سسرال میں جو باتیں ہوئیں ان کے مطابق وہ اب ایک کیڑے سے بھی کمتر تھا جو معاشی جدوجہد میں بری طرح ناکام رہا تھا۔

یاسر جب مقابلے کا امتحان دے کر واپس آیا تھا تو اس نے اپنے جسم میں کچھ عجیب و غریب تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔ اس کی آواز میں بھی نسوانیت آتی جا رہی تھی۔ جب یہ کیفیت کافی عرصہ رہی تو اسے تشویش ہوئی۔ اس نے ایک اچھے ڈاکٹر سے اپنا گلا چیک کرایا، لیکن ڈاکٹر کسی بیماری کی تشخیص نہ کر سکا اور پھر ایک رات اسے ناف کے نیچے شدید درد ہوا تو اسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ آپریشن تھیٹر میں تھا۔ بے سدھ، چند گھنٹوں بعد جب ڈاکٹر باہر نکلا اس کی بیوی نے اس سے ڈھیروں سوال کر ڈالے۔ ڈاکٹر خاموش کھڑا اس کی بیوی کو تکتا رہا۔ پھر کہنے لگا

''مجھے افسوس ہے کہ آپ کے شوہر کی جنس

......!'' بیوی کا یہ سننا تھا کہ وہ چیخنے لگی۔ ڈاکٹر نے اسے مضبوطی سے تھام اور چیختے ہوئے کہا وہ زندہ ہے لیکن اس کی جنس بدل گئی ہے، وہ اب ایک مکمل عورت ہے۔ بیوی کی چیخیں کہیں فضا میں تھم گئیں اور اسے سکتہ ہوگیا۔

اگلے دن وہ وارڈ میں کمبل میں لپٹا چپ سادھے چھت کو تک رہا تھا۔ ساتھ ہی آنسو بہاتی بیوی کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے اس سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ اس بات یا راز کا ذکر کسی سے نہ کرے۔

وہ اسپتال میں چند روز رہا اور یہ راز کسی نہ کسی طرح راز ہی رہا۔ ڈاکٹر نے اپنے پیشے کی اخلاقیات کو مدنظر رکھا تھا۔ زخموں کے بھرنے کے بعد وہ کالج جانے کی تیاری کرنے لگا' بیوی سے اس نے ایک بار پھر ڈھیروں منتیں کی کہ وہ اس راز کو ہمیشہ کے لیے اپنے سینے میں دفن کرلے۔ وہ بظاہر مرد ہی رہے گا اور ہمیشہ بیوی بچوں کا ساتھ دے گا لیکن یہ راز بھلا کیسے راز ہی رہتا' اس کی آواز میں نسوانیت آچکی تھی' جنس کی تبدیلی کے ساتھ حرکات وسکنات اور رویہ بھی بدل گیا تھا۔ جلد یا بدیر اس راز کو کھلنا ہی تھا۔ اس نے کالج سے لمبی چھٹی لے لی تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ اس کے شہر کا تبادلہ بھی اسی شہر میں ہوگیا تھا۔ ہفتہ بھر تو وہ کامیاب رہا کہ اس کی بیوی سسرال نہ جائے لیکن کب تک؟ بیوی کی ضد سے مجبور ہوکر اس نے بیوی کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا تاکہ یہ دھیان رکھے کہ کہیں اس کی بیوی یہ راز اگل نہ دے مگر ہوا یہ تھا کہ جیسے ہی وہ سسرال کے گیٹ پر پہنچے تھے اس کی بیوی کی سسکیاں بلند ہوئی تھیں اور وہ بھاگ کر ماں کے سینے سے لگ گئی تھی' بیٹی کبھی یوں روتے ہوئے نہیں آئی تھی تو پھر آج کیا ہوا تھا۔ اس کی ماں حیران و پریشان تھی۔

''اماں، اماں یہ......!'' بیوی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا اور اس کا دل چاہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور اسے نگل جائے۔

''یہ...... یہ عورت بن گئے ہیں!'' یہ سن کر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے لیکن جب بیٹی کی ہچکی بندھ گئی تھی تو سب کو تشویش ہوئی تھی۔

''ہائے!'' سب کے منہ سے یک زبان نکلا تھا، وہ بیچارہ سسر کے ساتھ سر نیچے کیے بیٹھا تھا۔ یکا یک اس کے سسر کا ایک قہقہہ بلند ہوا تھا۔ اور پھر وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگیا تھا، جیسے اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ باقی سب لوگ یوں ڈر کے مارے کمرے میں گھسے بیٹھے تھے جیسے وہاں کسی آسیب کا سایہ ہو۔ اسے کپکپی لگ گئی تھی۔ کوئی اسے کمبل دیا یا گرم چائے کا ایک کپ، لیکن کون؟

''میں تو کہتی تھی' مُوا ہمارے متھے' ہمارے لکھے نصیبوں کی طرح لگا تھا، مجھے تو یہ شروع ہی سے زہر لگتا تھا، پلے نہ پیسہ نہ ٹکا، ہم نصیبوں کا لکھا جان کر چپ ہوجاتے تھے لیکن اب یہ...... یہ'' اس کی ساس دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔

اس کی نظریں اپنی بیوی کو تلاش کرنے لگی تھیں، اور جب اس پر نظر پڑی تھی تو اتنا بیگانہ چہرہ، اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دراصل اسے بیگانہ ہونے کے معنی آج اپنی بیوی کا چہرہ دیکھ کر معلوم ہوئے تھے۔

اس نے کانپتے ہوئے کہا تھا ''میں گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''نہیں، چاہتی ہوں بولو۔'' یہ کہہ کر اس کے سسر پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا تھا' تو وہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا' چھوٹا بیٹا اس کے پیچھے ابا، ابا کہتے بھاگ پڑا تھا۔ دوسرے دو بیٹے سہمے دروازے سے لگے کھڑے تھے، اس کے چہرے پہ حسرت اور یاس

جیسے جم سے گئے ہوں' وہ اکیلا گھر سے نکلنے لگا تو ساس پیچھے سے چیخی تھی ''اکیلی کہاں جاتی ہو؟ کامی جاؤ اسے چھوڑ آؤ' کہیں راستے میں کوئی گل نہ کھلا بیٹھے۔''

اس کی ساس ہمیشہ خوفزدہ رہتی تھی کہ کہیں کوئی گل نہ کھلا بیٹھے۔ وہ معاشرے میں پھیلتی بے حیائی پر بہت کڑھتی تھی۔

کامی حیران پریشان گاڑی چلاتا اسے گھر تک چھوڑ گیا تھا' راستے میں ان کے درمیان کوئی گفتگو نہ ہوئی تھی، گھر آتے ہی وہ چیخ چیخ کر رونے لگا تھا، لیکن کب تک؟ تقریباً دو گھنٹے کے بعد گھنٹی بجنے پر اس نے دروازہ کھولا تو بیوی کو کھڑا پایا۔ وہ بغیر بات کیے اندر چلی آئی اور اندر آ کر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ وہ سامان سمیٹتی جاتی اور روتی جاتی، جب وہ اپنا سارا سامان سمیٹ چکی تو اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ وہ کچھ نہ بولا اور خاموش سر نیچے کیے بیٹھا رہا۔

''میں جا رہی ہوں ہمیشہ کے لیے۔'' وہ خاموش رہا۔ پھر بیوی اور اس کا بھائی باری باری سامان گاڑی میں رکھنے لگے۔ سامان رکھ چکے تو وہ ایک مرتبہ پھر اسے وہی فقرہ دوبارہ سنانے کے لیے آئی۔ اس نے سن لیا اور کچھ نہ بولا ''اب ہم اکٹھے نہیں رہ سکتے، گناہ ہوگا...... تمہارا میرا اب کوئی رشتہ نہیں رہا۔

''ویسے مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔'' اب وہ بھلا بیوی کے اس آخری جملے کے جواب میں اور کیا کہتا؟

جب اس کی بیوی اور اس کا بھائی چلے گئے تو اس نے حسب معمول دروازہ بند کیا اور بستر پہ لیٹ گیا...... دو تین روز کے بعد جب گھر کا دروازہ توڑا گیا تو وہ مردہ پڑا تھا اور سرہانے ایک چٹ رکھی تھی

''میں جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے!''

غزل

ظفر محمد خان ظفر

زیست سے یکبارگی بیگانہ ہو جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے افسانہ ہو جاتے ہیں لوگ

کوہِ غم پر بھی کبھی کرتے ہیں باتیں ہوش کی
جُنبشِ غم سے کبھی دیوانہ ہو جاتے ہیں لوگ

دولتِ دنیا کبھی جچتی نہیں آنکھوں میں اور
پُرسشِ غم سے کبھی پَروانہ ہو جاتے ہیں لوگ

اپنا مطلب ہو تو دنیا کو بنا لیتے ہیں دوست
ورنہ ہمسایوں سے بھی بیگانہ ہو جاتے ہیں لوگ

خون کا رشتہ بھی خاطر میں نہیں لاتے کبھی
اور کبھی اغیار کے پروانہ ہو جاتے ہیں لوگ

فکر و دانش کے دریچے بند کر کے یک بیک
ارضِ تابندہ پہ ظلمت خانہ ہو جاتے ہیں لوگ

توڑ کر پیماں وفا کے اپنے پیاروں سے ظفر
اک ذرا سی بات پر بیگانہ ہو جاتے ہیں لوگ

☆

اس ماہ کی دکھی کہانیاں

دوسری کہانی

دُکھوں کے سائے

سنبل ناہید

جب دکھ ہی مقدر رہوں تو ان سے فرار ممکن نہیں



پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماءے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

دنیا میں ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کے غم زیادہ ہیں اس نے ہر کسی سے زیادہ دکھ جھیلے ہیں لیکن اس کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کے دکھ کتنے زیادہ ہیں۔ اس دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے کبھی خوشی دیکھی ہی نہیں ہے، ان کو یہ تک پتہ نہیں ہوتا کہ اصل میں خوشی ہے کیا چیز؟ ایسی ہی ایک دکھی عورت کی سچی کہانی میں آپ لوگوں کو سنانا چاہتی ہوں، جس کو پڑھ کر شاید آپ کو لگے کہ آپ کے دکھ اوروں کے دکھ سے کم ہیں اور میری طرح آپ بھی اللہ کا شکر ادا کریں۔

☆☆☆

''امی...... امّی بہت بھوک لگی ہے۔'' رانی نے اسکول سے آتے ہی سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا مگر اس وقت گھر میں صرف خاموشی کا راج تھا، جواب میں امی کی آواز نہیں آئی تھی۔

رانی، صرف نام کی رانی نہیں تھی، وہ سچ مچ میں امی، ابو کی رانی تھی، وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی، اس کی پیدائش کے بعد ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی، اس لیے ان کا سارا لاڈ پیار رانی کے حصے میں آیا اور وہ سچ مچ کی رانی بن گئی تھی۔

رانی کے اسکول سے آنے سے پہلے ہی اس کی امی کھانا تیار رکھتی تھیں وہ اس کے کپڑے بدلواتیں، منہ ہاتھ دھلاتیں اور پھر بڑے لاڈ پیار سے اس کے منہ میں نوالے دیتیں، جب رانی اسکول سے آتی تو وہ گھر کے دروازے پر ہی اس کی منتظر ہوتیں مگر آج ایسا نہیں ہوا تھا۔

رانی بھاگ کر امی کے کمرے میں گئی تو وہ بیڈ پر سو رہی تھیں، رانی بھاگتی ہوئی امی کے پاس گئی اور ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی ''امی آپ کو کیا ہوا ہے؟'' پر یہ کیا، امّی کا ماتھا تو بہت زیادہ گرم تھا، اتنا کہ اس کا چھوٹا سا ہاتھ جل سا گیا تھا، رانی نے اپنا ہاتھ ایک دم پیچھے کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ امی کی یہ حالت دیکھ کر وہ رو پڑی تھی اور ساتھ ہی سوچ رہی تھی کہ آخر وہ کس کو مدد کے لیے بلائے۔ اس کے ابو کے آنے میں بھی ابھی بہت وقت باقی تھا۔ وہ کسی کمپنی میں ملازم تھے، صبح سویرے جاتے اور شام کو واپس لوٹتے۔

''پانی...... پانی'' کی آوازیں سنتے ہی رانی سوچوں سے باہر آئی تھی، اس کی امی پانی مانگ رہی تھیں۔ رانی بھاگ کر کچن میں گئی اور پانی لے آئی۔

''رانی بیٹا! دراز میں بخار کی گولیاں پڑی ہیں اس میں سے مجھے دو گولیاں دے دو اور بیٹا تم فکر مت کرو میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گی۔ بس تھوڑا سا بخار ہی تو ہے۔'' وہ بمشکل بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی تھیں اور گولیاں کھا کر پھر لیٹ گئی تھیں۔

رانی، امی کا سر اپنی چھوٹی سی گود میں رکھ کر دبانے لگی تھی، ابھی ذرا دیر ہی گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی، رانی نے بھاگ کر دروازہ کھولا، اور دروازہ کھولتے ہی اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، کیونکہ دروازے پر اس کے ابو موجود تھے جو کہ خلاف معمول آج جلدی گھر آ گئے تھے۔

''رانی بیٹا تمہاری امی کہاں ہیں؟'' انہوں نے آتے ہی سوال کیا تھا۔

''ابو، امی کی طبیعت خراب ہے، شکر ہے آج آپ جلدی آ گئے۔''

''ہاں بیٹا آج شہر میں ہڑتال ہے۔ اس لیے ہم نے جلدی چھٹی کر لی، تمہاری امی کو کیا ہوا ہے؟'' ابو نے پوچھا۔

''ابو آپ خود دیکھیں امی کو بہت سخت بخار ہو رہا ہے۔''

رانی کے ابو اپنی بیوی کو فوراً ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے کچھ انجکشن اور دواؤں کے بعد ان کا بخار کچھ اتر گیا تھا' پر وہ پوری طرح ٹھیک نہیں تھیں' شام تک وہ انہیں واپس لے آئے تھے۔

رانی اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان تھی' وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتی تھی' اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے امی کو ٹھیک کرے وہ ماں کے سرہانے بیٹھ کر رو رہی تھی تو ماں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا ''میری بیٹی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اور بیٹی کو گلے لگا کر سلا دیا تھا۔

آدھی رات کو رانی کی آنکھ کھلی تھی تو اس کی امی بہت تکلیف میں تھیں' وہ شدید بخار میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں' رانی نے جب ماں کی یہ حالت دیکھی تو جلدی سے ابو کو جگایا تھا۔ اس کے ابو بھی بیوی کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوئے تھے اور جلدی سے کسی ڈاکٹر کو بلاتے چلے گئے تھے لیکن آدھی رات کو انہیں کوئی ڈاکٹر نہیں ملا تھا۔ وہ گھر واپس آئے تو رانی بہت رو رہی تھی' اور پھر روتے روتے اسے یاد آیا کہ جب وہ بیمار ہوئی تھی اور اسے بہت تیز بخار تھا تو امی نے اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھی تھیں' رانی بھاگ کے کچن سے برتن میں پانی لے آئی تھی اور امی کے ماتھے پہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پٹیاں رکھنے لگی' وہ کئی گھنٹوں تک اپنی امی کی خدمت کرتی رہی اور پھر تھوڑی دیر کے لیے امی کے پاس لیٹ گئی' پھر پتہ نہیں کب اس کی آنکھ لگی تھی۔

رانی کی جب آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی' اس نے جلدی سے امی کو دیکھا۔ وہ آرام سے سو رہی تھیں' پھر امی کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ بالکل یخ ٹھنڈی تھا۔ رانی کو خوشی ہوئی کہ امی کا بخار اتر چکا ہے لیکن اس معصوم کو یہ پتہ نہیں تھا کہ جب روح جسم کا ساتھ چھوڑ دے تو جسم ایسے ہی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

جب رانی پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ اس کی امی اسے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی ہیں تو اس پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس نے چیخ چیخ کر اور رو رو کے برا حال کر لیا تھا۔ وہ بار بار ابو کے گلے لگتی اور رو رو کر کہتی ''ابو امی کو اٹھائیں' امی کو بلائیں' امی سے کہیں میں ان کے بغیر کیسے رہوں گی؟'' اس بچی کی یہ حالت دیکھ کر وہاں موجود سارے لوگ ہی رو پڑے تھے۔ پر یہی اس کی قسمت تھی' اب اسے ماں کے بنا ہی رہنا تھا۔

وقت تو گزرتا ہی رہتا ہے۔ اور رانی کے لیے بھی بس وقت گزر ہی رہا تھا' اس کے ابو اسے بہت پیار کرتے تھے' پر امی کے جانے سے جو خلا اس کی زندگی میں آیا تھا' وہ کوئی بھی نہیں بھر سکتا تھا۔

رانی کی ماں کی وفات کے چھ مہینے بعد ہی رانی کے ابو نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا کیونکہ رشتے داروں سمیت سب نے یہی کہا کہ 'اکیلی بچی کے ساتھ پوری زندگی گزارنا مشکل ہے'' اور انہوں نے خود بھی یہ سوچا کہ رانی کا خیال رکھنے والا کوئی تو گھر پر ہونا چاہیے۔

جلد ہی رانی کی نئی امی گھر آ گئی تھیں، پر رانی انہیں اپنی امی کی جگہ کبھی نہیں دے سکتی تھی' وہ ماں کی وفات کے بعد بہت گم سم سی رہنے لگی تھی' کسی سے زیادہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔

نئی امی کے آنے کے بعد' ابو کا رویہ آہستہ آہستہ بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ بات بات پر رانی کو ڈانٹتے تھے اور اسے زیادہ وقت بھی نہیں دیتے تھے' رانی بھی اب نو سال کی تھی' وہ سب سمجھتی تھی کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے' اس کی وجہ سوتیلی ماں ہے جسے رانی ذرا بھی اچھی نہیں لگتی تھی' وہ چاہتی تھی کہ اس گھر اور شوہر کی وہ اکیلی مالک ہو' اور کوئی اس کے ساتھ شریک نہ ہو' اس لیے وہ رانی کو اس کے ابو سے دور

رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے گھر کا سارا کام کراتی 'رانی اسکول بھی جاتی تھی اور گھر کے کام بھی کرتی تھی اب رانی، رانی نہیں رہی تھی' وہ تو بس اس گھر میں نوکرانی بن کے رہ گئی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں کا بس چلتا تو اسے اسکول سے بھی اٹھوالیتی' اس نے تو ایک بار باتوں باتوں میں رانی کے ابو سے اس بات کا ذکر بھی کیا تھا پر اس کے ابو نے صاف کہہ دیا تھا کہ رانی اسکول ضرور جائے گی کیونکہ یہ اس کی مرحومہ ماں کی خواہش تھی اس لیے وہ پھر اس معاملے میں چپ ہی رہی تھی۔

وقت کے ساتھ رانی نے ان حالات میں ہی میٹرک کرلیا' اب اس کا آگے دل کر رہا تھا کہ کالج میں ایڈمیشن لے لیکن اس بار اس کی سوتیلی ماں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی تھی اور رانی کے ابو نے اسے کالج میں ایڈمیشن یہ کہہ کر نہیں لینے دیا کہ ''گھر کے کام وام سیکھو' پھر ہم تمہارا کسی اچھی جگہ رشتہ طے کردیں گے' بس تمہارے لیے اتنی پڑھائی کافی ہے۔''

وقت مزید گزرا اور اس عرصے میں رانی کے دو بہن بھائی اور بھی آگئے تھے اس لیے اب اس کے ابو کا سارا پیار اور توجہ ان دونوں کی طرف تھی۔

رانی کو بھی اپنے بھائی بہن بہت اچھے لگتے تھے اور وہ انہیں پیار کرنا چاہتی تھی' پر ان کی ماں نے کبھی انہیں رانی کے قریب جانے ہی نہیں دیا تھا اس لیے رانی بھی ان سے دور ہی رہتی تھی۔

ایک دن رانی کے گھر کچھ لوگ آئے تھے اور اسے ان کے سامنے بٹھا دیا گیا تھا' رانی کو کچھ سمجھ نہیں آئی کہ معاملہ کیا ہے؟ وہ تو ان لوگوں کے جانے کے بعد رانی کی سوتیلی ماں نے اسے بتایا تھا کہ اس کا رشتہ پکا کردیا گیا ہے۔ رانی یہ سن کر نہ تو خوش ہوئی اور نہ ہی خفا' پر اس نے یہ ضرور سوچا کہ ''میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ مجھ سے پوچھے بغیر کیا گیا' رانی اپنے سسرال والوں والوں اور منگیتر کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی' کیونکہ اسے اب کسی سے اچھے کی امید نہیں تھی اور نہ ہی کسی پر بھروسہ تھا۔

چند مہینوں بعد ہی رانی کی شادی ہوگئی اور وہ پیا گھر سدھار گئی۔ رانی رخصتی کے وقت بہت روئی تھی' اس گھر میں چاہے اس کا وقت برا ہی گزرا تھا' پر یہاں اس کی امی کی یادیں تھیں، اور آج اس کی امی بھی تو نہیں تھیں جو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے گلے سے لگا کر رخصت کرتیں۔

رانی کا شوہر کامران ایک بہت ہی اچھا انسان تھا' صورت کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاق بھی اعلیٰ تھے۔ اس نے کچھ ہی دنوں میں رانی کے دل میں وہ جگہ بنائی جو آج تک کوئی نہیں بنا سکا تھا۔ وہ رانی جو آج تک خود کو بدقسمت سمجھتی تھی' اب خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے لگی تھی' کامران ایک فرم میں افسر تھا' ان کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی' رانی کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ زندگی اتنی خوبصورت ہے اور دنیا میں خوشی نام کی کوئی چیز بھی موجود ہے۔

کامران ماں باپ کا ایک ہی بیٹا تھا، اس کے ماں باپ ابھی زندہ تھے۔ وہ بھی رانی سے بیٹیوں جیسا پیار کرتے تھے۔ اس لیے رانی ایک بھرپور زندگی جینے لگی تھی۔ رانی اتنی خوش تھی کہ اسے وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا اور شادی کو چھ ماہ گزر گئے جب اسے ماں بننے والی خوشی کی خبر ملی تھی' لیکن یہ خوشی رانی کو زیادہ وقت تک راس نہیں آئی' اور اس کا شوہر' اس کی کل کائنات' کامران اچانک ہی کہیں لاپتہ ہوگیا' رانی کا تو رو رو کر برا حال تھا، اس کے پاس کامران کے سوا تھا بھی کیا؟...... اس نے بہت دعائیں کیں۔ بہت روئیں کہ یا اللہ میری واحد خوشی

میرا واحد سہارا کامران مجھے صحیح سلامت لوٹا دے' میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پر نہ رانی کی دعائیں قبول ہوئیں اور نہ کامران گھر لوٹا' ایک ماہ بعد کامران کی بوری بند لاش ملی تھی۔ جس کو ظالموں نے بڑی بیدردی سے قتل کیا تھا' اس دن رانی پہ غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا' اسے ایسا لگا کہ اب وہ زندہ نہیں رہ سکے گی لیکن اسے جینا تھا' اپنے اس بچے کے لیے جو اس کی کوکھ میں پل رہا تھا' رانی کامران کی آخری نشانی کے لیے' اپنے بچے کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی' کیونکہ کامران کے بعد وہی اس کی آخری امید تھی۔

کامران کی موت کے بعد بھی' کامران کے ماں باپ نے اسے بہت پیار دیا۔ اس کا بیٹی کی طرح خیال رکھا کیونکہ اب ان کے پاس بھی رانی اور اس کے بچے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ رانی کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی' اگر کمی تھی تو صرف خوشی کی اور سکون کی' اس کی زندگی کے وہ چند پل خوشی کے تھے جب کامران اس کے ساتھ تھا' ورنہ حالات نے اس پہ کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے تھے۔ پہلے اس کی ماں چھینی' پھر باپ بھی بدل گیا' اس کا بچپن دکھوں اور غموں کے سائے میں گزر گیا اور پھر اگر اسے تھوڑی سی خوشی ملی تو وہ بھی عارضی ثابت ہوئی اب کامران بھی اسے تنہا کر گیا تھا۔

رانی کو خدا نے بہت جلد ہی ایک نہایت خوبصورت بیٹے سے نوازا جس کا نام رانی نے ارمان رکھا' کیونکہ وہی اب رانی کے ارمانوں کا محور تھا' ارمان میں رانی کو' کامران کا عکس دکھتا تھا' وہ بالکل کامران پر ہی گیا تھا' ارمان کو پا کر رانی جیسے دوبارہ جی اٹھی تھی۔

رانی بہت خوش تھی۔ وہ ارمان کو پھولوں کی طرح رکھتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ارمان پڑھ لکھ کر اپنے باپ کی طرح اچھا انسان بنے' اس لیے اس نے اپنا پیار اور ساری توجہ ارمان پر رکھی' وہ ارمان کو پا کے اپنے آپ کو بھول گئی تھی' رانی ارمان کو کبھی بھی' کہیں بھی اکیلے باہر کھیلنے نہیں دیتی تھی' نہ اسے کہیں جانے دیتی تھی' اسے پتہ نہیں کیا ڈر تھا کہ کامران کی طرح' ارمان کو بھی کوئی اس سے چھین نہ لے۔

ارمان کی عمر جب اسکول جانے کی ہوئی تو رانی نے اسے ایک بہت اچھے اسکول میں داخل کروادیا' ارمان کے اسکول کا پہلا دن رانی کے لیے بہت مشکل تھا کیونکہ وہ اسے خود سے الگ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس کا اسکول جانا بھی ضروری تھا' وقت کے ساتھ جب ارمان بڑا ہو گیا تو وہ اپنی امی کو سمجھاتا کہ وہ اس کے لیے اتنی فکر مند نہ ہوں وہ اب بڑا ہو گیا ہے اور اپنا خیال خود رکھ سکتا ہے لیکن رانی کے دل کو کہاں قرار آتا تھا' ارمان اپنی ماں کا اب بہت خیال رکھتا تھا' وہ سمجھتا تھا کہ اس کی ماں کس مشکل دور سے گزری ہے' اور وہ اپنی ماں کو ساری خوشیاں لوٹانا چاہتا تھا' وہ اپنی ماں کا بہت فرماں بردار تھا۔

ایک صبح ارمان اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے کہا "امی آج میرا اسکول جانے کا دل نہیں کر رہا۔"

رانی نے پہلے ارمان کو گھور کے دیکھا' اور پھر ہنس کر کہا "نہیں بیٹا ابھی کچھ مہینے بعد تمہارے امتحان شروع ہونے والے ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ تمہاری پڑھائی خراب ہو۔"

ارمان نے کہا "ٹھیک ہے امی جیسی آپ کی مرضی!"

رانی نے ارمان کو اسکول بھیج تو دیا تھا' پر اس کا دل نجانے کیوں بجھا بجھا سا تھا۔ وہ گھر کے کام میں

مصروف تھی کہ اتنے میں فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوگئی تھی، رانی کا دل ڈوب سا گیا تھا' اس نے ڈرے ہوئے انداز میں فون کو کان کے ساتھ لگایا تھا' ایک بھیانک خبراس کی منتظر تھی۔

رانی کے ہوش اڑ گئے تھے۔

خبر یہ تھی کہ آرمی پبلک اسکول پر دہشت گردوں نے حملہ کردیا ہے جس میں بہت سے بچے شہید' اور بہت سے زخمی ہیں۔''

رانی نے جب یہ سنا تو اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر زمین پر گر گیا' وہ پاگلوں کی طرح باہر کی طرف بھاگی تھی' اس کا رخ ارمان کے اسکول کی طرف تھا' اسے نہ دوپٹے کا ہوش تھا اور نہ جوتوں کا اور ہوتا بھی کیسے اس کی دنیا اجڑنے والی تھی۔

رانی جب اسکول پہنچی تو وہاں سماں ہی کچھ اور تھا' ہر ماں اپنے آپ کو پیٹ رہی تھی اور رو رہی تھی' اپنے جگر گوشے کو ڈھونڈ رہی تھی۔ کسی کو اس کا بچہ زخمی ملا تھا' کسی کو صرف لاش ملی تھی اور کوئی ابھی بس تلاش میں تھا' رانی نے جب یہ سب دیکھا تو اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے؟ اپنے ارمان کو کہاں ڈھونڈے' کس سے پوچھے' اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ارمان زندہ بھی ہوگا کہ نہیں اس سوچ سے' اس کی روح کانپ اٹھی تھی' اتنی تکلیف تو اسے تب بھی نہیں ہوئی تھی جب اس کی امی چھوٹی سی عمر میں اسے تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھیں اور تب بھی نہیں جب کامران کی لاش گھر لائی گئی تھی' وہ ایک بار پھر دعائیں مانگنے لگی تھی یا اللہ! میرے ارمان کو اپنے حفظ وامان میں رکھنا، اس کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے' وہ میری زندگی کا کل سرمایہ ہے میں اس کے بعد تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گی بس ایک بار مجھے میرا ارمان صحیح سلامت لوٹا دے۔'' رانی زار و قطار رو رہی تھی۔

کئی بچوں کو مختلف اسپتالوں میں منتقل کردیا گیا تھا' جس میں کچھ تو شہید تھے اور کچھ زخمی تھے' رانی ارمان کی تلاش میں جب اسپتال پہنچی تھی تو وہاں بہت بھیڑ تھی' سارے لوگ اپنے پھولوں کی تلاش میں سرگرداں تھا، کچھ اپنے مرجھائے ہوئے پھولوں کو دیکھ دیکھ کر پاگلوں کی طرح رو رہے تھے، رانی ایک وارڈ میں گئی جہاں سارے زخمی بچے پڑے ہوئے تھے جن کو طبی امدادی جارہی تھی رانی کو وہاں بھی ارمان نہیں ملا' اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی' اسے یوں لگ رہا تھا' جیسے اس کی جان نکل جائے گی لیکن ممتا کی طاقت اسے مرنے نہیں دے رہی تھی رانی' دوسرے وارڈ میں گئی تو وہاں بھی کافی بچے پڑے ہوئے تھے' نہ جانے زندہ تھے یا نہیں' اور پھر رانی کو کچھ ہی دیر میں وہ مل گیا' جس کی تلاش تھی۔ ارمان خون میں تر ایک بیڈ پر پڑا ہوا تھا اس کے جسم میں زندگی کے آثار نہیں تھے' اس کے ماتھے پر گولی کا ایک نشان تھا، جو اس کی موت کا سبب بنی تھی...... رانی ارمان کی موت پر نہ روئی تھی نہ چلائی تھی' نہ ہی اس نے خدا سے کوئی گلہ کیا تھا کیونکہ وہ سکتے میں چلی گئی تھی۔

ارمان کی آخری رسومات بھی ہوگئیں' اسے سپرد خاک کردیا گیا لیکن رانی کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں گرا' شاید اس کے آنسو ختم ہو چکے تھے' اس ظالم دنیا نے اس سے اس کا آخری سہارا بھی چھین لیا تھا...... اسے رلانے کی کوشش کی گئی تھی مگر وہ نہیں روئی تھی۔ اور رانی آج بھی سکتے میں ہے!!

☆☆☆

اس ماہ کی دکھی کہانیاں

تیسری کہانی

عروج وزوال

شاہدہ ذاکر

ماں اور اولاد کے رشتے سے جڑی عبرت اثر کہانی



خداخدا کر کے میرے شوہر کی ملازمت میں ترقی ہوئی اور تنخواہ میں اضافے کے ساتھ انہیں کار بھی ملی تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ دراصل ہم کافی عرصے اس ترقی کے منتظر تھے لیکن اندرون خانہ سازشوں کی وجہ سے یہ مواقع حق داروں کے بجائے قرابت داروں کو جلدی ملتے تھے۔ اس کام کے حوالے سے میں نے منت مان رکھی تھی کہ میں داتا صاحب کے مزار پر چادر چڑھاؤں گی' سو ایک اتوار کی دوپہر کو میں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ مزار پر پہنچ گئی تھی۔

رش حسب معمول بہت زیادہ تھا' کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ہم نے جا کر مزار پر دعا مانگی اور چادر چڑھائی۔ وہاں سے واپسی کے وقت تک مغرب کی اذان بلند ہوگئی تھی میں نے وضو کر کے نماز ادا کرنی شروع کر دی۔ نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے میری نظر ستون سے ٹیک لگائے ایک خستہ حال وجود پر پڑی تھی تو میرے ذہن کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ انتہائی مانوس چہرہ تھا، لیکن گردش زمانہ نے نقش و نگار کو دھندلا دیا تھا۔ بکھرے ہوئے بال، ملگجے کپڑے اور ایک پاؤں پر پٹی باندھے ہوئی اس شخصیت کو میں نے آمنہ خالہ کے نام سے شناخت کر لیا تھا۔ بچپن میں گاؤں میں وہ ہماری پڑوسن تھیں بعد میں شادیوں اور ملازمتوں کے بعد ہم تمام بہن بھائی شہر میں منتقل ہو گئے تھے۔ والدین کی زندگی تک گاؤں سے رابطہ رہا، خوشی غمی میں شرکت کرتے رہے لیکن ان کے راہی ملک عدم ہونے کے بعد غم روزگار میں مبتلا ہو کر سب کچھ بھول بھال گئے آج تقریباً بیس برس بعد یہ چہرہ دیکھ کر یادوں کی پٹاری کھل گئی تھی۔

میں تقریباً بھاگتی ہوئی ان کے پاس پہنچی اور آمنہ خالہ کہہ کر ان کے گلے لگ گئی ''السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟'' وہ تھوڑی دیر تک مجھے پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہیں، یکایک ان کی آنکھوں میں شناخت کی پرچھائیاں ابھریں اور پھر جو بن بادل برسات شروع ہوئی تو مجھے ان کو چپ کرانا مشکل ہو گیا...... اس وقت میں نے ان سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا تھا، کیونکہ ان کا حلیہ بزبان خاموشی چیخ چیخ کر سارا احوال سنا رہا تھا۔ میں ان کو بمشکل راضی کر کے اپنے ساتھ گھر لے آئی تھی۔

گھر آ کر میں نے ان کو کھلا پلا کر' بخار کی دوائی دینے کے بعد سلا دیا تھا۔ میرے شوہر بھی میرے چچا زاد اور محلے دار ہونے کی وجہ سے آمنہ خالہ سے واقف تھے۔ انہوں نے بھی میرے اس اقدام کو سراہا تھا۔

اگلے دن صبح شوہر کو دفتر اور بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد میں اپنا اور آمنہ خالہ کا ناشتہ لے کر ان کے پاس گئی تو انہوں مجھے ڈھیروں دعائیں دیں اور پھر ناشتے سے فارغ ہو کر انہوں نے مجھے اپنی جو کہانی سنائی، وہ میں انہی کی زبانی آپ کو سنا رہی ہوں۔

☆......☆

میں نے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ میں شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ میں شادی کے دس سال بعد بہت منتوں مرادوں سے اپنے والدین کی زندگی میں بہار بن کر آئی لہٰذا میری پیدائش پر جی بھر کر خوشیاں منائی گئیں، مبارکبادوں، مٹھائیوں اور دعوتوں کا سلسلہ دنوں تک چلتا رہا۔ غریبوں کے صدقے خیرات بھی دیئے گئے اور جب میری پہلی سالگرہ آ گئی تو وہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ یہ تمام باتیں میری والدہ نے میرے بڑے ہونے کے بعد بتائی تھیں۔

میں اپنے والدین کی آنکھوں کا تارا تھی، وہ ہر وقت مجھ پر دیوانہ وار نثار ہوتے رہتے اور میری ہر خواہش بن کہے پوری کی جاتی، جب میں اسکول جانے کی عمر کو پہنچی تو میرا داخلہ ایک اچھے اسکول میں کرادیا گیا۔ ڈرائیور مجھے اسکول چھوڑنے اور لینے جاتا تھا۔ میرے ہم جماعت مجھ پر رشک کرتے تھے۔ اپنی خداداد ذہانت کی بنا پر میں اساتذہ کی منظور نظر تھی۔ یوں ہر کلاس میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہوئے میں اعلیٰ گریڈ سے میٹرک کرلیا اور شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا۔

اب والدہ کو میرے بیاہ کی فکر لگ چکی تھی۔ میرے حسن کی وجہ سے میرے لیے رشتوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ والدین نے نہایت دیکھ بھال کے بعد ایک نہایت معزز فیملی میں میرا رشتہ طے کردیا اور بی اے کرتے ہی مجھے نہایت دھوم دھام سے پیا کے سنگ روانہ کردیا گیا۔ سسرال میں میرا کھلے دل سے استقبال ہوا۔ میں اپنے گھر کی پہلی بہو تھی اس لیے بڑے ارمانوں اور رسموں کے ساتھ مجھے لے جایا گیا اور بڑی بہو کا مقام دیا گیا' گھر میں خوش حالی کا دور دورہ تھا' تمام کاموں کے لیے ملازمین تھے۔ بس کھڑے ہو کر ان کی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔ اپنے والدین کی اعلیٰ تربیت کی وجہ سے میں ہمیشہ اپنے بڑوں سے عزت اور بچوں سے پیار کے ساتھ پیش آتی تھی۔ میرے سسرال والوں نے بھی میرے اچھے اخلاق کی قدر کی اور مجھے ہمیشہ اپنی بیٹی سمجھا۔ یوں خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے وقت بنا پنکھ کے تیزی سے اڑتا گیا اور میرے قدموں تلے جنت آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو بیٹوں کاشف اور عاطف سے نوازا، اگرچہ میرے دل میں بیٹی کی شدید خواہش تھی لیکن پھر میری کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی تو میں نے خود کو اللہ تعالیٰ کی رضا میں راضی کرلیا اور تن من دھن سے ان کی پرورش میں جت گئی، اس عرصے میں میرے شفیق ساس' سسر عالم بالا کو روانہ ہو چکے تھے۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور میرے بڑے بیٹے کاشف نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کرلی، جبکہ چھوٹا بیٹا عاطف ابھی زیر تعلیم تھا۔ اب میرے دل میں کاشف کے سر پر سہرہ سجانے کا ارمان انگڑائیاں لے رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اس طرح میری بیٹی کی آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔ ہم نے کاشف کی شادی اس کی پسند سے اس کی کلاس فیلو سحر سے کردی۔ میرا ارادہ تو اپنی سہیلی کی بیٹی کو بہو بنانے کا تھا لیکن میرے شوہر بیٹے کے ہمنوا تھے۔ ان کے بقول زندگی بچوں نے گزارنی ہے لہٰذا ان کی پسند کو اہمیت دینی چاہیے خیر بہت دھوم دھام اور ارمانوں سے ہم سحر کو بہو رخصت کرلائے۔ میں خوشی سے پھولے نہ سمارہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ میرے گھر بیٹی آ گئی ہے۔ ابتدائی دن تو دعوتوں اور گھومنے پھرنے میں گزر گئے میں نے بہو کے بہت چاؤ چونچلے کیے اور ایک مہینہ تک اسے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیا تب تک سحر بھی نہایت خوش اخلاقی اور محبت کا مظاہرہ کرتی رہی لیکن جب کاشف نے ڈیوٹی پر جانا شروع کیا تھا تو میں نے بھی بہو کا کھیر میں ہاتھ ڈلوا کے تمام رشتے داروں کی دعوت کی تھی۔

میرا خیال تھا کہ سحر گھر میں میرے ساتھ مل جل کر کام کرے گی تو ایک رونق ہو جائے گی لیکن وہ سارا دن اپنے کمرے میں رہتی اور شام کو کاشف کی آمد پر بن ٹھن کر اس کے ساتھ گھومنے چلی جاتی۔ گھر کی تمام ذمے داری مجھ پر تھی لیکن عمر کے ساتھ کچھ امراض کا شکار ہو کر میں اب کام کاج میں دقت محسوس کرتی تھی۔ میں نے بیٹے سے بات کی اور بہو کو بھی

سمجھایا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ کسی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ مارے باندھے سحر کمرے سے تھوڑی دیر کے لیے برآمد ہوتی اور نہایت خاموشی سے صرف اپنا کام نمٹا کر فوراً واپس چلی جاتی۔ انہی دنوں سحر کے ماں بننے کی خوشخبری ملی تو گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن اب تو اس کا رویہ اور بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ تمام وقت وہ کمرے میں رہتی۔ کاشف نے بیوی کے کاموں کے لیے ایک ملازمہ رکھی جو کھانا بھی کمرے میں پہنچاتی۔ میں سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ایک روز بس اچانک ہی ہمارے گھر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ میرے شوہر دفتر سے واپسی پر کار ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو گئے اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے راستے میں دم توڑ گئے، جب گھر میں اطلاع پہنچی تو مجھے تو سن کر سکتہ ہو گیا۔ اہل محلّہ اور رشتے داروں سے گھر بھر گیا اور سب نے مل جل کر انہیں آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا۔ دنوں نہیں بلکہ مہینوں تک صدمے نے میرے حواس گم رکھے لیکن وقت ہر غم کا مرہم ہے۔ عدّت کے بعد جب میں نے گھر کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی تو گھر کے طور طریقے ہی تبدیل ہو چکے تھے۔ سحر ہر چیز پر قابض ہو چکی تھی، کاشف بیوی کی آنکھوں سے دیکھتا اور اسی کے کانوں سے سنتا تھا۔ عاطف ان حالات سے بہت پریشان تھا لیکن مجھے پریشانی سے بچانے کے لیے خاموش رہتا تھا۔ وہ ابھی زیر تعلیم تھا لہٰذا شوہر کے انتقال کے بعد کاشف پر گھریلو اخراجات کا بھی بوجھ بڑھ گیا تھا۔ اب تو ہر وقت اس کا مزاج سوا نیزے پر رہتا اور اس سے بات کرنے کے لیے بھی ہمت جمع کرنی پڑتی تھی۔

سحر کو اس کی والدہ بچے کی پیدائش کے لیے اپنے ساتھ لے گئیں تو کاشف کا بھی زیادہ تر وقت وہیں گزرنے لگا۔ بچے کی پیدائش پر میں نے تمام گلے شکوے بھلا کر دیوانہ وار اسے دیکھنے بہو کے میکے گئی جہاں میرے ساتھ ایسا سلوک ہوا کہ میں نے دوبارہ وہاں جانے سے توبہ کر لی تھی۔ کاشف کبھی کبھار کھڑے کھڑے دو گھڑی کے لیے گھر آتا اور پھر ایک دن اس نے نہایت سپاٹ لہجے میں مجھے بتایا کہ اسے دبئی میں ملازمت مل گئی ہے اور وہ بیوی اور بیٹے کے ہمراہ ایک ہفتے بعد وہاں جا رہا ہے۔ میں تو یہ سن کر دنگ رہ گئی تھی اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، لیکن وہ جھوٹی تسلی اور دلاسے دے کر بیرون ملک روانہ ہو گیا تھا۔

عاطف کی تعلیم مکمل ہونے میں ابھی دو سال تھے۔ ہم نے گھر کا ایک پورشن کرائے پر اٹھا دیا اور باقی جمع پونجی ملا کر اپنے اخراجات پورے کرتے رہے شروع میں کاشف کبھی کبھار دوبئی سے فون کر لیتا تھا بعد میں وہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ ان گزرے برسوں میں میرے ماں باپ بھی ابدی سفر پر روانہ ہو چکے تھے، اس لیے اب میں بہت تنہائی محسوس کرتی تھی۔ آخر کار خدا خدا کر کے عاطف کی تعلیم مکمل ہوئی اور اسے فوراً ہی ایک بہت اچھی فرم میں ملازمت بھی مل گئی، یوں ہماری زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا، اب عاطف دن بھر ڈیوٹی پر ہوتا اور میں گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ وہ ابھی شادی کے لیے راضی نہیں تھا لیکن میں اپنی زندگی میں اس کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھی۔ اس لیے میرے اصرار پر وہ مان گیا تھا۔

عاطف نے مجھے مکمل اختیار دیا تھا کہ میں اپنی پسند کی بہو منتخب کروں، غیروں کو تو میں پہلے ہی آزما چکی تھی لہٰذا میں نے اپنوں میں شادی کرنے کا سوچا کیونکہ مثل مشہور ہے کہ اپنا مارے گا بھی تو چھاؤں میں ڈالے گا۔ اب قرعہ فال میرے شوہر کی بھتیجی ماہم

کے نام نکلا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور ملازمت بھی کرتی تھی۔ دونوں گھروں کی باہمی رضامندی سے ایک سادہ سی تقریب میں اسے منگنی کی انگوٹھی پہنا کر دو ماہ بعد ہونے والی شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں اور وہ دو ماہ اتنی تیزی سے گزر گئے کہ پتہ ہی نہیں چلا پھر ایک خوبصورت سی شام کو ماہم دلہن بن کر ہمارے سونے آنگن میں اجالا پھیلانے آ گئی۔ کاشف نے چھٹی نہ ملنے کا عذر پیش کر کے شادی میں شرکت سے معذرت کر لی تھی۔

کافی دنوں تک دعوتوں اور گھومنے پھرنے کا سلسلہ چلتا رہا اور پھر جب اپنی آفس کی چھٹی ختم ہونے کے بعد عاطف ایک صبح آفس جانے کے لیے تیار ہوا، تب ماہم بھی بھرپور تیاری کے ساتھ اس کے ہمراہ جانے کے لیے کھڑی تھی۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ یہ بات شادی سے پہلے ہی طے ہو گئی تھی کہ وہ ملازمت کو خیر باد کہہ دے گی۔ عاطف نے بتایا کہ ایک ضروری پروجیکٹ کی وجہ سے ماہم فوری طور پر اپنی جاب سے استعفیٰ نہیں دے سکتی لیکن اس پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد وہ آزاد ہو جائے گی۔ دونوں نے ناشتہ کیا اور ہنستے مسکراتے مجھے خدا حافظ کہہ کر روانہ ہو گئے۔

اب پھر میں تھی اور میری تنہائی اور تمام گھر کی ذمے داری' اب تک زندگی کی تلخیوں اور پریشانیوں نے مجھے شوگر اور بلڈ پریشر کا تحفہ دے دیا تھا۔ میں دوائیاں کھا کر چکراتے سر کے ساتھ گھریلو ذمہ داریاں نبھاتی، اس دوران میں عاطف سے جب بھی ماہم کے آفس کی بات کرتی وہ ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال جاتا اور پھر جب بہو سے بات کی تھی تو اس نے نہایت سرد مہری سے جواب دیا تھا کہ چونکہ ایک بندے کی تنخواہ سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہو سکتے، اس لیے وہ عاطف کی مدد کے لیے ملازمت کر رہی ہے ورنہ اسے کوئی شوق نہیں' اس نے مجھے یہ بھی جتادیا کہ میری بیماری اور علاج کا بوجھ بھی بیٹے اور بہو دونوں نے مل کر ہی اٹھایا ہوا ہے ......اس کے بعد تو میں نے صبر شکر اور زبان بندی کو اپنا وطیرہ بنا لیا تھا اسی دوران ماہم امید سے ہو گئی لیکن اس نے اپنی جاب جاری رکھی تھی۔

اب رفتہ رفتہ طبیعت کی خرابی اور ملازمت کی مصروفیت نے ماہم کی زبان میں تلخی اور کڑواہٹ بھرنا شروع کر دی تھی' معمولی سی بات اور ناگواری پر وہ مجھے زبان کے تیروں سے زخمی کر دیتی، عاطف بھی یہ سب دیکھتا لیکن شاید ماہم کی صحت کے مدنظر خاموش رہتا۔ خدا خدا کر کے یہ وقت گزرا تھا اور ایک گول مٹول پیاری سی گڑیا مریم نے ہمارے گھر کی رونق بڑھادی تھی۔ کہتے ہیں اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔ سو مجھے بھی یہ ننھی پری اپنی جان سے بڑھ کر عزیز تھی۔ میں نے اس موقع پر اپنی ہمت سے بڑھ کر ماہم کا ساتھ دیا اور اس پر ماہم کافی شکر گزار بھی ہوئی تھی۔

تین ماہ بعد ماہم نے میری توقع کے برخلاف دوبارہ آفس جوائن کر لیا تھا اور یوں ننھی گڑیا مریم میری ذمہ داری بن گئی تھی۔ اب سارا دن اس کے فیڈر، نیپی، نہلانے' سلانے اور بہلانے میں نکل جاتا تھا، یہ ذمے داری میری طاقت اور طبیعت سے زیادہ تھی لیکن عاطف اپنی اولاد کو کسی غیر کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا سو اس نے میری مدد کے لیے ایک ملازمہ رکھ دی تھی جو صبح کے وقت آ کر گھر کے تمام کام نپٹا کر چلی جاتی، باقی سارا دن میں تنہا بھی کی دیکھ بھال کرتی مگر اب میری صحت تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔ اور میں بمشکل یہ ذمے داری نبھا رہی تھی۔

ایک روز ملازمہ اپنا کام ختم کر کے جا چکی تھی'

اس دن میری شوگر شاید زیادہ لو ہوگئی تھی اس لیے مجھے چکر آ رہے تھے۔ مریم کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی، وہ چڑچڑی ہو کر مسلسل رو رہی تھی۔ میں نے اسے گود میں لیا اور کچن میں جا کر اس کا فیڈر بنایا تھا، اچانک میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا اور میں سنبھلنے کی تمام تر کوشش کے باوجود بچی کے ساتھ گر گئی تھی، وہ گرنے کی وجہ سے چیخ چیخ کر رونے لگی تھی اسی وقت اتفاق سے ماہم کی آمد ہوگئی تھی۔

اس کے پاس داخلی دروازے کی چابی موجود تھی، اپنی بچی کو زمین پر گرے ہوئے روتے دیکھ کر وہ غصے میں پاگل ہو کے بری طرح چیخنے چلانے لگی۔ اس نے میری تمام خدمات کو بھلا دیا تھا اور میری لاپرواہی اور غیر ذمے داری پر مجھے ایسی ایسی باتیں سنائی تھیں کہ میرا دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔

مجھ پر اپنا سارا غصہ نکال کر وہ مریم کو لے کے اپنے کمرے میں بند ہوگئی تھی۔ میرا صدمے سے بہت برا حال تھا۔ غم و غصے نے میرے دل پر ایسا غلبہ پایا کہ میں اسی حالت میں گھر سے نکل آئی تھی، میں جانتی تھی کہ میرا بیٹا بھی بیوی کی ناراضگی کے ڈر سے میرا ساتھ نہیں دے گا۔ مجھے سامنے ایک رکشہ نظر آیا، اس میں بیٹھ کر داتا دربار چلی گئی۔ اب میں اپنی بقیہ زندگی وہیں گزارنا چاہتی ہوں۔ میں نے تمام رشتوں کو آزما لیا ہے، اب مجھ میں مزید برداشت کی تاب نہیں۔ تم مجھے وہیں واپس چھوڑ آؤ۔

جب آمنہ خالہ نے اپنی داستان ختم کی تو مجھے احساس ہوا کہ میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا ہے، یہی ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ والدین جو اپنی تمام عمر بچوں کے لیے وقف کر دیتے ہیں وہی اولاد ان کو بڑھاپے میں بوجھ سمجھتی ہے، ایک ماں اکیلی دس بچے پال لیتی ہے لیکن وہی دس بچے مل کر ایک ماں کو نہیں سنبھال سکتے۔ میں نے ان کو تسلی دی اور ان سے کہا کہ وہ میری والدہ کی جگہ پر ہیں اور میں ان کو ہرگز کہیں نہیں جانے دوں گی۔ میرے شوہر نے بھی ان کو بہت سمجھایا اور یوں بصد اصرار ہم انہیں روکنے میں کامیاب ہوگئے۔

آمنہ خالہ کے آنے سے گھر میں برکت ہوگئی، انہوں نے دھیرے دھیرے میری بہت سی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں۔ میں ان کو گھر میں چھوڑ کر بے فکری سے کہیں بھی چلی جاتی تھی۔ انہوں نے مجھے صرف زبان سے بیٹی کہا ہی نہیں تھا بلکہ ہمیشہ بیٹی ہی سمجھا اور میری زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں، میں نے آمنہ خالہ سے ان کے گھر کا پتا لے کر ان کے بیٹے عاطف اور بہو ماہم کو آمنہ خالہ کے اپنے گھر میں ہونے کی اطلاع بھی دی تھی ان دونوں نے میرے گھر آ کر ان سے اپنے رویے کی معافی مانگی تھی۔

آمنہ خالہ نے ممتا سے مجبور ہو کر بیٹے اور بہو کو معاف تو کر دیا، لیکن ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا، وہ میرے پاس ہی رہیں۔ ان کا اور میرا ساتھ دس سال تک رہا، اور جب ان کا انتقال ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں دوسری مرتبہ اپنی والدہ سے محروم ہوگئی ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کی زندگی، وقت اور حالات کو کوئی پتہ نہیں ہوتا جب یہ پلٹتے ہیں تو شاہ کو گدا اور گدا کو شاہ بنا دیتے ہیں۔ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ان کی آنکھوں کا تارا جسے انہوں نے بساط بھر دنیا کی ہر خوشی دی وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں لاوارث ہو کر ایک مزار پر پڑی تھیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے (آمین)

☆☆☆

اس ماہ کی دکھی کہانیاں

چوتھی کہانی

غم ہی مقدر ٹھہرے

عظمیٰ نعیم

بیٹوں پر مان رکھنے والی ایک بدنصیب ماں کی کہانی



یہ کہانی ہمارے سامنے والے گھر کی مکین خالہ نسیم کی ہے۔ ان کے شوہر انکل مرزا ایک سرکاری ملازم تھے۔ شادی کے فوراً بعد انکل مرزا کا ٹرانسفر جھنگ میں ہوا تھا تو وہ خالہ کو لے کر جھنگ چلے گئے تھے اور وہاں ان کے سات بچے پیدا ہوئے جن میں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔

وقت گزرتا گیا، بچے بڑے ہونے لگے اور ساتھ ہی ان کے اخراجات بھی بڑھنے لگے۔ وسائل اتنے زیادہ نہیں تھے کہ اخراجات با آسانی پورے ہوسکیں، سو وہاں سے ان کے درمیان لڑائی جھگڑے شروع ہوگئے۔ اسی دوران انکل مرزا کی فیملی جھنگ سے واپس گوجرانوالہ آ گئی' لیکن انکل مرزا جھنگ میں ہی جاب کرتے رہے، وہ دو ہفتوں کے بعد گھر والوں سے ملنے آ جاتے تھے لیکن جب انکل مرزا گھر آتے تو خالہ نسیم انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیتیں۔ لڑائی جھگڑے ہوتے اور خالہ نسیم اپنے شوہر کو بد دعائیں دیتیں کہ ''مرزا خدا کرے تیرا ایکسیڈنٹ ہو اور تو وہیں مرے، میرے تو پانچ بیٹے ہیں بڑے مزے سے زندگی گزاروں گی۔''

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کوئی بیوی اس طرح کی بد دعائیں اپنے شوہر کو کیسے دے سکتی ہے!

وقت کا پہیہ تیزی سے گھوم جاتا ہے' لیکن یادیں اور پچھتاوا پیچھے رہ جاتا ہے' قبولیت کی گھڑی کا پتہ نہیں ہوتا کہ کس وقت دعا یا بد دعا قبول ہو جائے۔ خالہ نسیم کے سارے بچے لاپروا اور نکمّے تھے۔ انہیں اپنی ذمے داری کا احساس تک نہ تھا کہ تھوڑی محنت کریں اور والدین کا بوجھ ہلکا کریں اور نہ ہی ان کو پڑھائی میں کسی قسم کی دلچسپی تھی۔

ایک روز سب اپنے کاموں میں مشغول تھے اور کسی کو خبر نہ تھی کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے' شاید خالہ نسیم کی بد دعا قبول ہوگئی تھی۔ وہ ہفتے کا دن تھا۔

خالہ دن بھر کے کام کاج میں مصروف تھیں۔ مرزا صاحب اپنے دفتر سے چھٹی کے بعد گھر جانے کے لیے جب بس میں بیٹھنے لگے تھے تو بس چل پڑی تھی، جس کی وجہ سے وہ نیچے گر گئے تھے اور ان کی ٹانگ بس کے نیچے آ گئی۔ اردگرد کے لوگ انہیں ہسپتال لے گئے اور وہاں سے ہی انکل مرزا کے گھر والوں کو اطلاع دی' اطلاع ملتے ہی وہ اسپتال پہنچ گئے' وہاں ڈاکٹروں نے نسیم خالہ سے کہا کہ آپ کے شوہر کی ٹانگ کاٹنی پڑے گی ورنہ زہر پورے جسم میں پھیل جائے گا مگر خالہ نے کسی طور بھی ڈاکٹر کی بات نہ مانی کہ ان کے شوہر کی ٹانگ کاٹی جائے، بلکہ خالہ نسیم اور ان کے بیٹے زبردستی انکل مرزا کو اسپتال سے ڈسچارج کرا کے گھر لے آئے اور پھر بالآخر ایک ہفتے کے اندر اندر زہر انکل مرزا کے پورے جسم میں پھیل گیا' خالہ اور ان کے بیٹوں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہیں اپنی جان سے جانا پڑا۔

جب انکل مرزا کا جنازہ اٹھا تو محلے اور گلی کے ہر فرد کی آنکھیں اشکبار تھیں، سب جانتے تھے کہ خالہ کی بد دعائیں قبول ہوگئی ہیں لیکن سب کے لب خاموش تھے۔ انکل مرزا کے انتقال کے بعد خالہ نسیم کے حالات اور خراب ہوگئے کیونکہ ان کے بیٹے محنتی نہیں تھے لوگوں سے قرض لیتے اور تھوڑا بہت بجلی کا کام کرتے جس سے ان کا گزارہ بمشکل ہوتا۔ خالہ کا تیسرا بیٹا عامر لوگوں سے قرضے لے کر یا فراڈ کر کے کسی دوسرے شہر بھاگ جاتا اور کئی ماہ گھر سے غائب رہتا۔ خالہ اور ان کے گھر والوں کو بھی نہیں پتا ہوتا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کے جانے کے بعد لوگ خالہ اور ان کے بیٹوں کو تنگ کرتے کہ ہمارے پیسے واپس کریں آخر کار تنگ آ کر خالہ نے عامر کو اپنا بیٹا ماننے سے انکار کر دیا۔ عامر سے ہر قسم کے تعلق سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ اب جو بھی ان کے

گھر آتا خالہ یہی کہتیں کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ ہمارے لیے مر چکا ہے۔

خالہ کے سب سے بڑے بیٹے ایاز کو تھوڑی بہت ذمہ داری کا احساس ہوا تو اس نے دل لگا کر محنت شروع کر دیتا کہ گھر میں گزر بسر ہو سکے۔ اسی دوران ایاز کے ایک دوست نے اسکو ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب دلوادی، ایاز کی عمر اس وقت تقریباً ۳۵ سال کی تھی۔ یہ عمر نہ صرف شادی کی ہوتی ہے بلکہ اس عمر میں دو تین بچے بھی ہو چکے ہوتے ہیں سو اب خالہ نے ایاز کے لیے لڑکی کی تلاش شروع کر دی بالآخر انہیں ایک لڑکی پسند آ گئی جس کا نام فرح تھا۔ فرح نے میٹرک کیا ہوا تھا۔ لڑکی والوں کو بھی ایاز پسند آ گیا تھا۔ یوں کچھ عرصے بعد ایاز کی فرح سے شادی ہوگئی تھی۔

شروع شروع میں خالہ نے بہو کو بہت لاڈ پیار سے رکھا تھا اور کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتی تھیں خالہ اور اس کی دونوں بیٹیاں فرزانہ اور عاصمہ گھر کا سارا کام کرتیں۔ اس طرح آرام کرتے خالہ کی بہو فرح کو سال گزر گیا۔ خالہ کے اسی لاڈ پیار نے فرح کو بگاڑ دیا۔ آرام پسندی تو فرح کی عادت بن چکی تھی۔ سو اب اگر خالہ فرح کو گھر کا کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے کو کہتیں تو فرح لڑنے جھگڑنے بیٹھ جاتی۔ اور رات کو اپنے شوہر ایاز کے کان بھرنا شروع کر دیتی۔ یوں صبح اٹھتے ہی فرح اور ایاز ماں سے لڑنا شروع کر دیتے تھے۔

اب لڑائی جھگڑے خالہ کے گھر کا معمول بن گئے تھے۔ آئے دن خالہ کے گھر سے جھگڑے کی آوازیں آتی رہتیں۔ اس لڑائی کی اصل وجہ یہ تھی کہ فرح چاہتی تھی کہ وہ علیحدہ ہو جائے۔ اسی دوران فرح کے گھر ایک بیٹی نے جنم لیا۔ فرح کا شوہر ایاز پہلے ہی اس کے ساتھ تھا اب وہ گھر میں ہی علیحدہ یوں ہوگئی کہ اپنی ہانڈی روٹی الگ پکاتی تھی۔

خالہ نسیم کا ایک بڑا بیٹا ایاز گھر میں ہی علیحدہ ہو گیا۔ دوسرا بیٹا ذاکر کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ تیسرا بیٹا عامر لوگوں کے ساتھ فراڈ کر کے بھاگا ہوا تھا۔ چوتھے بیٹے کاشف نے ایک ڈسپنسری میں ملازمت کر لی۔ شروع شروع میں تو اس نے ذمے داری کے ساتھ ملازمت کی مگر وقت گزرنے کے ساتھ خود نشے کے انجکشن لگانے شروع کر دیے اور وہ نشے کا عادی ہو گیا۔ پانچواں بیٹا راشد بھی دوسرے بھائیوں پر گیا تھا نہ اسے پڑھائی میں دلچسپی تھی اور نہ ہی کسی کام کاج میں۔

پانچ بیٹوں کے ہوتے ہوئے ایسا لگتا تا کہ خالہ نسیم بے سہاروں کی طرح زندگی گزار رہی ہیں۔ ان حالات میں خالہ کا ایک بھائی ان کے کام آیا جو لوگوں سے زکوٰۃ کے پیسے لے کر اپنی بہن کی مدد کر دیتا تھا۔

وقت رکنے سے نہیں رکتا' وہ تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ بیٹوں کے ساتھ ساتھ خالہ کو اپنی بیٹیوں کی بھی فکر تھی۔ وہ ہر وقت اپنی بیٹیوں کے رشتے کے بارے میں سوچتی رہتی تھیں اور پھر آخر کار خالہ کے بھائی نے خالہ کی بڑی بیٹی فرزانہ کے لیے ایک رشتہ دکھایا جو کہ ان کو پسند آ گیا۔ لوگوں کی امداد اور زکوٰۃ وغیرہ کے پیسوں سے خالہ نے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ یوں خالہ کے کندھوں سے ایک بیٹی کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

اب خالہ نسیم کو اپنے دوسرے بیٹے ذاکر کی شادی کی فکر کھانے لگی۔ آخر کار کافی سوچ بچار کے بعد خالہ نے اپنی بہن کی بیٹی یعنی اپنی بھانجی کو بہو بنانے کا سوچا اور جا کر اپنی بہن سے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگا، بہن نے بھی ہاں کر دی۔ کچھ عرصے بعد خالہ نے دوسرے بیٹے کی بھی شادی کر دی تھی۔

ان گزرے سالوں کے دوران خالہ کی بڑی

بہو فرح کے ہاں چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ہر سال بیٹی کی پیدائش نے فرح کو اور جھگڑالو بنا دیا تھا۔ وہ بات بات پر کسی نہ کسی سے لڑتی نظر آتی۔ اگر کوئی اور نظر نہ آتا تو سارا غصہ اپنی بیٹیوں پر نکالتی اور بات بے بات انہیں مارتی تھی۔

پہلی بہو کی طرح خالہ نے دوسری بہو نزہت کو بھی کافی لاڈ و پیار میں رکھا، ایک سال کے بعد خالہ کی دوسری بہو کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ خالہ نے پہلے ہی اسے آرام پسند بنایا ہوا تھا اور اسے کچھ نہ کہتی تھیں سارا دن خود ہی کام کرتی رہتی تھیں۔ بیٹا ہو جانے کے بعد خالہ کی چھوٹی بیٹی عاصمہ پورا دن اپنے بھتیجے کو سنبھالتی رہتی اور خالہ گھر کا کام کرتی رہتیں۔ پہلے بیٹے ایاز کی طرح خالہ کا دوسرا بیٹا ذاکر بھی اپنی بیوی کے ناز نخرے دیکھتا رہتا۔

خالہ نسیم دل ہی دل میں تمام پریشانیوں کو دبائے رکھتیں، کبھی دوسروں سے شیئر نہیں کرتی تھیں۔ کچھ اپنے بیٹوں کی اور کچھ اپنی بہوؤں کی پریشانیاں پانچ بیٹوں میں کوئی بیٹا بھی ایسا نہیں تھا جو ان کو آسرا دے سکے یا اپنی ماں کا سہارا بن سکے۔

زندگی کٹ ہی جاتی ہے' امیری میں کٹے یا غریبی میں کٹے' خوشیوں میں کٹے یا پریشانیوں میں کٹے' ہر کوئی اپنے اپنے نصیب لے کر تو پیدا ہوتا ہے۔

یہ جون کی گرمیوں کی بات ہے شدید گرمی پڑ رہی تھی اوپر سے بجلی کی لوڈ شیڈنگ۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے خالہ کو ہلکا ہلکا بخار شروع ہو گیا' جو کبھی اترتا کبھی چڑھتا' لیکن ان کے بیٹوں کو ماں کی کوئی پروا نہیں تھی کہ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ ایک دن شدید بخار میں وہ اپنے بستر پر اکیلی لیٹی ہوئی تھیں کہ کچھ محلے کی عورتیں ان سے ملنے آ گئیں جب انہوں نے دیکھا کہ خالہ کو شدید بخار ہے تو ان عورتوں نے خالہ کے دوسرے بیٹے ذاکر جو اس وقت گھر پر تھا پر زور ڈالا کہ خالہ کو اسپتال لے جاؤ۔

محلے کی عورتوں کے شدید اصرار پر ذاکر خالہ کو اسپتال لے گیا لیکن بدقسمتی سے علاج سے بھی خالہ کا بخار ٹھیک نہیں ہوا اور پھر آخر کار چوتھے دن خالہ نسیم تمام ٹینشن اور پریشانیوں کو دل میں دبائے یا دنیا میں چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئیں۔ پانچ بیٹوں کے ہوتے ہوئے ان کو کسی ایک بیٹے سے سکون حاصل نہ ہو سکا تھا۔

دو بڑے بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی خالہ نے خود اپنے ہاتھوں سے کی تیسرا بیٹا عام لوگوں سے فراڈ کر کے معلوم نہیں کہاں گیا تھا۔ اپنی ماں کی میت کو کاندھا بھی نہ دے سکا۔

خالہ نسیم کی وفات کو چار ماہ ہی گزرے تھے کہ چوتھے نمبر والا بیٹا کاشف جو کہ نشے کا عادی ہو گیا تھا اس نے ایک دن پتا نہیں خود کو کون سے نشے کا انجکشن لگایا جو اس کے جسم پر سائیڈ افیکٹ کر گیا جس کی وجہ سے وہ اپنی جان کی بازی ہار گیا اور اپنی ماں کے پاس ہی چلا گیا۔

خالہ نسیم کی وفات کے بعد بڑے بیٹے ایاز نے گھر بیچ دیا تھا اور اس کا حصہ لے کر فرح کے ساتھ کہیں اور جا بسا تھا۔ اعجاز کو جو حصہ ملا تھا اس نے کچھ پیسوں سے اپنی چھوٹی بہن عاصمہ کی شادی کر دی تھی۔ سب سے چھوٹا بیٹا راشد دبئی چلا گیا ہے جہاں وہ اپنے ماموں کے بیٹے کے انڈر میں کام کرتا ہے۔

یہ ساری کہانی سنانے کا مطلب یہ نہیں کہ خالہ نسیم نے کیسی زندگی گزاری بلکہ یہ ہے کہ جب کوئی اولاد پیدا ہوتی ہے تو والدین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اولاد ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگی، اور ان کو ہر گرم سرد سے بچائے گی لیکن شاید اولاد کی محبت اور خدمت دیکھنا ہر انسان کے مقدر میں نہیں ہوتی۔ اسی لیے تو جب کسی کے گھر میں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ہر ایک کے منہ سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے یہ بچہ نصیبوں والا ہو۔☆

سلسلے وار ناول

قسط نمبر 3

نواب

حمیرا خان

اس نوجوان کی سرگزشت جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا



سردار کے گھر پر اس کی بیوی فاطمہ اور بیٹی تارا نے ان کا استقبال کیا تھا۔ فاطمہ لمبی چوڑی گوری چٹی خوبصورت اور پرکشش عورت تھی۔ اس کی عمر تقریباً چالیس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی لیکن چہرے پر چھائی سنجیدگی اسے سخت مزاج ظاہر کر رہی تھی۔ اسلم سے بات کرتے وقت اس کے لہجے میں کوئی خاص جوش و خروش نہیں تھا نہ ہی وہ بچوں کے بارے میں کسی قسم کے تجسس کا شکار لگ رہی تھی یقیناً سردار نے اسے پہلے ہی اسلم کی آمد کے بارے میں بتا دیا تھا، اس کی سنجیدگی اور لیا دیا انداز دیکھتے ہوئے ایک لمحے کو تو اسلم بھی سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں اس نے وہاں آنے کا فیصلہ کر کے کوئی غلطی تو نہیں کر دی ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ سامان کو ایک سائیڈ پر رکھتے ہوئے اسلم نے سوچا۔ فاطمہ انہیں اس کمرے میں بٹھا کر چلی گئی تھی یقیناً اس کی سجاوٹ اور سامان سے پتہ چل رہا تھا کہ یہ کمرہ بیٹھک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔ بیٹھک کا ایک دروازہ گھر سے باہر اور ایک دروازہ گھر کے اندر کی طرف کھلتا تھا، گھر کے اندر کھلنے والے دروازے سے گھر کا باقی حصہ آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ سامنے قطار میں بنے تین کمرے ان کے آگے برآمدہ اور برآمدے کے قریب بنا ہوا مٹی کا چولہا اور تندور دوسری طرف لگا نیم کا پیڑ اور پیڑ کے نیچے لگا پانی کا نلکا، سب کچھ اس کمرے سے دکھائی دے رہا تھا۔ تارا جو ماں کے پیچھے چھپی متجسس اور پرشوق نظروں سے نواب اور اکرم کو دیکھ رہی تھی، ماں کے ساتھ ہی کمرے سے واپس جا چکی تھی۔ اسلم نے گھر سے نظریں ہٹا کر دونوں لڑکوں کی طرف دیکھا وہ بھی اسی کی طرف متوجہ تھے اور چہروں پر تھکن کے ساتھ ساتھ بیزاری بھی چھائی ہوئی تھی۔ اسلم دانستہ مسکرا دیا گویا ماحول کو ٹھیک کرنے کی ایک ارادی کوشش کی۔

☆......☆

''چاچا اماں کہہ رہی ہے ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا لو۔'' تارا شرمائی ہوئی سی دروازے میں کھڑی کہہ رہی تھی۔ تینوں کی توجہ اس کی طرف ہوئی پھر اسلم کے کہنے پر دونوں لڑکے اس کے ساتھ اٹھ کر صحن میں لگے نلکے کے پاس چلے۔ اسلم نے پہلے اکرم کا منہ ہاتھ دھلوایا، پھر نواب کا اس کے بعد خود نلکا چلا کر اپنا منہ ہاتھ دھونے لگا۔ اس دوران تارا ایک طرف کھڑی دلچسپی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ واپس بیٹھک میں چلے آئے۔ پیچھے پیچھے فاطمہ کھانا لیے چلی آئی۔ کھانا اس نے بڑی چارپائی پر رکھ دیا اور خود واپس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد تارا لسی کا جگ اور گلاس لیے چلی آئی۔ اسلم نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے جگ گلاس تھام لیا۔

''تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟'' اسلم نے کھانا کھاتے ہوئے اس سے پوچھا جو لسی دینے کے بعد وہاں سے جانے کی بجائے ایک طرف پڑی لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گئی تھی شاید اسے ماں کی طرف سے یہی ہدایت ملی تھی کہ جب تک مہمان کھانا نہ کھا لیں وہ وہاں موجود رہے تاکہ مہمانوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ آ کر ماں کو بتا سکے۔

''میرا نام تارہ ہے۔'' تارا نے اسی طرح شرماتے جھجکتے ہوئے اپنا نام بتایا۔

''ارے واہ تمہارا نام تو بہت پیارا ہے!'' اسلم نے اس کے انداز پر مسکراتے ہوئے اس کے نام کی

تعریف کی تو اس نے بچوں کے مخصوص انداز میں مزید شرماتے ہوئے گردن جھکا دی۔ کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر اسلم واپسی کے لیے تیار ہو گیا۔ فاطمہ اپنی بیٹی کے ساتھ اکیلی رہا کرتی تھی۔ ایسے میں اسلم کو مناسب نہیں لگا کہ وہ رات ان کے گھر پر گزارے۔ ویسے بھی بہت جلد انہوں نے ایک گاؤں میں ڈاکے کی تیاری کر رکھی تھی۔ اس سلسلے میں کچھ ذمہ داریاں اسلم کو پوری کرنا تھیں۔

''لو بیٹا یہ رکھ لو۔'' گھر سے چلتے وقت بچوں سے ملتے ہوئے جہاں اسلم نے نواب اور اکرم کو کچھ پیسے تھمائے وہیں تارا کے ہاتھ میں بھی کچھ نوٹ تھمانے چاہے۔

''رہنے دیں بھائی صاحب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' تارا نے ماں کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی۔

''بھابی جی میں بٹیا کے لیے کوئی تحفہ نہیں لا سکا، بس اسے میری طرف سے تحفہ سمجھ کر دینے دیں۔'' فاطمہ کی بات کے جواب میں اسلم نے لجاجت سے کہا تو فاطمہ نے اور کچھ کہے بنا تارا کو پیسے لینے کا اشارہ کر دیا۔ اسلم گھر سے رخصت ہونے لگا تو نواب اور اکرم اس سے لپٹ گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسلم نے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں خود سے الگ کیا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔

☆......☆

اسلم کے جانے کے بعد فاطمہ ان دونوں کو اندر گھر کے ایک کمرے میں لے گئی۔

''یہ تم دونوں کا کمرہ ہے آج سے تم دونوں یہیں رہو گے۔'' فاطمہ اپنے مخصوص سنجیدہ لہجے میں ان سے مخاطب تھی۔ وہ زبان سے کچھ نہ بولے۔ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گئے۔

''اماں میں ان کے ساتھ کھیلوں؟'' تارا نے اماں سے پوچھا اور مسکرا کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں ٹھیک ہے تم لوگ کھیلو میں گھر کے کام نمٹا لوں۔'' فاطمہ اسے کھیلنے کی اجازت دیتے ہوئے خود کمرے سے چلی گئی۔

''تم میرے ساتھ کھیلو گے نا۔'' تارا نواب کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔ اسے وہ مغرور سا نظر آنے والا لڑکا بہت اچھا لگا تھا۔

''نہیں میں نے نہیں کھیلنا۔'' نواب نے بنا کسی مروت کے سیدھا انکار کر دیا تو تارا مایوس دکھائی دینے لگی۔

''چلو آؤ ہم دونوں کھیلتے ہیں۔'' اکرم کو اس پیاری سی گڑیا جیسی بچی کا مایوس ہونا اچھا نہیں لگا تھا یا پھر نواب کی بد اخلاقی پر پردہ ڈالنا چاہ رہا تھا جو بھی تھا وہ اسے کھیلنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اکرم کی بات پر وہ اسے اپنے ساتھ صحن میں لے گئی اور پہلی بار اکرم کی نظر صحن میں لگے ہوئے دوسرے درخت پر پڑی جس میں رسے میں لکڑی کا تختہ ڈال کر جھولا بنایا گیا تھا۔ دونوں بچے جھولے پر بیٹھ گئے اور مختلف قسم کے کھیل کھیلنے لگے۔ گھر کے کام نمٹاتی فاطمہ نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا اور اس کی دوسری نظر بے اختیار اس کمرے کی طرف اٹھ گئی جہاں نواب ایک چارپائی پر بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

''تمہارا بھائی نہیں آیا باہر کھیلنے کے لیے؟'' فاطمہ نے اکرم سے پوچھا تو اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"کیوں نہیں آیا؟" بظاہر سخت مزاج دکھائی دینے والی فاطمہ کو نواب کی فکر ہو رہی تھی اس لیے سوال پہ سوال کیے جا رہی تھی۔

"وہ تھک گیا ہے کل کو کھیلے گا۔" اکرم نے معقولیت سے فاطمہ کو جواب دیا تو وہ بھی مطمئن دکھائی دینے لگی، واقعی وہ لوگ بہت لمبے سفر سے آئے تھے۔ تھکنا تو تھا ہی، بڑے بھی ایسے سفر میں تھک جائیں تو وہ تو پھر چھوٹا بچہ تھا۔ فاطمہ کام کرتے ہوئے غیرارادی طور پر نواب کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

☆......☆

شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ سب صحن میں آ بیٹھے تھے۔ اکرم کی تارا سے کافی دوستی ہو گئی تھی جبکہ نواب ابھی تک خاموش ہی تھا۔ وہ کسی سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف جنگل چھوڑ کر یہاں آ تو گیا تھا لیکن اس کا ذہن اور دل وہیں اٹکا ہوا تھا۔ اسے بار بار حاجرہ اور اکبر کی یاد ستا رہی تھی اور جب جب اکبر کا بے جان جسم اس کے تصور میں آتا تبھی اسے مشتاق بھی یاد آ جاتا۔ زخموں سے چُور مشتاق موت سے لڑتا ہوا اور پھر موت کے منہ میں جاتا ہوا اور تب اس کے خون کی جگہ آگ لہو میں دوڑنے لگتی۔ انتقام کی آگ اور یہ انتقام اسے بے چین کیے دے رہا تھا۔ فاطمہ نے صحن میں پانی چھڑک کر چارپائیاں ڈال دی تھیں اور اسٹینڈ پنکھا بھی لگا دیا تھا۔ ہلکی ہلکی چلتی ہوئی ہوا موتیے کی خوشبو اپنے ساتھ لیے پورے آنگن میں رقص کرتی پھر رہی تھی اور بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"اماں ہمیں کہانی سناؤ۔" سب بستر پر لیٹ گئے تو تارا نے ماں سے فرمائش کی۔

"ابھی رات ہو گئی ہے سو جاؤ کل سناؤں گی۔" فاطمہ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"دیکھ لو اماں دن میں کہانی سنانے کا کہو تو تم کہتی ہو دن میں کہانی سنانے سے ماموں رستہ بھول جائے گا اور اب رات کو بھی نہیں سناتی کہ رات ہو گئی ہے تو آخر کس وقت ہوتا ہے کہانی سنانے کا وقت؟" تارا اچھی خاصی جھلائی ہوئی تھی تبھی بولی تو بولتی چلی گئی۔

"کیا کتر کتر قینچی کے جیسی زبان چلتی ہے تمہاری۔" فاطمہ نے اسے جھڑک کر خاموش کرانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔

"کہانی سناؤ اماں ورنہ میں نہیں سوؤں گی۔" تارا نے دھمکی دی۔

"کہانی سنا دو نا چاچی!" اکرم جو کتنی دیر سے ماں بیٹی کی باتیں سن رہا تھا، تارا کی حمایت میں بولا تو فاطمہ کو کہانی سناتے ہی بنی۔ لیکن کہانی سناتے ہوئے بھی اس کی توجہ بار بار نواب کی طرف جا رہی تھی جو خاموش لیٹا آسمان کی طرف تکے جا رہا تھا۔ اس دوران اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی اکرم اور تارا کی طرح کہانی سننے میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا فاطمہ کو تو اس بات کا بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اس وقت بھی کہانی سن رہا تھا یا اپنی سوچوں میں کھویا ہوا تھا اتنی سی عمر میں اتنا سنجیدہ اور خاموش بچہ فاطمہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اسے ان کے حالات کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا ورنہ شاید وہ اتنا زیادہ حیران نہ ہوتی۔ اکرم اور نواب دونوں ایک جیسے حالات سے گزرے تھے لیکن نواب پر ان حالات بلکہ حادثات کا اثر اکرم سے کہیں زیادہ ہوا تھا۔ ایک تو بنیادی طور پر وہ

زیادہ حساس بچہ تھا اور دوسرے اس تمام معاملے میں اس نے اپنا باپ کھویا تھا جبکہ اکرم کا باپ دنیا میں موجود تھا اور پھر نواب کو اپنی ماں کھوئے بھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، اس کے ماں باپ یوں آگے پیچھے دنیا سے چلے گئے تھے کہ وہ بالکل ٹوٹ کر رہ گیا تھا دوسرے وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اکبر کی موت کی وجہ بھی خود اس کی ذات ہی ہے۔ اصل نشانہ وہی تھا، اس کی آئی اکبر کو لے گئی تھی اور وہ ابھی تک اس صدمے سے ابھر نہیں پا رہا تھا ۔دوسری طرف اکرم تھا جس نے اس وقت اپنی ماں کو کھویا تھا جب اسے کسی بات کا شعور تھا نہ اپنی محرومی کا احساس تھا، اس کے لیے ساجدہ ہی اس کی ماں تھی۔ ساجدہ کی موت کا دکھ اسے بہت تھا لیکن یہ احساس بھی تھا کہ اسلم اس دنیا میں اس کے سب سے بڑے سہارے کے طور پر موجود تھا۔ رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ جب تارا اور اکرم نے آنکھیں موندلیں اور ان کی طرف سے سوال ہونا بند ہو گئے تو فاطمہ نے بھی کہانی سنانا بند کر دی ۔اس نے گردن موڑ کر نواب اور اکرم کی چارپائی کی طرف دیکھا، اکرم بے خبر سو رہا تھا جبکہ نواب اب بھی پہلے کی طرح آسمان کو تکے جا رہا تھا۔ فاطمہ نے چاہا کہ اسے سونے کے لیے کہے لیکن پھر کچھ سوچ کر کروٹ بدل گئی وہ جانتی نہیں تھی کہ ان کے ساتھ کیا حالات پیش آئے تھے اور وہ اس وقت اس گھر میں کیوں موجود تھے لیکن وہ اتنا تو سمجھتی ہی تھی کہ کوئی بلاوجہ گھر بدر نہیں ہوتا۔ بچوں کے خاص طور پر نواب کے بارے میں وہ کچھ تشویش کا شکار ہو گئی تھی۔

☆......☆

فاطمہ روز کی طرح صبح منہ اندھیرے اٹھ کر گھر کے کاموں میں لگ گئی تھی۔ تینوں بچے سوئے ہوئے تھے وہ اٹھ کر بھینسوں کے باڑے میں چلی آئی۔ اس وقت وہ روز مشین میں گھاس کاٹ کر جانوروں کے آگے ڈالا کرتی تھی۔ یہ دو بھینسیں اور چار بکریاں اس کی زندگی کو مصروف رکھنے کا بہانہ بنی ہوئی تھیں۔ ورنہ شاید اس کے لیے وقت گزارنا بھی ایک کام بن جاتا۔ وہ گھاس اٹھا کر مشین کے پاس ڈھیر کرنے لگی۔ مطلوبہ مقدار میں گھاس مشین کے پاس رکھنے کے بعد وہ اسے کاٹنا شروع کرتی۔

''چاچی میں گھاس کاٹ دوں؟'' وہ اپنے کام میں مصروف تھی جب اس نے اپنے پیچھے یہ آواز سنی۔ فطری طور پر وہ چونک کر پلٹی۔ دیکھا تو پیچھے نواب کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک دفعہ تو فاطمہ کے دل میں آئی کہ انکار ہی کر دے پتہ نہیں کتنا تھکا ہوا تھا اور رات کو بھی جانے کب سویا ہوگا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اگر وہ خول باہر نکل رہا ہے تو فاطمہ کو اس کی مدد کرنی چاہیے۔ فاطمہ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اب یہ طے تھا کہ انہیں وہیں رہنا تو اچھا تھا کہ وہ گھر میں اور گھر والوں میں مل جائیں۔ فاطمہ نے سوچا' نواب آگے بڑھ آیا اور گھاس اٹھا کر مشین کے پاس ڈھیر کرنے لگا۔

''بس اتنا کافی ہے!'' فاطمہ نے کہا تو اس نے گھاس مشین میں ڈال کر اس کی ہتھی تھام کر گول گول گھمانا شروع کر دی۔ یہ پرانے طرز کی ٹوکا مشین تھی جو عام طور پر دیہاتوں میں گھروں میں جانوروں کا چارہ کاٹنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ نواب نے منٹوں میں کٹی ہوئی گھاس کا ڈھیر لگا دیا۔

''تمہیں گھاس کاٹنا کس نے سکھایا؟'' فاطمہ نے بات کرنے کی غرض سے سوال کیا۔

''میرے گھر کے ساتھ والے گھر میں میرا دوست رہتا تھا اس کے گھر ڈھور ڈنگر تھے۔ میں نے کئی بار اس کے ساتھ مل کر جانوروں کا چارا تیار کیا ہے'' نواب نے اس بار تفصیل سے جواب دیا تھا۔ فاطمہ کو خوشی ہوئی کہ وہ باتیں کرنے لگا تھا البتہ اس کی آنکھوں میں اب بھی بہت وحشت تھی اور چہرے پر بے حد گہری سنجیدگی۔ فاطمہ کا بے اختیار جی چاہا کہ بڑھ کر اس معصوم سے بچے کو سینے سے لگا لے اور اس سے پوچھے کہ ایسا اس کے ساتھ کیا ہوا تھا جو وہ ایسا ہو رہا تھا لیکن تکلف کی دیواریں گرتے گرتے ہی گرتی ہیں وہ بھی جلد بازی دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ نواب کو وقت دینا چاہتی تھی۔ نواب نے اس کے ساتھ مل کر کئی چھوٹے موٹے کام نمٹا دیئے اتنے میں تارا اور اکرم بھی جاگ گئے تو فاطمہ ناشتے کی تیاری میں لگ گئی۔

☆......☆

شہر سے دور اس بڑے سے گودام میں اس وقت کئی ٹرک آگے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ ان ٹرکوں پر جوتے لدے ہوئے تھے بہت سارے مزدور جوتوں کے ان ڈبوں کو ٹرک سے اتار کر گودام میں بنے کمروں میں رکھنے میں مصروف تھے۔ وہاں بڑی خاموشی لیکن تیزی کے ساتھ کام ہو رہا تھا۔ اور یہ کام شاکر کا خاص آدمی رشید اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا اسی گودام کے ایک کمرے کو آفس کی شکل دے دی گئی تھی جہاں اس وقت شاکر خود موجود تھا وہ فون پر کسی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔

''مال میرے پاس پہنچ گیا ہے تم جب چاہو تمہیں ڈیلیوری مل جائے گی۔'' شاکر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے فون پر کہا اور پھر دوسری طرف سے بولنے والے کی بات سننے لگا۔

''ارے الیاس بھائی! یہ کیسی بات کر دی آپ نے، پہلے کبھی کوئی شکایت کا موقع ملا ہے آپ کو پھر اب کیسی بے اعتباری۔ مال ایک سونا ہے سونا کسی بھی قسم کی ملاوٹ نہیں کی گئی ہے، یوں سمجھیں آج سے پہلے شاید ہی آپ کو ایسا مال چکھنے کو ملا ہوگا وہ بھی اتنے سستے داموں۔'' دوسری طرف سے جانے کیا کہا گیا تھا کہ تسلی کے فقرے بولتا شاکر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''بندہ خادم ہے جناب!'' قہقہے کے آخر میں وہ خاصے خوشامدی لہجے میں بولا تھا، پھر اس نے فون رکھ دیا اب اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثر سے عاری تھا کچھ دیر پہلے جو وہ خوش اخلاقی سے فون پر بات کر رہا تھا اب اس مسکراہٹ کا نام ونشان بھی نہیں تھا بلکہ وہ بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا پھر کچھ سوچ کر اس نے ایک نمبر ملایا اور فون پر بات کرنے لگا۔

☆......☆

شاکر کے بہت سارے دھندوں میں ایک دھندہ ہیروئن کا بھی تھا۔ وہ پڑوسی ملک سے ہیروئن حاصل کرتا اور پاکستان میں موجود ڈیلرز تک پہنچا دیتا۔ اس کے اس کاروبار نے اسے اچھا خاصا دولت کر دیا تھا۔ یہ کام اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی شروع کیا تھا لیکن وہ بہت تیزی سے اوپر جا رہا تھا اور پاکستان میں اس کا نام اس کاروبار میں بہت بار لیا جا رہا تھا۔ اس بار بارڈر پر سختی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کے علاوہ پاکستان میں بھی خاصے سخت اقدامات کیے گئے تھے منشیات کی اسمگلنگ کرنے والے بھی اضطراب کے شکار تھے ان کا کاروبار ایک

طرح سے بند ہو کر رہ گیا تھا، ایسے میں شاکر نے جوتے بنانے والی ایک کمپنی سے رابطہ کیا اور پھر خاص قسم کے جوتے تیار کروائے جن کے تلوے اپنی جگہ سے نکالے جاسکتے تھے اور ان کے اندر اتنی جگہ موجود تھی کہ ہیروئن اچھی خاصی مقدار میں ہر جوتے میں چھپائی جاسکتی تھی۔ تمام کام بہت اچھی طرح ہو گئے تھے اس کے باوجود شاکر کو فکر تھی کہ کہیں اس کا مال کسی طرح پکڑا نہ جائے حالانکہ اس نے ہر طرح کے انتظامات کر لیے تھے جن کی وجہ سے اس کا مال پکڑے جانے سے بچ سکے لیکن پھر بھی فکر ہونا تو بنتا بھی تھا کیونکہ یہ ایک بہت بڑی اسمگلنگ تھی۔ مارکیٹ کا حال دیکھتے ہوئے شاکر نے بڑا ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا تھا، وہ جانتا تھا کہ اس وقت مارکیٹ خالی ہے۔ بڑے بڑے اسمگلرز بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، ایسے میں اگر وہ ہیروئن اسمگل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ مارکیٹ میں اپنی مرضی کی قیمت حاصل کر سکتا تھا اس کا شاطر دماغ بہت تیزی اور ہوشیاری سے سوچا کرتا تھا اس لیے اس نے جوتوں کے ذریعے ہیروئن اسمگل کرنے کا پروگرام بنایا تھا جو کہ کامیاب بھی رہا تھا۔ مال اس وقت اس کے گودام میں موجود تھا اور وہ اپنی شرائط پر مال بیچنے کے لیے فون پر رابطے کر رہا تھا۔ اس روز شاکر بہت خوش تھا۔ منافع اس کے اندازے سے بھی کہیں زیادہ ہوا تھا اور منافع کے علاوہ اس کا نام اس اسمگلنگ کے بعد بہت بڑے ناموں کے ساتھ لیا جانے لگا تھا شہرت ہو یا بدنامی دونوں کا اپنا نشہ ہوا کرتا ہے۔ اور ایسے کاموں میں پڑنے والے لوگ اتنی فکر بھی نہیں کیا کرتے اور وہ بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا' پر یقین رکھا کرتے ہیں۔ شاکر بھی ایسے ہی لوگوں میں سرفہرست تھا۔ ویسے بھی آج کے دور میں بدنام صرف وہ ہوتا ہے جس کے پاس پیسہ نہ ہو پیسہ پاس ہو تو بدنامی بھی شہرت ہی شمار ہوتی ہے اس لحاظ سے شاکر ایک شہرت یافتہ انسان بننے کی سیڑھیاں تیزی سے چڑھ رہا تھا۔

☆......☆

نواب اور اکرم گھر میں گھل مل ضرور گئے تھے لیکن نواب اب بھی زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتا تھا۔ فاطمہ نے ان کا اسکول میں داخلہ کرا دیا تھا۔ لڑکیوں کا اسکول بھی ساتھ ہی تھا۔ پہلے فاطمہ تارا کو اسکول لے کر جاتی تھی، اب ان دونوں کے آنے سے اسے یہ سہولت ہو گئی تھی کہ تارا اُن کے ساتھ ہی اسکول چلی جاتی اور واپسی پر بھی وہ اس ساتھ ہی لے آتے تھے۔ اکرم اور تارا کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی، دونوں اسکول سے واپسی پر ساتھ کھیلتے بھی لیکن نواب ان کے کھیل میں شامل نہ ہوتا تھا۔ اگرچہ تارا اسے اپنے ساتھ شامل کرنے کی پوری کوشش بھی کرتی۔ اکرم اس کے لیے اکرم بھائی بن گیا تھا، وہ واقعی اس سے بہنوں والے لاڈ کرنے لگی تھی اور وہ بھی اس کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتا تھا، نواب البتہ اس کے لیے اب تک نواب ہی تھا۔ اس نے تارا کو اتنی لفٹ ہی نہ کرائی تھی کہ وہ اس سے کوئی رشتہ بنا سکتی۔ البتہ پھر بھی وہ پروانوں کی طرح نواب کے اردگرد منڈلایا کرتی تھی کبھی کبھی نواب کا موڈ اچھا ہوتا یا اسے تارا کی معصوم شکل پر ترس آ جاتا تو وہ اس سے باتیں وغیرہ کر لیا کرتا تھا اور وہ اتنی سی بات پر ہی بہت خوش ہو جایا کرتی تھی۔

☆......☆

اس روز اکرم کو بخار تھا، اس لیے فاطمہ نے اس کی اسکول کی چھٹی کروالی تھی۔ نواب اور تارا روز کی طرح

اسکول سے واپس آ رہے تھے کہ اچانک چار پانچ لڑکے ان کے سامنے آ گئے، ان میں سے ایک تارا کا تایازاد بھائی تھا وہ تارا کو روک کر بات کرنے لگا تو نواب بھی چلتے چلتے رک گیا اور ان کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔

''تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ میں تارا سے بات کر رہا ہوں؟'' تایازاد نے نواب کی طرف دیکھتے ہوئے اکھڑ لہجے میں کہا۔ نواب نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور تارا کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں نے تم سے کہا ہے یہاں سے جاؤ!'' تایازاد نے جواب کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے غصے سے کہا۔

''چلو تارا!'' نواب نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے تارا سے کہا تو وہ خود بھی اس کے کہنے پر چلنے کو تیار ہو گئی اور آگے قدم بڑھایا۔ نواب نے بھی اس کے ساتھ قدم بڑھا کر وہاں سے گزرنا چاہا لیکن تایازاد نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے دھکا دیا، نواب زمین پر گر پڑا۔ باقی لڑکے زور زور سے ہنسنے لگے۔ اسکول سے واپس آئے اور لڑکے لڑکیاں بھی تماشہ دیکھنے کو کھڑے ہو گئے۔ نواب فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے دائیں ہاتھ کا زوردار تھپڑ تارا کے تایازاد کے منہ پر دے مارا، اسے شاید اتنے زوردار جواب کی امید نہیں تھی وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گر پڑا، اس کے دوست حق دوستی نبھانے کو آگے بڑھے اور نواب پر ٹوٹ پڑے۔ نواب بھی نے دو چار لاتیں چلائیں اور مکے مارے لیکن لڑکے کافی زیادہ تھے اور عمر میں بھی نواب سے بڑے اور طاقت ور تھے۔ انہوں نے نواب کو دھنک کر رکھ دیا۔ تارا روتے ہوئے انہیں رکنے کا کہہ رہی تھی لیکن اس کی کس نے سننی تھی۔ جب تک گاؤں کے دوسرے لوگوں نے آ کر نواب کو ان لڑکوں کے ہاتھوں سے چھڑوایا، وہ اچھا خاصا زخمی ہو چکا تھا۔ تماشا دیکھنے والوں میں ایک شخص رستم بھی تھا۔

☆......☆

نواب تارا کے ساتھ گھر پہنچا تو اس کی حالت دیکھ کر فاطمہ پریشان ہو گئی۔ اس کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور ہونٹوں سے اس وقت بھی خون بہہ رہا تھا کپڑوں پر بھی جگہ جگہ خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔

''کیا ہوا تمہیں کس نے کیا یہ سب؟'' فاطمہ نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ جواب میں نواب سے پہلے تارا شروع ہو گئی اور اس نے الف سے ی تک ساری کہانی سنا دی۔

''کیا ضرورت تھی ان کے منہ لگنے کی نظر انداز کر دیتے!'' فاطمہ اس کے زخموں کو صاف کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں ان کے منہ نہیں لگا، وہ خود بدتمیزی کر رہے تھے۔'' معصومیت سے جواب دیتے نواب پر فاطمہ کو ٹوٹ کر پیار آیا تھا اس دم۔ نواب کے دائیں بازو پر بھی گہری چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے اسے اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے تکلیف ہو رہی تھی اسی لیے اس روز فاطمہ نے اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا تھا۔ فاطمہ کے ہاتھ سے کھانا کھاتے ہوئے بار بار کسی خیال سے نواب کی آنکھیں نم ہو جاتیں جنہیں وہ مسکراہٹ کے پردے میں چھپا لیتا شاید اسے ساجدہ کی یاد ستانے لگی تھی۔

☆......☆

رات کو نواب کو ایسا بخار چڑھا کہ اگلا پورا ہفتہ وہ اسکول بھی نہ جا سکا۔ اس دن جسم میں جتنا درد محسوس ہو رہا تھا وہ کچھ بھی نہ تھا جو اس سے اگلے دن محسوس ہوا۔ ظالموں نے بہت بری طرح پیٹا تھا اسے' فاطمہ ان لڑکوں کے گھر جا کر شکایت کر آئی تھی۔ گھر والوں کی طرف سے انہیں ڈانٹ پھٹکار بھی پڑی تھی لیکن بس اس سے آگے انہیں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ فاطمہ کے ساتھ ساتھ تارا کو بھی اپنے تایا زاد اور اس کے دوستوں پر بے حد غصہ تھا۔ بیماری کے اس ہفتے میں تارا نے دل و جان سے نواب کی دیکھ بھال کی تھی۔ وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اس کے سبھی کام کرتی، شاید اس کی اور فاطمہ کی اتنی دیکھ بھال کا ہی اثر تھا کہ نواب اپنے خول سے باہر آ رہا تھا۔ اب اس کی تارا سے گاڑی چھننے لگی تھی۔ اب وہ اکرم اور تارا کے کھیلوں میں بھی شامل ہوا کرتا تھا اور فاطمہ کی کہانیاں بھی شوق سے دلچسپی لے کر سنا کرتا۔

اس روز فاطمہ نے نواب کو سبزی لینے بازار بھیجا، وہ سبزی لے کر پلٹ رہا تھا کہ اس نے کچھ آدمیوں کو آپس میں جھگڑتے دیکھا۔ فطری تجسس کی بنا پر وہ بھی وہاں رک کر انہیں دیکھنے لگا کچھ ہی دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ لڑائی میں ایک طرف صرف ایک آدمی تھا جبکہ دوسری طرف پانچ چھ لوگ تھے نواب کو اس اکیلے آدمی پر ترس آنے لگا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ سب مل کر اس اکیلے آدمی کا کیا حشر کرنے والے ہیں لیکن آنے والا وقت اس کے لیے حیران کن تھا، وہ اکیلا ان سب پر بھاری پڑ رہا تھا وہ ان کے مقابلے میں خاصا دبلا پتلا تھا لیکن انہیں مسلسل مار رہا تھا نواب اسے جانتا تو نہیں تھا لیکن پہچانتا ضرور تھا۔

''ان لوگوں نے رستم سے پنگا لے کر اچھا نہیں کیا۔'' پاس کھڑے آدمیوں میں سے ایک بولا تو نواب کو معلوم ہوا کہ اس تنہا آدمی کا نام رستم ہے جو ان لوگوں کی دھلائی کر رہا تھا۔

''یہ اکیلا اتنے لوگوں کو کیسے مار رہا ہے کہیں فوج وغیرہ میں رہا ہے کیا؟'' دوسرے نے حیرت کا اظہار کیا۔

''فوج میں نہیں رہا ہے بھئی کراٹے ماسٹر ہے، کراٹے ماسٹر!'' پہلے والے نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا جلد ہی لوگوں نے درمیان میں پڑ کر بیچ بچاؤ کرا دیا جھگڑا ختم ہوا تو نواب کو بھی گھر جانے کا خیال آیا اور وہ گھر کی سمت چل پڑا، اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ اسے بازار میں کافی دیر ہو گئی تھی اور فاطمہ گھر پر اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔

☆......☆

رستم بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ زندگی بہت عیش و آرام میں کٹ رہی تھی کہ پھر اچانک اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی، یہاں اس کی اسٹوری میں بڑا فلمی موڑ آیا لڑکی اس کے باپ کے دشمن کی بیٹی تھی خیر محبت دونوں کو اپنا اسیر کر چکی تھی۔ اس لیے گھر والوں کے لاکھ منع کرنے اور دھمکیاں دینے کے باوجود دونوں نے شادی کر لی۔ کچھ عرصہ ہنسی خوشی گزرا ہنی مون سے واپسی پر ہی لڑکی کے باپ نے اپنی نافرمان بیٹی کو قتل کروا دیا جس نے دشمن کے بیٹے سے محبت کر کے اور پھر شادی کر کے اس کی عزت کا جنازہ نکال دیا تھا۔ سوا سے اس کے کیے کی سزا دے دی گئی، لڑکی نے مرتے وقت رستم سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کے قاتلوں سے بدلہ نہیں لے گا بلکہ آرام و سکون سے اپنی زندگی گزارے گا۔ بیوی سے کیے وعدے کی وجہ سے رستم نے بدلہ تو نہیں لیا لیکن شہر اور

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایڈ فری لنکس

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



شہر والوں سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تبھی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس چھوٹے سے گاؤں میں آبسا تھا۔

نواب جب بازار سے لوٹا تھا اس کے اندر ایک نیا عزم پیدا ہو گیا تھا اسے یہ یقین ہو چلا تھا کہ ایک دن وہ اپنے دشمنوں سے بدلہ لے پائے گا۔ بھینسوں کو نہلاتے ہوئے، ان کا چارہ کاٹتے ہوئے حتیٰ کہ کوئی بھی کام کرتے ہوئے لڑائی کرتا رستم اس کے ذہن سے نہیں نکلا تھا جس انداز سے وہ اتنے لوگوں کا مقابلہ کر رہا تھا وہ قابل رشک تھا۔ نواب بار بار ذہن میں اس کے لڑنے کے طریقے کو دہراتا اور اکیلے میں خود بھی اس کا ایکشن دہرانے کی کوشش کرتا۔ اس کے ذہن میں بہت سے خیال بہت سی سوچیں گڈمڈ ہو رہی تھیں لیکن اس نے ابھی تک اپنی سوچ کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا، یہاں تک کہ اس نے اکرم کو بھی اپنے دل کی بات نہیں بتائی تھی لیکن وہ خود ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

☆......☆

اگلے دن دوپہر کو اسکول سے آتے ہوئے وہ بہانے سے اکرم اور تارا سے الگ ہو گیا تھا، ویسے بھی اس روز اسکول سے چھٹیاں ملی تھیں تو وہ دونوں بہت خوش تھے اس لیے انہوں نے نواب سے زیادہ سوال جواب بھی نہیں کیے تھے اور اس طرح نواب ان دونوں سے الگ ہو کر رستم کے گھر کا پتا پوچھتا ہوا اس کے گھر تک آپہنچا تھا، یہ کام اس کے لیے کچھ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا کیونکہ گاؤں میں ویسے بھی لوگ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں اور گاؤں کے لوگوں میں تجسس بھی زیادہ ہوا کرتا ہے جب کوئی اجنبی ان کے گاؤں میں آتا ہے تو وہ اس کے بارے میں جان لینا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور رستم تو وہاں کئی سالوں سے رہ رہا تھا۔ اسے تو سب ہی جانتے تھے اس کی اچھی عادتوں کی وجہ سے اسے بہت سے لوگ پسند بھی کرتے تھے کیونکہ وہ اکثر گاؤں کے لوگوں کی پیسوں سے مدد کرتا رہتا تھا۔ رستم کے گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے نواب کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا دوسری بار دستک دینے پر رستم نے دروازہ کھولا اور اپنے دروازے پر نواب کو دیکھ کر قدرے حیران دکھائی دینے لگا اس نے نواب کو پہچان بھی لیا تھا لیکن اس کا اپنے گھر آنے کا مقصد اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' رستم نے اس کے چہرے کو دھیان سے دیکھتے ہوئے سوال کیا، جہاں اب بھی اس دن والی مار سے لگنے والی چوٹ کے نشان موجود تھے۔

''میرا نام نواب ہے۔'' نواب نے اپنا تعارف کروایا ''تو؟'' رستم نے بے تاثر لہجے میں اپنا سوال دوسرے انداز میں دہرادیا۔

''میں تم سے لڑنا سیکھنا چاہتا ہوں۔'' نواب نے بھی سیدھی بات کرنا مناسب جانا۔

''تم نے کس سے کہا کہ مجھے لڑنا آتا ہے'' رستم نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں نے خود تمہیں اس روز بازار میں لڑتے ہوئے دیکھا ہے اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ مجھے بھی اپنے جیسا بنادو۔'' نواب نے اس دن کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی خواہش کا دوبارہ اظہار کیا۔

''میں تمہیں کچھ نہیں سکھا سکتا تم جاؤ یہاں سے'' رستم نے بے مروتی سے کہتے ہوئے دروازہ بند کرلیا۔

نواب کو اس سے اتنی بداخلاقی کی امید نہیں تھی۔ اس لیے اس کے اس طرح دروازہ بند کرنے پر کتنی ہی دیر حیران

وپریشان بند دروازے کو گھورتا رہا پھر پلٹا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا' رستم کے سرد رویے نے نواب کو مایوس کرنے کے بجائے اس کی آتشِ شوق کو بھڑکا دیا تھا۔

☆......☆

اس دن کے بعد سے نواب نے جیسے اپنا معمول ہی بنالیا تھا، وہ روز رستم کے گھر جاتا اور اس کا شاگرد بننے کی خواہش کا اظہار کرتا۔ رستم انکار کرتا اور وہ واپس چلا آتا۔ اس کی مستقل مزاجی اب رستم کو بھی متاثر کرنے لگی تھی لیکن وہ اسے کراٹے سکھا کر بندر کے ہاتھ میں ہلدی نہیں تھمانا چاہتا تھا۔ رستم نے اس روز نواب کو مار کھاتے دیکھا تھا اور اسے یہی سمجھ آیا تھا کہ نواب ان لڑکوں سے بدلہ لینے کی خاطر کراٹے سیکھنا چاہتا ہے اور کراٹے ایک آرٹ ہے اسے اپنی حفاظت کے لیے سیکھنا جاتا ہے بدلہ لینے کے لیے نہیں یہی سب سوچ کر رستم اسے نظرانداز کر رہا تھا۔

☆......☆

نواب بھی اپنی دھن کا پکا تھا اسے مہینہ ہونے کو آیا تھا اور ان اتنے سارے دنوں میں ایک دن بھی ایسا نہ تھا جب وہ رستم کے پاس جا کر اپنا سوال دہرانا بھولا ہو۔

''تم لڑائی کیوں سیکھنا چاہتے ہو؟'' آخر ایک دن رستم زچ ہو کر پوچھ بیٹھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی خاموشی سے نواب شہ پا رہا ہے۔ اگر اسے ایک بار ڈانٹ کر بھگا دے تو وہ واپس نہیں آئے گا، جواب میں نواب نے اپنی ساری کہانی کہہ سنائی رستم دھیان سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

''اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے جیسا بنا دو تا کہ میں اپنے دشمنوں سے اپنی حفاظت بھی کر سکوں جو میری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور باپ کا انتقام لینے کے قابل بھی ہو سکوں۔'' نواب نے تفصیل سے بتاتے ہوئے آخر میں کہا رستم کے دل پر اس کی باتوں کا کافی اثر ہوا تھا، اتنی سی عمر میں وہ کیا کچھ بھگت چکا تھا دیکھ چکا تھا۔ رستم کو اس پر ترس بھی آیا اور اس کا حوصلہ اور عزم دیکھ کر رشک بھی محسوس ہوا۔

''ٹھیک ہے تم کل سے میرے پاس کراٹے سیکھنے آجاؤ'' رستم کے کہنے پر نواب بے انتہا خوش دکھائی دینے لگا۔

''لیکن ایک بات یاد رکھنا تم کبھی بھی کراٹے کا غلط استعمال نہیں کرو گے، اس بات کا تمہیں عہد کرنا ہوگا۔'' رستم نے مزید کہا اور نواب تو ہر قسم کا عہد کرنے کو تیار تھا۔ سو اگلے دن کا ٹائم طے کر کے وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس روز نواب بہت خوش تھا۔ اسے امید کی ایک ننھی سی کرن دکھائی دینے لگی تھی۔

☆......☆

''لڑائی بھڑائی سیکھنے میں کیا رکھا ہے، تم بس چپ چاپ اپنی پڑھائی کرو جس کے لیے تمہیں یہاں بھیجا گیا ہے۔'' جب نواب نے فاطمہ کو کراٹے کی کلاس کے بارے میں بتایا تو وہ فکرمندی سے کہنے لگی۔ گزرے عرصے میں فاطمہ کو وہ دونوں اور خاص طور پر نواب تارا کی طرح ہی عزیز ہو گیا تھا' اسی لیے وہ اس کے منصوبے سن کر ایک ماں کی طرح پریشان ہو رہی تھی اور اسے سمجھا بھی رہی تھی۔ اس کے سمجھانے کا انداز بالکل ساجدہ

جیسا تھا تھوڑا غصہ تھوڑا پیار اور نصیحت شاید سبھی ماؤں کا انداز ایک سا ہوا کرتا ہے ایسا تھا یا نہیں لیکن نواب کو تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ اسے فاطمہ کی ہلکی پھلکی ڈانٹ اچھی لگ رہی تھی۔ اپنائیت کا احساس دلا رہی تھی۔ لیکن وہ بھی نواب تھا اس نے آخر فاطمہ کو سمجھا ہی لیا تھا کہ کراٹے سیکھنے میں کوئی برائی نہیں ہے اور اس کے حالات ایسے ہیں کہ اسے خود کو مضبوط بنانا ہے۔ وہ مان گئی تھی بس فاطمہ نے اس سے وعدہ نہیں لیا تھا کہ وہ گاؤں کے آوارہ لڑکوں کے منہ نہیں لگے گا اور نواب نے وعدہ کر لیا تھا اس طرح یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا اور اگلے دن سے نواب نے رستم کے پاس جانا شروع کر دیا۔

☆......☆

اگلے ایک سال میں رستم نے نواب کی ٹریننگ مکمل کر دی تھی اور اسے ماہر بنا دیا تھا۔ ٹریننگ پوری ہوتے ہی نواب جنگل میں واپس جانے کو بیتاب ہو گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا جذبہ انتقام کم نہیں ہوا تھا بلکہ کچھ بڑھا ہی تھا، وہ اپنے باپ کے قاتل کو جان سے مارنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اسی لیے جب اس بار اسلم ان سے ملنے گاؤں آیا تو نواب نے اس کے ساتھ جانے کی فرمائش کر دی۔

''جنگل میں واپس جا کر کیا کرو گے؟'' اسلم اس کی اس نافرمانی پر کافی بھنایا ہوا تھا۔

''مزید ٹریننگ لوں گا تاکہ دشمنوں سے انتقام لینے کے قابل ہو سکوں۔'' نواب نے فوراً جواب دیا تھا۔

''دیکھو تم یہاں ایک اچھی زندگی گزار رہے ہو، یہاں سے تھک گئے ہو تو میں تمہیں شہر میں کہیں داخلہ کرا دیتا ہوں جہاں تم اپنا مستقبل بہتر بنا سکو۔'' اسلم نے اس کو سمجھانا چاہا لیکن اس بار وہ بھی ہر بات کا جواب سوچ کے بیٹھا ہوا تھا۔

''ماما جی یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے دشمن میرا پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہیں، میرے پاس دو ہی راستے ہیں یا تو ساری زندگی ان سے چھپتا پھروں اور کسی دن ان کی گولی کا نشانہ بن جاؤں یا پھر اس قابل بن جاؤں کہ ان کا خاتمہ کر کے باقی زندگی سکون سے گزاروں۔ ان میں سے دوسرا راستہ بہر حال بہت بہتر ہے کیونکہ ساری زندگی ڈر ڈر کر گزارنا مجھے قبول نہیں۔'' نواب کی باتوں پر اسلم سوچ میں پڑ گیا تھا کیونکہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، اب بھی اسلم اس لیے گاؤں آیا تھا کیونکہ اسے اطلاع ملی تھی کہ گاؤں میں کچھ مشکوک لوگ دیکھے گئے ہیں، دشمن وہاں تک آ پہنچا تھا، اس اطلاع نے اسلم کو پریشان کر دیا تھا، اسی لیے وہ فوراً گاؤں پہنچا تھا اور اسی لیے اس نے نواب سے شہر شفٹ ہونے کی بات کی تھی۔ دراصل وہ انہیں وہاں سے لے جانے کے لیے ہی آیا تھا لیکن وہ انہیں جنگل نہیں لے جانا چاہتا تھا اور اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نواب اپنے فیصلے میں اٹل دکھائی دے رہا تھا اور اس کی بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی، دشمن کی اس گاؤں میں نقل و حرکت نے اسلم کو بھی یہ بات سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ایک دن نواب کو اپنے دشمن کا سامنا کرنا ہی ہو گا۔ اس روز وہ لوگ واپسی کے لیے روانہ ہو گئے تھے اور اس طرح نواب کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا۔ اس نے کراٹے کی ٹریننگ کے بعد اب جنگل میں اپنے ماما اور اس کے ساتھیوں سے ٹریننگ لینا شروع کر دی تھی۔

☆......☆

کتنے سال ایسے ہی گزر گئے تھے۔ڈارک براؤن بڑی بڑی آنکھیں اورڈارک براؤن بالوں کے ساتھ کشادہ پیشانی والانواب دس سال کالڑکا نہیں رہا تھا بلکہ کڑیل جوان ہو چکا تھا۔اس کے ماتھے پر چاند کی شکل کے ایک زخم کا نشان بہت واضح تھا جو اسے ٹریننگ کے دوران لگا تھا۔لیکن وہ نشان اس کے چہرے کا اس طرح حصہ سا بن گیا تھا کہ وہ دیکھنے والے کو برا نہیں لگتا تھا۔اس وقت وہ سردار کے سامنے ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا تھا۔

''تو تمہیں لگتا ہے کہ تم اب بدلہ لینے کے لیے تیار ہو چکے ہو۔'' سردار نے نواب کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی ہاں سردار!'نواب نے ادب سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے جانے کی تیاری کرو۔'' سردار سے اجازت ملتے ہی نواب اس کے جھونپڑے سے باہر چلا گیا۔اس کے دل کی کیفیت بہت عجیب ہو رہی تھی کسی کی جان لینے کی سوچ سے وحشت ہو رہی تھی تو اپنے باپ کو یاد کر کے نفرت اور غصہ سے اس کا خون ابل رہا تھا اور رگوں میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔

☆......☆

''میں اب بھی یہی کہوں گا کہ تمہیں کام پر جانے کی ضرورت نہیں ہے'' اسلم اتنے سال بعد بھی اس بات کے حق میں نہیں تھا کہ نواب کسی کا قتل کرے۔ڈاکہ مارنا ایک الگ بات تھی لیکن اس نے خود بھی آج تک کسی کا خون نہیں بہایا تھا اور وہ اس بات کا سخت مخالف تھا کہ نواب اس عمر میں قتل جیسا جرم کرے شاید وہ اس کے آنے والے کل کو تاریک ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔اس لیے نواب کو قاتل بننے سے بچانے کے لیے خود قاتل بننے کو تیار ہو گیا تھا۔

''مجھے نہ روک ماما تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے اتنے سال ایک ایک لمحہ آج کے دن کا انتظار کیا ہے۔آج بھی میری آنکھوں کے سامنے میرے باپ کا لہولہان جسم آتا ہے تو رگوں میں خون کی جگہ آگ دوڑنے لگتی ہے اور یہ آگ تبھی ٹھنڈی ہوگی جب میں اپنے باپ کے قاتل کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔ مجھے نہ روک ماما، میں کسی کے روکے سے رکنے والا نہیں ہوں۔'' نواب کا لہجہ ہمیشہ کی طرح دوٹوک تھا۔

''چل تیری بات مانے لیتا ہوں لیکن یہ کون سی عقل مندی ہے جو تو نے بندہ بھیج کر اسے کہلوایا ہے کہ تو اسے قتل کرنے آرہا ہے، یہ تو سیدھا سیدھا خودکشی ہوئی نہ اتنے سالوں میں وہ پہلے سے زیادہ طاقت ور چوہدری بن چکا ہے۔اس اس طرح للکار کر جانا اپنی جان خطرے میں ڈالنا ہے اور میں تجھے اس طرح اپنی جان خطرے میں ڈالنے کی اجازت کبھی نہیں دے سکتا۔'' اسلم کے لہجے میں بڑوں والا مان تھا۔

''چھپ کے دشمن کو مارنا بزدلی ہے ماما، اور میں کچھ بھی ہوں بزدل نہیں ہو سکتا، نواب کے لہجے میں لاپروائی تھی اور اپنی ذات کا فخر بھی۔ اسلم نے بہت محبت اور فخر سے اپنے سامنے کھڑے اس نوجوان کو دیکھا تھا، جس میں اس کی جان بسی ہوئی تھی وہ اس کی بیٹی جیسی بہن کے بھائیوں جیسے دوست کا بیٹا تھا۔

''چل ٹھیک ہے میں نے تیری بات مان لی لیکن ایک بات تو بھی میری مان اکیلا مت جا اور کسی کو نہیں تو

اکرم کو اپنے ساتھ لے جا۔'' اسلم نے اصرار کیا۔

''نہیں ماما اس سفر پر مجھے اکیلا ہی جانا ہوگا۔ یہ میری جنگ ہے مجھے ہی لڑنی ہے یوں سمجھ یہ میرے باپ کا مجھ پر قرض ہے'' نواب نے اتنی عاجزی سے کہا۔ اسلم آگے اور کچھ نہ بول سکا اور چپ چاپ اسے جانے کی تیاری کرتے دیکھتا رہا۔

☆......☆

نواب صبح سویرے اڈے سے نکلا تھا۔ اسلم گاؤں تک اس کے ساتھ آیا اور سارے راستے اسے اپنا خیال رکھنے کا کہنے کے ساتھ ساتھ چوہدری اور اس کے علاقے کے بارے میں اور باتیں بھی بتاتا رہا تھا۔ گاؤں کے پاس پہنچ کر نواب نے اسلم کو اللہ حافظ کہا اور گھوڑے کو وہیں عابد کے پاس اصطبل میں چھوڑ کر گاڑی میں جا بیٹھا جو سردار نے اس کے لیے ہی وہاں کھڑی کروائی تھی۔ سفر کے ساتھ ماضی کے سفر کا بھی آغاز ہو گیا تھا، وہ اتنے سال بعد ان راستوں پر جا رہا تھا لیکن پھر بھی اس وقت کی ایک ایک بات اسے اچھی طرح یاد تھی حتیٰ کہ وہ راستے بھی اسے پوری طرح یاد تھے اس نے گاڑی کی رفتار خاصی تیز رکھی تھی، اسے شام تک دشمن کے گاؤں پہنچنا تھا۔ وہ جان بوجھ کر انہی راستوں سے گزر رہا تھا جن سے گزر کر اسلم ان کو لے کر آیا تھا۔ باپ کے ساتھ ساتھ ماں کی یاد بھی ستانے لگی تھی، اس دن کے بعد وہ دوبارہ کبھی گاؤں نہیں گیا تھا جاتا بھی کس کے لیے اس کا وہاں رہ ہی کون گیا تھا۔ اس خیال پر ایک موہنی سی صورت چھم سے اس کی آنکھوں کے پردے پر لہرا کر غائب ہو گئی۔ 'عالیہ' اس نے ہلکے سے یہ نام لیا اور نام لیتے ہی گویا بچپن تک اس کی صدا جا پہنچی۔ یادیں، باتیں، کھیل، لڑائیاں جانے کیا کچھ جڑا تھا اس کے اس لفظ بچپن سے۔ بچپن سے اس کا ناتا اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب اس کے باپ نے دم توڑا تھا اس کے بعد کی ساری زندگی تو انتقام کی آگ میں جلتے گزری تھی۔

''بس کچھ دیر اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور گہری سانس بھرتے ہوئے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا

☆......☆

نواب نے دشمن کے قریبی گاؤں میں ایک چھپر ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ سامان اس کے پاس کوئی خاص نہیں تھا، جو تھا وہ گاڑی میں رکھا تھا وہ چاہتا تو گاڑی لاک کر کے گاڑی میں آرام کر سکتا تھا لیکن ایسا کرنے سے وہ اور اس کی گاڑی مشکوک ہو جاتی اب وہ سب کے لیے ایک مسافر تھا، جسے راستے میں رات ہو گئی تھی اور وہ رات بسر کرنے کے لیے وہاں ٹھہر گیا تھا۔ اس کا ارادہ آدھی رات کو وہاں سے نکلنے کا تھا۔ گاؤں میں ویسے بھی لوگ جلدی سو جاتے ہیں اور اس چھپر ہوٹل میں اس کے علاوہ اور کوئی مسافر نہیں تھا۔ ہوٹل شام ہوتے ہی بند ہو گیا تھا، اسے ایک چارپائی اور بستر دے دیا گیا تھا کرایہ ایڈوانس دے دیا تھا کیونکہ صبح ہوتے ہی اس نے وہاں سے نکل جانا تھا۔ یہ بات اس نے ہوٹل والوں سے کہی تھی جبکہ حقیقت میں تو اس نے رات ڈھلتے ہی برابر کے گاؤں کی طرف نکل جانا تھا اور کام ہوتے ہی اس علاقے سے۔

☆......☆

نواب اپنے بستر پر لیٹا آسمان پر نظریں جمائے آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جیسے ہی ہوٹل میں اور ہوٹل کے اردگرد سناٹا ہوا وہ اپنے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا ہر طرف اندھیرے کا راج تھا، اس روز چاند بھی بادلوں کے پردے میں چھپا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے یہ نواب کے لیے ایک بہترین رات تھی۔ وہاں کسی کے آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا، پھر بھی نواب نے احتیاطاً چارپائی پر تکیہ سیدھا کر کے رکھ دیا اور اس پر چادر ڈال دی اور اگر کوئی ادھر دیکھتا بھی تو یہی سمجھتا کہ نواب وہاں سویا ہوا ہے۔ کچھ معلومات اسے اسلم نے دی تھیں باقی اس نے دن میں جائزہ لے لیا تھا۔ گاڑی میں سے ایک کپڑے کا تھیلا نکال کر ہاتھ میں تھامتا ہوا وہ تیز تیز قدموں سے ایک سمت بڑھا۔ اس طرف کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹا سا پگڈنڈی نما راستہ تھا جو اسے سیدھا دشمن کے گاؤں لے جاتا۔ پگڈنڈی پر پہنچ کر نواب محتاط لیکن تیز قدموں سے ساتھ والے گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے لیے ایک ایک منٹ بہت قیمتی تھا، وہ چلتے چلتے دشمن کی حویلی کے بارے میں حاصل کی گئی معلومات ذہن میں دہرائے جا رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے تھیلے میں کچھ ضروری چیزیں تھیں جو حویلی کے اندر پہنچنے میں اس کے کام آتیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ مسلسل چلتے رہنے کے بعد وہ مطلوبہ گاؤں میں داخل ہو گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ حویلی کس طرف ہے اس لیے وہ گاؤں میں داخل ہوتے ہی حویلی کی طرف بڑھا۔ اندھیرے کی کالی چادر اس کے لیے مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ حویلی کے چاروں طرف پہریدار کھڑے تھے لیکن رات کے وقت وہ نیند سے بے چین ہو کر اونگھنے لگے تھے، ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا لوری کا کام دے رہی تھی۔ نواب حویلی کے عین سامنے جا کر رک گیا حویلی چوہدری کی زمینوں پر بنی ہوئی تھی، اس لیے حویلی کے چاروں طرف باغ اور کھیت تھے۔ نواب نے کچھ لمحے سوچ بچار کرنے کے بعد اپنا رخ حویلی کے پچھلے صحن کی طرف کر لیا۔ حویلی میں داخل ہونے کے لیے وہ جگہ بہترین تھی۔ حویلی کے پیچھے آموں کا باغ تھا۔ آم کے بڑے بڑے درختوں کے تنے حویلی کے اندر تک جا رہے تھے جن کے ذریعے وہ آسانی سے حویلی میں داخل ہو سکتا تھا۔ آم کے باغ میں پہنچ کر نواب نے محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا اور وہاں کسی انسان کی موجودگی محسوس نہ کر کے اس نے سکون کا سانس لیا۔ نواب ایک درخت کی طرف بڑھا، اس درخت کی شاخیں بڑی ضرور تھیں لیکن اتنی بڑی نہیں تھیں کہ حویلی کے اندر تک جا رہی ہوتیں۔ نواب نے بیٹری کی مدھم روشنی میں باقی درختوں کا جائزہ لینا شروع کیا وہاں شاید جان بوجھ کر شاخوں کو کاٹا گیا تھا کیونکہ کسی بھی درخت کی شاخ اندر تک نہیں جا رہی تھی۔ نواب کچھ سوچتے ہوئے پھرتی سے ایک درخت پر چڑھ گیا اور وہاں سے اس نے حویلی کی بیرونی دیوار پر چھلانگ لگا دی۔ ہلکی سی تھپ کی آواز کے ساتھ وہ حویلی میں پہنچ چکا تھا۔ اب اصل مسئلہ دشمن یعنی چوہدری شاکر کے کمرے میں پہنچنے کا تھا۔ تبھی اچانک چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا۔ پوری حویلی چاندنی میں نہا گئی۔ یہ چاندنی نواب کے لیے فائدہ مند بھی تھی کہ وہ با آسانی حویلی کا جائزہ لے سکتا تھا اور مطلوبہ کمرے تک اس کا پہنچنا بھی آسان ہو جاتا لیکن یہی چاندنی اس کے لیے مسئلہ بھی بن سکتی تھی کیونکہ اب اسے نقل و حرکت میں پہلے سے زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ کیونکہ چاندنی میں وہ دور سے دکھائی دے سکتا تھا۔ دیوار کے قریب پہنچ کر اس نے تھیلے سے رسی نکالی اور اسے زور سے گھما کر بالکونی میں ڈالا، اس کے بعد وہ رسی کی مدد سے بالکونی میں پہنچا

،اس کی معلومات کے مطابق چوہدری کا کمرہ دوسری منزل پر تھا اور آج وہ اپنے کمرے میں اکیلا تھا کیونکہ بڑی بیوی کے نیچے کے پورشن میں رہتی تھی جبکہ چھوٹی والی یعنی دوسری بیوی اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔نواب کی قسمت اچھی تھی کہ اسے ایک کمرے کی کھڑکی کھلی مل گئی تھی۔نواب آہستہ سے کمرے میں داخل ہوگیا کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور وہاں پر کوئی نہیں تھا۔نواب کمرے سے باہر نکل آیا۔باہر سامنے قطار میں بہت سے کمرے تھے،نواب نے کچھ دیر رک کر سوچا اور پھر ایک کمرے کی طرف بڑھا،وہ کمرہ چوہدری شاکر کا تھا۔اس نے دروازہ کھولا تو وہ آسانی سے کھلتا چلا گیا۔کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک کی وجہ سے کافی اچھا محسوس ہو رہا تھا ۔نواب نے نائٹ بلب کی روشنی میں دیکھا۔چوہدری شاکر سامنے بیڈ پر بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔اس کی ٹیبل پر شراب کی بوتل اور ایک گلاس رکھا تھا۔بوتل آدھی خالی تھی جبکہ گلاس میں تھوڑی سی شراب اب تک بچی ہوئی تھی۔چوہدری یقیناً سونے سے پہلے شراب نوشی کرتا رہا تھا تبھی اس کی نیند اتنی گہری تھی کہ نواب کے کمرے میں آنے کی جو ہلکی سی آہٹیں ہوئی تھیں ان سے بھی اس کی نیند پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا اس نے کروٹ تک نہیں لی تھی، دشمن کو سامنے دیکھ کر کئی سال پہلے کا منظر ایک بار پھر نواب کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تو اس کا غصہ عود کر آیا اس نے آگے بڑھ کر چوہدری کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔چوہدری ایک دم اٹھ بیٹھا اور حیرت و غصے سے اسے دیکھتے ہوئے گالیاں بکنے لگا۔

''کون ہو تم اور میرے کمرے میں آنے کی جرات کیسے ہوئی؟''چوہدری شدید غصے میں پوچھ رہا تھا۔ساتھ ہی ساتھ ہاتھ آگے بڑھا کر تکیے کے نیچے سے کچھ نکالنا چاہا لیکن نواب پوری طرح محتاط تھا اس نے اسی ہاتھ کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔گولی چوہدری کی کلائی پر لگی۔اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ پہلے سے زیادہ گالیاں بکنے لگا۔نواب نے آگے بڑھ کر تکیے کے نیچے سے ریوالور اٹھا لیا چوہدری درد سے کراہ رہا تھا۔

''اب تمہارے سوالوں کے جواب دیتا ہوں۔تمہارا پہلا سوال میں کون ہوں تو ڈائیلاگ کافی پرانا ہے لیکن چونکہ درست ہے اس لیے یہی بولنا پڑے گا کہ میں تمہاری موت ہوں اور جہاں تک جرات کی بات ہے تو جرات کا اندازہ تو اب تمہیں ہو ہی گیا ہوگا''نواب نے کرسی اس کے بیڈ کے قریب کھینچ لی اور بڑی فرصت سے بیٹھ کر بات کرنے لگا۔

''تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو میں تو تمہیں جانتا تک نہیں؟''اس سوال کے جواب میں نواب نے سالوں پہلے کے اس دن کی ساری واردات کہہ سنائی اور ساتھ ہی مشتاق کے ساتھ اپنا رشتہ بھی بتایا تو چوہدری کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔

''تو تم نواب ہو تم ہی نے.....''چوہدری نے کہنا چاہا لیکن نواب نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہاں میں نے ہی تمہیں پیغام بھجوایا تھا کہ اپنی حفاظت کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو کرلو لیکن لگتا ہے تمہیں اپنے آپ سے کچھ زیادہ محبت نہیں ہے۔دیکھو میں کتنی آسانی سے تم تک پہنچ گیا ہوں۔''نواب نے اسی لہجے میں کہا۔

''دیکھو میں نے تمہارے باپ کو نہیں مارا تم اس وقت وہیں تھے، مجھے پہچاننے کی کوشش کرو میں ان

آدمیوں میں سے نہیں ہوں جنہوں نے تمہارے باپ کو مارا تھا۔'' چوہدری خوف کے مارے گھگیاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ہاں میں جانتا ہوں تم ان میں سے نہیں ہو بلکہ وہ دونوں تمہارے چمچے تھے، خیر میں چاہتا تو تمہیں نیند میں ہی مار کر چلا جاتا لیکن میں چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے تمہیں معلوم ہو کہ تمہیں کیوں مارا۔ اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' اتنا کہہ کر نواب نے ٹریگر دبا دیا، یکے بعد دیگرے کئی گولیاں چوہدری شاکر کے سینے میں اتر گئیں۔ سائلنسر لگا ہونے کی وجہ سے گولی چلنے کی آواز نہیں ہوئی تھی۔ نواب نے ایک حقارت بھری نظر مرے ہوئے چوہدری شاکر پر ڈالی اور جس راستے سے آیا تھا اسی سے واپس چلا گیا۔

☆......☆

نواب جب واپس اڈے پر پہنچا تو سردار نے اس کی کامیابی کی خوشی میں جشن کا اہتمام کیا۔ سب لوگ خوشیاں منا رہے تھے اور نواب کو لگ رہا تھا کہ اس کے دل سے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا ہے۔ البتہ اس وقت میں اسلم چپ چاپ سا تھا، وہ دل سے ابھی تک اس سب کو قبول نہیں کر پایا تھا۔ یہ جشن شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں تھا جہاں ان کے اپنے گروہ کے لوگوں کے علاوہ شہر کی بڑی بڑی شخصیات موجود تھیں۔ سردار نے خاص طور سے نواب کو ان سب سے ملوایا تھا، انہی میں ایک سیاست دان جمال الدین بھی تھا۔ جمال الدین ایک ایم این اے تھا۔ سیاست کے علاوہ بھی اس کی بڑی شہرت تھی۔ غیر قانونی کاروبار اس کی خاص پہچان تھے۔ جمال اپنے نام کے بالکل الٹ تھا۔ چھوٹے قد گہری سانولی رنگت اور پچکی ہوئی ناک والا جمال خاصا بدصورت آدمی تھا، لیکن اس کی بدصورتی قیمتی گاڑی، مہنگے سوٹ اور کلائی پر بندھی سونے کی گھڑی کے پیچھے چھپ جایا کرتی تھی۔ جمال کا تعلق لوئر کلاس سے تھا لیکن آج وہ شہر کا ایم این اے تھا تو یقیناً اس میں اس کی محنت کے ساتھ ساتھ چالاک اور مفاد پرست فطرت کا بھی ہاتھ تھا۔

☆......☆

انسان کسی بھی جگہ پر ہو جب وہ عروج پر جاتا ہے یا اپنے باس کا چہیتا بنتا ہے تو جہاں کچھ لوگ اس کے ساتھ ہوتے ہیں، اس کی خوشی میں شامل ہوتے ہیں وہیں کچھ لوگ حسد کا شکار بھی ہو جاتے ہیں ایسا ہی کچھ نواب کے ساتھ ہوا تھا، اکرم جو اسلم کا بیٹا اور نواب کا کزن تھا اس کا خاص دوست تھا لیکن ماجد اس سے بے پناہ حسد کرتا تھا۔ ماجد ان دونوں کا ہم عمر ہی تھا اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتا تھا کہ کسی طرح سے وہ نواب کو نیچا دکھا کر سردار کے قریب جا سکے لیکن ابھی تک اس کی ایسی ہر کوشش ناکام ہوتی آئی تھی لیکن کیا یہ کوششیں ہمیشہ ہی ناکام ہونے والی تھیں۔

☆......☆

نواب کے جانے کے بعد شاکر اٹھ کھڑا ہوا، اس نے قریب سائیڈ ٹیبل پر رکھی گھنٹی بجائی اور پھر اپنے کپڑوں کے نیچے پہنی ہوئی بلٹ پروف جیکٹ نکالنے لگا جس کی وجہ سے آج اس کی جان بچ گئی تھی ورنہ نواب نے اسے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ گھنٹی کے جواب میں کمرے کے دروازے پر ملازم نمودار ہوا

۔شاکر غصے میں اس پر چلانے لگا اور سیکیورٹی انچارج کو بلانے کا حکم دیا۔نواب جس دشمن کی موت کا جشن منا چکا تھا وہ زندہ تھا اور بہت جلد یہ بات نواب کو پتہ چلنے ہی والی تھی۔

☆......☆

نواب کو جمال کا پیغام ملا تھا اس نے نواب کو ملنے کے لیے شہر بلایا تھا۔اتفاق سے نواب کو اسی روز شہر بھی جانا تھا۔اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ جمال سے ملنے پہنچ گیا۔ایڈریس جمال کا آدمی پہلے ہی اسے بتا چکا تھا ،ویسے بھی اتنے مشہور انسان کا پتا معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہوا کرتا ہے۔جمال اپنے آفس میں موجود تھا وہاں اور بھی کچھ لوگ تھے جو جمال کے اشارے پر باہر چلے گئے۔اب نواب اور جمال کے علاوہ کمرے میں صرف جمال کا خاص آدمی منشارہ گیا تھا۔جمال نے نواب کو بتایا کہ اس نے ایک آدمی کو اغوا کرانا ہے اس کام کے لیے جمال نے نواب کا انتخاب کیا ہے۔

''مگر آپ تو جانتے ہیں یہ کام ہم نہیں کرتے۔''نواب نے جواب دیا۔

''جانتا ہوں، جانتا ہوں سردار یہ کام نہیں کرتا لیکن تم تو کر سکتے ہو،سوچ لو اس کام میں خطرہ کم ہے اور مال زیادہ۔''جمال کا لہجہ سرسری تھا۔

''چلو ٹھیک ہے میں سردار سے بات کر کے بتاتا ہوں۔''نواب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے اس میں پوچھنا پاچھنا کیا ہے مرد آدمی ہو فیصلے کر سکتے ہو۔''جمال نے ایک اور طرح سے اسے راضی کرنے کی کوشش کی

''بات ٹھیک ہے لیکن پھر بھی ایک بار پوچھنا تو ہوگا نا' میں رابطہ کرتا ہوں آپ سے''نواب نے اب بھی فوری طور پر ہاں نہیں کی۔

''چلو ٹھیک ہے مگر یاد رہے ایسے کاموں میں زیادہ دیر انتظار نہیں کیا جا سکتا''جمال کے تاکیدی انداز پر نواب نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆......☆

سردار نے اس کام میں ہاتھ ڈالنے سے صاف صاف منع کر دیا تھا لیکن نواب نے دلائل دے کر آخر اسے منا ہی لیا،سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ اغوا کسی عورت کا نہیں کیا جا رہا تھا یعنی کسی کی عزت کا کوئی معاملہ نہیں تھا دوسری بڑی دلیل یہ تھی کہ جب مقصد پیسہ کمانا ہی ہے تو پھر ذریعہ ڈاکہ ہو یا اغوا کیا فرق پڑتا ہے خیر کافی دیر بحث مباحثے کے بعد آخر سردار نے نواب کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے اور ساری ذمہ داری بھی اسی کو سونپ کر اس واردات میں اسے بڑا بنایا تھا۔

نواب نے اس کام میں اکرم کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔منصوبہ ان دونوں نے بنایا تھا لیکن معلومات لانے کا کام ماجد کے ذمے لگایا گیا تھا۔ماجد تو ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھا۔نواب سے اس کی حسد اب نفرت میں بدل چکا تھی۔اب ماجد نواب کو صرف سردار کی نظروں میں نہیں گرانا چاہتا تھا بلکہ اپنے راستے سے ہی ہٹانا چاہتا تھا اس لیے اس نے ایک چال چلنے کا فیصلہ کیا۔اگر اس کا پلان کامیاب ہو جاتا تو دو میں سے ایک بات

لازمی تھی یا تو نواب مارا جاتا یا پھر پولیس کے ہاتھ لگ جاتا دونوں ہی صورتوں میں وہ ماجد کے راستے سے ہٹ جاتا تھا، اس کے لیے ماجد نے یہ کیا کہ جن کا بندہ نواب نے اغوا کرنا تھا ان کو سارے منصوبے کی خبر کر دی۔ اس طرح نواب بے خبری میں مارا جاتا اور ماجد پر الزام بھی نہ آتا۔

☆......☆

دوسری طرف اکرم کو ماجد پہلے ہی کھٹک گیا تھا۔ اس نے خود سے معلومات کرائیں اور پھر دونوں نے مل کر ایک نیا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے میں کوئی تیسرا آدمی شامل نہیں تھا اس طرح انہوں نے اپنے نئے منصوبے پر کام کرتے ہوئے اس آدمی کو اغوا کر کے جمال کے پاس پہنچا دیا۔ لیکن اس دوران انہیں اچھی طرح یہ بات کنفرم ہوگئی کہ ماجد نے کیا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بات ایسی نہیں تھی کہ جسے نظر انداز کر دیا جاتا وہ دونوں بہت غصے میں تھے۔

☆......☆

واپسی پر نواب نے ماجد کو دھر لیا ان کے پاس پکے ثبوت تھے ماجد مکر نہیں سکتا تھا اس لیے تھوڑے بہت بہانے بنانے اور انکار کرنے کے بعد آخر اس نے مان لیا کہ اس نے نواب کو پھنسوانے کی کوشش کی تھی۔ قبول کرتے ہی اکرم نے ماجد کو زوردار مکا جڑ دیا۔ ماجد اس کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے پیچھے گر پڑا۔ اس کے بعد اکرم اس پر ٹوٹ پڑا۔ ماجد مسلسل معافیاں مانگے جا رہا تھا آخر اس کے قسمیں کھانے پر کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا نواب نے اکرم کو چھوڑ دینے کا کہا۔ اکرم اسے ایسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا لیکن جب نواب نے سختی سے کہا تو وہ اسے آخری تھپڑ مار کر وہاں سے چلا گیا ''نواب بھائی میں تمہاری منت کرتا ہوں اس بات کی شکایت سردار سے مت کرنا ورنہ وہ مجھے جان سے مار دے گا۔'' ماجد نے ہونٹوں سے بہتا خون آستین سے پونچھتے ہوئے نواب سے التجا کی۔ جس پر نواب نے اسے گھور کر دیکھا پھر اس کی مسکین شکل دیکھ کر کچھ بھی کہے بنا وہاں سے چلا گیا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ نواب نے ماجد کی التجا قبول کر لی تھی۔

☆......☆

ان کے جانے کے بعد ماجد نے غصے اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا تھا۔

''تم لوگوں کو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ یاد کرو گے ماجد پر ہاتھ اٹھایا تھا'' وہ غصے سے زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ ماجد وہاں سے سیدھا اپنے جھونپڑے میں آ گیا اور ایک تھیلے سے دوائیاں وغیرہ نکالنے لگا تاکہ اپنے زخموں کی مرہم پٹی کر سکے اس کے پورے بدن میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس نے درد کی دو گولیاں منہ میں ڈالیں اور پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

☆......☆

ماجد ابھی مرہم پٹی سے فارغ ہوا تھا کہ سردار کا بلاوا آ گیا۔ وہ منہ بناتا ہوا اٹھا اور سردار کے جھونپڑے کی طرف بڑھا۔ اندر سردار کے علاوہ نواب اور اکرم بھی موجود تھے ان دونوں کو دیکھ کر ماجد کا ماتھا ٹھنکا کہ شاید سردار کو سب کچھ بتا دیا گیا ہے اور جب سردار نے بات شروع کی تو ماجد کینہ توز نظروں سے نواب کو دیکھنے لگا جو اکرم کو

دیکھ رہا تھا۔

''تم نے جو جرم کیا ہے اس کی سزا موت کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی لیکن چونکہ نواب ایسا نہیں چاہتا اس لیے تمہیں بس یہی سزا دے رہا ہوں کہ ابھی اور اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ اور مڑ کر کبھی ادھر دیکھنا بھی مت، آج کے بعد ہمارے گروپ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔'' سردار کی آنکھوں سے قہر ٹپک رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ماجد کو اسی وقت گولی مار دے لیکن نواب کی وجہ سے برداشت سے کام لے رہا تھا۔ ماجد کو سمجھ آ گئی تھی کہ اب کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔ اس لیے وہ اسی وقت اپنے جھونپڑے میں گیا اور اپنا ذاتی ضروری سامان سمیٹنے لگا۔ اس کا سینہ انتقام کی آگ سے دہک رہا تھا۔

☆......☆

ماجد کے جانے کے بعد سردار نے نواب اور اکرم کو بھی وہاں سے بھیج دیا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا پھر بھی تم نے سردار سے بات کی'' باہر نکلتے ہی نواب اکرم سے مخاطب ہوا۔

''دیکھ بھائی میں تو نہ تیرے جیسا بڑے دل والا ہوں اور نہ ہی اتنا سخی کہ غدار کو ایسے ہی جانے دوں۔'' اکرم نے جواب دیا۔

''اس نے معافی مانگ لی تھی نا یار اور پھر دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنے کی قسم بھی تو کھائی تھی۔'' پتا نہیں نواب واقعی اتنا رحم دل تھا یا آج ہو رہا تھا جو بھی تھا وہ یہ سب نہیں چاہتا تھا شاید وہ ماجد کی اس حرکت کی وجہ کو اس کی نفسیات کو سمجھ رہا تھا اسی لیے نظر انداز کر رہا تھا جو بھی تھا اب ماجد وہاں سے ہمیشہ کے لیے جا چکا تھا۔

☆......☆

اس واقعہ کے بعد کچھ دن بعد ہی ایک گاؤں میں ڈاکے کا پروگرام تھا۔ سب تیاریاں مکمل تھیں سب کچھ پلان کے مطابق ہو رہا تھا جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو سارا گاؤں خاموشی کی چادر میں لپٹا ہوا تھا مگر اچانک ان پر فائرنگ ہونے لگی۔ سردار کے علاوہ بھی دو لوگ فائرنگ کی زد میں آ گئے تھے ادھر سے بھی جوابی فائرنگ کی گئی اور سبھی ڈاکو اپنے زخمی ساتھیوں کو اٹھا کر فائرنگ کرتے ہوئے وہاں سے پلٹ گئے زخمیوں کو جلد از جلد طبی امداد دینا ضروری تھا ان کے گھوڑوں کا رخ اپنے اڈے کی طرف تھا۔

☆......☆

سردار کی زندگی کا یہ پہلا ڈاکہ تھا جہاں اسے اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا سبھی کے ذہنوں میں ایک سوال گونج رہا تھا کہ ''غلطی کہاں ہوئی اور کس سے ہوئی؟ کیا پلاننگ میں کوئی کمی رہ گئی تھی؟ یا غداری ہوئی تھی'' یہ آخری بات بالکل ٹھیک تھی دراصل ہوا یہ تھا کہ جب اس ڈاکے کا پلان بنایا گیا تھا اس وقت تک ماجد بھی اس گروپ کا حصہ تھا اور اسے اس ڈاکے کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا اس نے خود کو گروپ سے نکالے جانے کی بے عزتی کا بدلہ اس طرح لیا تھا کہ سردار کے پلان کی خبر گاؤں کے نمبردار کو کر دی تھی اس لیے وہ سب اس حملے کے لیے پہلے سے تیار تھے۔

☆......☆

جب اڈے پر جا کر زخمیوں کو گھوڑوں سے اتارا گیا تب معلوم ہوا کہ زخمی ہونے والوں میں صرف سردار ہی تھا جو ابھی تک زندہ تھا باقی جانے کب زندگی کی قید سے آزاد ہو چکے تھے۔ سب میں دکھ کے ساتھ غم وغصہ پایا جاتا تھا لیکن نواب کا دکھ اور غصہ سب سے جدا تھا۔ سردار اس کے لیے صرف سردار نہیں تھا اس نے ہمیشہ ایک باپ کی طرح اس کی سرپرستی کی تھی اس وقت سردار کے زخموں کا معائنہ کرتا ہوا نواب دل ہی دل میں بے حد پریشان تھا۔ سردار کی حالت اچھی نہیں تھی۔ گولیاں اس کے پیٹ میں اس طرح لگی تھیں کہ نقصان بہت زیادہ ہوا تھا خون بھی کافی بہہ چکا تھا۔

''سردار یہ سب اس ماجد کی غداری کی وجہ سے ہوا ہے'' سردار نے کراہتے ہوئے سوال کیا تو نواب نے آگے بڑھ کر جواب دیا کیونکہ ایک وہی تھا جو ساری حقیقت جانتا تھا کیونکہ اس نے گاؤں والوں کے درمیان ماجد کو دیکھا تھا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ غدار کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی اگر اس دن اسے سزا دے دی جاتی تو آج یہ سب نہ دیکھنا پڑتا'' اکرم غصے سے کہہ رہا تھا اس کا مخاطب یقیناً نواب تھا جس نے ماجد کی جاں بخشی کرائی تھی۔ اس وقت تک وہ یہ سمجھتا تھا کہ ماجد کی دشمنی صرف اس کی ذات سے ہے لیکن یہ تو اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس طرح پورے گروہ کی جان کو خطرے میں ڈال سکتا ہے، لیکن ماجد ایک چوٹ کھایا ہوا سانپ تھا اور ایسے سانپ سے کسی بھی حرکت کی امید رکھنی چاہیے۔''

''تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں، میں نے اس کے اس کے انجام تک پہنچا دیا ہے۔'' نواب کی بات پر وہ جاتا جاتا رک گیا اور سردار کے پاس بیٹھ کر دوسرے لوگوں کو اس کی مرہم پٹی کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

''میرا وقت پورا ہو چکا ہے، مجھے اب جانا ہوگا لیکن میں تم لوگوں سے ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔'' سردار نے کراہتے ہوئے اٹک اٹک کر جملہ پورا کیا۔ سب لوگ سردار کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے اسے بولتا دیکھ کر سب خاموش ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''میں چاہتا ہوں میرے بعد نواب اس گروہ کا سردار بنے اگر کسی کو اعتراض ہے تو بتائے؟'' سردار نے اسی طرح اٹک اٹک کر اپنا جملہ پورا کیا اس کی حالت اور بگڑ چکی تھی۔ خون روکنے کی کوشش ناکام جا رہی تھیں، ایسے میں جن لوگوں کو چھوٹے موٹے اعتراضات تھے بھی تو انہوں نے خاموشی سے سردار کی مرضی کو اس کا حکم سمجھ کر مان لیا۔ نواب ہر چیز سے بے نیاز سردار کا چہرہ تکے جا رہا تھا اور لحظہ لحظہ اسے زندگی سے دور اور موت سے قریب جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''ہمیں سردار کا ہر فیصلہ قبول ہے۔'' سب نے یک آواز ہو کر کہا یہ سن کر سردار کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سردار کا ہاتھ نواب کے ہاتھوں میں تھا۔ سردار نے نواب کی طرف دیکھا مسکرایا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا ''تم میرے بیٹے ہو سب کا خیال رکھنا'' یہ سردار کی زبان سے ادا ہونے والے آخری الفاظ تھے ان کے بعد اس پر غشی طاری ہو گئی اور غشی کی حالت میں ہی وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔

☆......☆

نواب نے دور دراز گاؤں میں بھی ڈالے مارنے شروع کر دیے ہر کامیاب ڈاکے کے بعد اس کا نام اور خوف دور دور تک پھیل جاتا۔نواب دن بہ دن علاقے سے باہر بھی مشہور ہوتا جا رہا تھا لیکن یہ ڈاکو ہونے کے باوجود اس کی زندگی کے کچھ اصول تھے جن کا وہ پابند رہتا تھا اس میں ایک اصول لوٹ مار صرف روپے پیسے اور زیور تک محدود رکھی جاتی تھی۔عورتوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔دوسرا بلاوجہ قتل و غارت کے خلاف تھا اس لیے لوگ اس سے خوفزدہ ہونے کے باوجود دل ہی دل میں کہیں نہ کہیں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات بھی رکھتے تھے۔یوں ہر گزرتے دن کے ساتھ نواب کی شہرت کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔کیا شہر کیا گاؤں ہر جگہ لوگ اسے اس کے نام سے جانتے تھے اور اس کی باتیں کرتے تھے نواب کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہو گئی تھیں اور لوگ ان پر یقین کرتے تھے۔

☆......☆

جمال کے ساتھ نواب کا رابطہ مستقل تھا اور اسی حوالے سے منشا سے بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی جو کہ جمال کا خاص آدمی تھا اس لیے کوئی بھی کام ہوتا اس کی موجودگی لازمی ہوتی تھی۔جمال اور نواب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے جا رہے تھے۔دونوں ایک دوسرے کی ضرورت تھے۔نواب نے ایک کام یہ کیا کہ شہر میں چھوٹا سا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس اسٹارٹ کر دیا۔دیکھتے ہی دیکھتے بزنس بڑھتا چلا گیا۔نواب زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اس نے صرف اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی کیونکہ آگے اس کے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے تھے جن میں تعلیم حاصل کرنا ممکن نہ تھا قسمت نے اسے اسکول سے اٹھا کر جنگل میں پہنچا دیا تھا اور حالات نے اس کے ہاتھ سے قلم لے کر بندوق تھما دی تھی۔زیادہ تعلیم نہ ہونے کے باوجود اس میں کاروبار کی سمجھ بوجھ تھی باقی کی آسانی تجربہ کار منیجر نے پوری کر دی اور نواب کا بزنس دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔اب نواب کی ایک پہچان یہ بھی تھی وہ ایک ابھرتا ہوا بزنس مین تھا جو حیرت انگیز تیزی سے ترقی کر رہا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا تھا۔

☆......☆

بہت دن سے نواب کا دل مچل رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کے گاؤں جائے جا کر ماں کی قبر کی مٹی کو چومے اور فاتحہ پڑھے جب اس نے اسلم سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن اپنی تسلی کے اور نواب کی حفاظت کے خیال سے اکرم کو ساتھ لے جانے کا کہا تھا جس پر ظاہر ہے نواب کو کوئی اعتراض نہیں تھا اکرم خود بھی اپنے گاؤں جانا چاہتا تھا۔دونوں نے اپنا ضروری سامان ساتھ لیا اور اسلم کو پیچھے ساری ذمے داری سونپ کر اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆......☆

نواب اور اکرم سارا راستہ ان دنوں کی یاد میں کھوئے رہے تھے جو انہوں نے گاؤں میں گزارے تھے۔ بچپن تو ہمیشہ ہی خوبصورت لگا کرتا ہے مگر ان کے لیے وہ دن کچھ زیادہ ہی خاص اہمیت رکھتے تھے کیونکہ اس کے بعد ان کی زندگی بالکل بدل گئی تھی۔پرانی باتیں دہراتے ہوئے ان کی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ

تھی۔

گاؤں میں داخل ہونے کے بعد وہ سیدھا قبرستان گئے۔ اسلم گورکن کو باقاعدگی سے پیسے بھیجتا رہتا تھا تاکہ وہ ساجدہ کی قبر کی دیکھ بھال کرتا رہے اور اتنے روپے صرف ساجدہ کی قبر کی دیکھ بھال کے لیے ہی اسے ملتے تھے۔ اس لیے جب نواب نے گورکن سے ساجدہ کی قبر کے بارے میں سوال کیا تو وہ انہیں فوراً ہی وہاں لے گیا تھا۔ دونوں چپ چاپ کتنی دیر قبر کے قریب بیٹھے دل ہی دل میں ساجدہ سے باتیں کرتے رہے۔ دونوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اس وقت وہی دس بارہ سال کا چھوٹا بچہ لگ رہا تھا جس کی ماں اس سے بچھڑ گئی تھی۔ کافی دیر آنسو بہانے کے بعد جب دل کو ذرا صبر آیا تو وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔

جس وقت وہ اپنے گھر میں داخل ہوئے دوپہر ڈھل رہی تھی۔ گھر کا دروازہ کھلتے ہی ڈھیر ساری یادوں نے ان کا استقبال کیا تھا گھر پوری طرح گردوغبار میں اٹا پڑا تھا۔ کافی دیر تک وہ گھر کو جھاڑنے پونچھنے میں لگے رہے' آخر گھر اس قابل ہو گیا کہ وہاں رہا جا سکتا تھا لیکن اس وقت تک دونوں کافی تھک چکے تھے۔ انہوں نے آتے ہوئے راستے میں کھانا کھایا تھا اس لیے ابھی انہیں بھوک نہیں تھی۔ دونوں کے کچھ دیر آرام کا سوچا اور لیٹ گئے۔ ارادہ تو تھا سو جائیں گے لیکن دونوں ہی چپ چاپ لیٹے ماضی کی بھول بھلیوں میں کھوئے رہے۔

یونہی سوچتے سوچتے نواب کی سوچیں عالیہ کی طرف مڑ گئیں۔ وہ بے اختیار سوچے چلا گیا۔ عالیہ کی باتیں اس سے کیے گئے وعدے، آخری ملاقات میں عالیہ کا رونا اور اسے جانے سے روکنا سب کچھ اسے یاد آئے جا رہا تھا۔ آخر وہ بستر سے اٹھ بیٹھا، نواب نے ایک نظر آنکھیں بند کر کے لیٹے اکرم کو دیکھا اور پھر اٹھ کر اس چھوٹے سے کمرے میں چلا آیا جہاں اس کا زیادہ تر وقت گزرا کرتا تھا، وہاں جھلنگا سی چارپائی بھی پڑی تھی جس پر لیٹ کر وہ مشتاق کے آنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ وہیں چارپائی پر جا بیٹھا اور پھر ٹانگیں لٹکائے لٹکائے پیچھے لیٹ گیا، اسے ایسا لگا جیسا کہ وہ ماں کی گود میں آ گیا ہو۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور شاید وہ سو ہی جاتا جب دروازہ کھول کر اکرم وہاں چلا آیا

''یہاں کیوں لیٹے ہوئے ہو'' اکرم کے پوچھنے پر وہ غنودگی سے نکل آیا۔

''جاگ گئے تم؟'' نواب نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں سویا ہی کب تھا یار جو جاگتا'' اکرم نے جماہی لیتے ہوئے جواب دیا

''اچھا تو میں تو یہی سمجھا کہ تو سو گیا ہے۔'' نواب نے کہا تو اکرم نے نفی میں سر ہلا دیا دونوں اٹھ کر صحن میں چلے آئے۔

''چلو یار چوہدرائن سے مل کے آتے ہیں۔'' نواب نے اچانک ہی وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''اس وقت؟ صبح چلیں گے'' اکرم کا کہیں جانے کا دل نہیں کر رہا تھا اس لیے سستی سے کہنے لگا۔

''تیرا موڈ نہیں ہے تو رہنے دے میں ہو آتا ہوں۔'' نواب جانے کے لیے تیار کھڑا تھا لیکن اکرم کی شکل سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ نہیں جانا چاہتا اس لیے نواب نے یہ بات کی۔

''چل ٹھیک ہے پھر تو ہو آ میں کل چلا جاؤں گا۔'' نواب نے اس کے دل کی بات کی تھی اس نے فوراً سے پہلے مان لی۔ گھر کی صفائی سے فارغ ہو کر وہ کچھ دیر پہلے ہی نہائے
تھے اپنے حلیہ پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے نواب بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا جبکہ اکرم بڑے کمرے کی طرف چلا گیا۔

☆......☆

جانی پہچانی گلیوں سے ہوتا ہوا نواب حویلی کی طرف بڑا۔ حویلی میں کئی تبدیلیاں دکھائی دیں، وہ پہلے سے زیادہ شاندار ہو گئی تھی۔

''کون ہو تم؟ کس سے ملنا ہے؟'' نواب ابھی حویلی کے بڑے گیٹ کے سامنے کھڑا حویلی کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک ملازم آ کر پوچھنے لگا۔

''مجھے چوہدرائن سے ملنا ہے'' ابھی ملازم کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ ایک خوبصورت سی لڑکی نے ملازم سے پوچھا۔

''کیا بات ہے کاکا؟'' نواب اس سریلی آواز پر بے اختیار مڑا سفید گلابی رنگت، لائٹ براؤن لمبے سلکی بال جو اس وقت بھی کھلے ہوئے اس کے کاندھوں پر پڑے ہوئے تھے۔ ان کے سرے قدرتی طور پر گھنگھریالے تھے۔ بڑی بھوری آنکھیں جن کی پلکیں اوپر کی طرف مڑی ہوئی تھیں۔ سرخ ہونٹ، دائیں گال پر ڈمپل، مغرور کھڑی ناک، بیضوی چہرہ اور متناسب بدن والی وہ لڑکی قدرت کا شاہکار تھی' نواب بے اختیار ہی سے دیکھے گیا۔

''کون ہے یہ؟'' نواب کے اس طرح دیکھے جانے پر لڑکی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئی تھیں اور حکمیہ لہجے میں ناگواری سمٹ آئی تھی۔

''میرا نام نواب ہے میں چوہدرائن سے ملنے آیا ہوں۔'' نوکر سے پہلے نواب نے جواب دے دیا، نواب کا نام سن کر لڑکی چونکی اس کے چہرے کے تاثرات تیزی سے تبدیل ہوئے۔

''کیا تم وہی نواب ہو جو سالوں پہلے یہاں سے چلا گیا تھا؟'' لڑکی نے پوچھا

''ہاں میں وہی ہوں'' نواب اس کیفیت سے لطف اٹھاتا ہوا زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا تو لڑکی کے چہرے اور لہجے سے ناگواری لمحوں میں اڑن چھو ہو گئی۔

''اماں تو ابا کے ساتھ دوسرے گاؤں گئی ہوئی ہے'' لڑکی کے اس فقرے نے نواب کو تصدیق ہو گئی کہ وہی عالیہ ہے۔

''اچھا ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔'' دل تو کر رہا تھا کہ وہیں کھڑا رہے لیکن نواب نے دل کو سمجھایا اور جانے کے لیے مڑا۔

''واپس کب آئے؟'' پیچھے سے عالیہ نے پوچھا۔

''آج ہی!'' نواب نے پلٹے بنا جواب دیا کیونکہ پھر عالیہ کے چہرے سے نظر ہٹانا مشکل ہو جاتا تھا۔

''کب تک ہو یہاں؟'' عالیہ نے دوسرا سوال کیا۔
''چوہدرائن سے مل کر ہی واپس جاؤں گا۔'' وہ غیر ارادی طور پر کہہ گیا حالانکہ اس کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔
''اماں تو دو دن بعد آئے گی۔'' عالیہ نے اطلاع دی تو نواب بنا کچھ جواب دیئے سر ہلا کر آ گیا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے دور ہوتا جا رہا تھا، اس بات سے بے خبر کی دو بھوری آنکھیں اس کی چوڑی پشت پر جمی ہوئی تھیں۔
حویلی سے واپسی پر وہ سیدھا گھر جانے کے بجائے گاؤں کی گلیوں میں گھومتا رہا اور جب وہ گھر پہنچا تو اکرم شدت سے اس کا منتظر تھا۔
''کہاں رہ گئے تھے یار اتنی دیر کر دی'' اکرم نے اسے دیکھتے ہی کہا۔
''بس یار حویلی سے واپسی پر گاؤں کا چکر لگانے چلا گیا تھا، تم کیوں اتنے بے چین ہو رہے ہو؟'' نواب نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔
''مجھے بھوک لگی ہے یار چل ہوٹل پر چلتے ہیں اس سے پہلے کہ ہوٹل بھی بند ہو جائے'' اکرم کے کہنے پر نواب کو بھی احساس ہوا کہ کھانا کھائے بہت گھنٹے گزر گئے تھے۔ نواب کی بھوک پیاس تو عالیہ کی یادوں میں کھو کر اڑ گئی تھی لیکن اکرم کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ دونوں بیرونی دوازے کی طرف بڑھے تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں نے حیران اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں یہاں ہمارے پاس کون آ سکتا ہے؟ پھر خیال آیا شاید کوئی یہ دیکھنے آیا ہو کہ اس گھر میں اتنے سال بعد کون آیا ہے۔ نواب نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو بڑی سی ٹرے ہاتھ میں پکڑے حویلی کا ملازم کھڑا تھا۔ حویلی سے ان کے لیے کھانا آیا تھا۔ نواب نے ٹرے پکڑ کر دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ دونوں کو اس میز بانی پر خوشگوار حیرت نے گھیر لیا امید نہیں تھی کہ کوئی اتنا خیال کرے گا۔
''تم تو کہہ رہے تھے چوہدرائن گاؤں میں نہیں ہے پھر یہ مہربانی کس کی طرف سے ہوئی؟'' کھانا کھاتے ہوئے اکرم کو خیال آیا تو پوچھنے لگا اس سوال پر نواب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔
''ہے ایک نیک دل پری اسی نے بھیجا ہوگا!'' نواب نے اسی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''اوہو اس نیک دل پری کا نام کہیں عالیہ تو نہیں؟'' اکرم نے بھی مسکراتے ہوئے سوال کیا۔
''ارے تمہیں یاد ہے اب تک؟'' نواب نے پوچھا۔
''بچپن کے ساتھی کہاں کسی کو بھولتے ہیں یار'' اکرم نے نوالہ لیتے ہوئے جواب دیا'' نواب نے اکرم کو صرف یہ بتایا تھا کہ چوہدرائن گھر پر نہیں تھی۔ عالیہ سے ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا لیکن اب وہ بھانپ گیا تھا کہ یقیناً نواب اور عالیہ کی ملاقات ہو چکی ہے۔ نواب جب سے واپس آیا تھا مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جدا ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ اس مسکراہٹ پر وہ پہلے بھی چونکا تھا مگر اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ نواب کی اس مسکراہٹ کے پیچھے عالیہ ہی ہے۔

''لگتا ہے تمہیں بہت اچھی لگ گئی ہے!'' اکرم نے دل میں آئی بات کوسوال بنا کر پیش کر ہی دیا۔

''پتا نہیں یار، بس جب سے اس کو دیکھا ہے آنکھوں کے سامنے سے اس کی تصویر نہیں ہٹ رہی!'' نواب آج بہت عاشقانہ موڈ میں لگ رہا تھا اور ایسا پہلی بار تھا کہ اکرم نواب کے منہ سے اس قسم کی باتیں سن رہا تھا۔

''یعنی عشق کی علامات ظاہر ہونا شروع ہوگئی ہیں اب اللہ ہی خیر کرے گا!'' اکرم کے کہنے پر نواب کچھ جواب دیئے بنا پھر سے مسکرانے لگا تو اکرم دل ہی میں اس کی مسکراہٹ قائم رہنے کی دعا مانگتے ہوئے خود بھی مسکرا دیا تھا۔

اگلی صبح وہ دونوں ابھی جاگے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اس بار ان کے دونوں کے ذہن میں تھا کہ شاید حویلی سے کوئی آیا ہو۔ اس بات بھی نواب نے جا کر دروازہ کھولا رات والا ملازم ٹرے پکڑے ہوئے کھڑا تھا جس میں ان دونوں کے لیے ناشتہ تھا، اکرم رات والے برتنوں کی ٹرے اٹھالیا اور ملازم کو تھماتے ہوئے حویلی جا کر شکریہ ادا کرنے کو کہا۔ ملازم سر ہلا کر چلا گیا تو وہ دونوں واپس کمرے میں آ گئے اور ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کرنے بیٹھ گئے۔

''لگتا ہے دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی'' اکرم نے شرارت سے کہا۔

''ضروری نہیں ہے یار یاد رکھ چوہدرائن کی بیٹی ہے، اس نے یہی سب سیکھا ہے مہمان نوازی، اور لوگوں کا خیال رکھنا'' نواب خواہ مخواہ خوش فہمیوں میں پڑنے والا انسان نہیں تھا، اس لیے اب بھی حقیقت پسندی سے کام لے رہا تھا، لیکن اکرم کو اپنی بات کے سچ ہونے کا پورا پورا یقین تھا اس کا کہنا تھا کہ وہ لوگ چوہدری کے مہمان نہیں ہیں اپنے گھر آئے ہوئے ہیں اور اس کا دل کہتا تھا کہ عالیہ کی اس مہربانی کے پیچھے اس کی تربیت کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ یہ اور کچھ نواب سے محبت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ نواب اس کی باتوں پر دھیرے دھیرے مسکراتا ہوا ناشتہ کرتا رہا اور دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ اکرم کی کہی باتیں سچ ہوں کیونکہ پچھلی ساری رات عالیہ کے تصور نے اسے چین سے سونے نہیں دیا تھا۔ تھوڑی بہت دیر کے لیے آنکھ لگ بھی جاتی تو خواب میں بھی عالیہ کو دیکھتا تھا۔ عالیہ بری طرح اس کے اعصاب پر سوار ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی نہ تو وہ یہ جانتا تھا کہ عالیہ کی اس کے بارے میں کیا رائے اور نہ اس عشق کے انجام سے ہی واقف تھا۔ ابھی تو نئی نئی محبت کا نشہ تھا اور بس، اس نشے کے آگے سب کچھ چھپتا چلا جا رہا تھا۔ اکرم کی باتوں سے انکار کرنے کے باوجود نواب کی حقیقت پسندی بھی دھندلانے لگی تھی اور اس کا دل اسے یقین دلا رہا تھا کہ اکرم کی کہی ساری باتیں اس کے سارے اندازے بالکل سچ ہیں عالیہ بھی اس کی محبت میں مبتلا ہوگئی ہے جس طرح وہ پہلی نظر کی محبت کا شکار ہوا ہے۔ عالیہ کا دل بھی اس ایک ملاقات میں اس کا ساتھ چھوڑ بیٹھا ہے۔

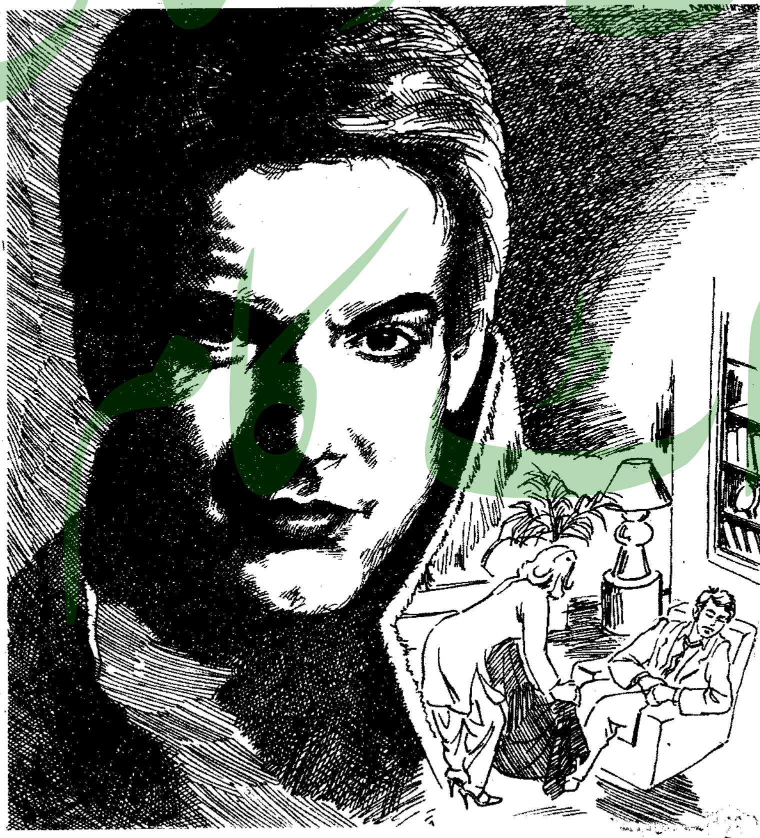
اس سنسنی خیز ناول کے باقی واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے!

اس ماہ کی عبرت اثر کہانیاں

بَد کا انجام بُرا

سید ملازم حسین شیرازی

بدی کے راستے کو چھوڑنے اور اپنانے والوں کا قصۂ عبرت



مسز ثروت سے اکثر پریس کلب میں ملاقات رہتی تھی۔ ۴۵/۴۰ سال کے پیٹے میں تھیں، ایرانی النسل تھیں ملنسار اور نفیس خاتون تھیں وہ فری لانسر صحافی تھیں۔ گلف نیوز و دیگر غیر ملکی اخبارات و رسائل کے لیے لکھتی تھیں کبھی کبھی میرے آفس کلفٹن بلیک کافی پینے جاتی تھیں۔

ہمارے رشتے کی بنیاد ادب میں باہمی دلچسپی اور خلوص پر مبنی تعلقات تھے۔ میں ان دنوں کراچی میں تنہا رہتا تھا اور کراچی اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کے کام کے علاوہ کنسٹرکشن کا کاروبار کرتا تھا، جس کا دفتر کلفٹن میں تین بیڈ رومز کے فلیٹ پر مشتمل تھا۔ ایک بیڈ روم میں میرا اپنا شیئرز سسٹم تھا' دوسرے بیڈ روم کو کنسٹرکشن کے کام کے لیے استعمال میں لایا گیا تھا جس میں بلڈرز، انجینئرز وغیرہ کام کرتے تھے جبکہ تیسرے بیڈ روم میں میری رہائش تھی، ڈرائنگ روم اور لاؤنج مہمانوں اور کلائنٹس کے لیے مختص تھے۔

وہ گرمیوں کے دن تھے جب ایک بجے دوپہر مسز ثروت میرے آفس آئیں اور دعا سلام کے بعد کہنے لگیں

''حسین صاحب آپ کو تھوڑی تکلیف دینا چاہتی ہوں' میری ایک دوست مسز ظافر ہیں جو فریئر ہال کینٹ کے سامنے ایک وسیع وعریض بنگلہ میں رہتی ہیں' کافی عرصے بعد پاکستان آئی ہیں ان کے خاوند مسٹر ظافر فالج کے مریض ہیں' وہ اپنے بنگلے کے پچھواڑے سرونٹ کوارٹر بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں، اگر آپ جگہ ملاحظہ کریں اور تخمینہ بتائیں تو میں شکر گزار ہوں گی۔''

''وہ تو صحیح ہے لیکن میرے بلڈرز آج کل چھٹی پر ہیں، بہر حال میں خود جگہ دیکھ لوں گا۔ کوشش کروں گا کہ اس کی Requirements پوری کروں۔'' میں نے بہت خلوص کے ساتھ کہا تھا۔

''شکریہ حسین صاحب، کیا ایسا ممکن ہے کہ کل میں آپ کے آفس آؤں اور ہم ساتھ چل کر ان سے ملاقات کریں؟''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے ہامی بھری اور پھر پوچھا ''میڈم وہاں تو وسیع وعریض بنگلے ہیں کیا ان کے بنگلے میں سرونٹ کوارٹر نہیں ہیں؟''

''سرونٹ کوارٹرز ہیں، مگر وہ بہت بوسیدہ اور ناقابل رہائش ہیں، انہیں Demalish کر کے دوسرے بنوائیں گی۔''

''اس وقت ان کے ملازم کہاں رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا

''وہ کافی عرصے بعد پاکستان آئی ہیں، ان کے خاوند بیمار ہیں، وہ نئے سرے سے اپنے گھر کو Reconstruct کر رہی ہیں۔''

میں نے ہامی بھری۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئیں۔

مسز ثروت دوسرے دن دو بجے آئیں۔ ہم دونوں فریئر ہال روانہ ہوئے۔ فریئر ہال کے دائیں طرف کلفٹن روڈ کراس کر کے ہوٹل ہالیڈے ان تھا۔ بائیں طرف زیادہ آبادی اینگلو انڈینز اور پارسی حضرات کی ہے یہاں پرانی طرز کے ہزار' دو ہزار گز کے بنگلے بنے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم مسز ظافر کے گھر کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا' سڑکیں ویران' سنسان تھی خال خال ٹریفک چل رہی تھی' دروازے پر مسز ظافر خود آئیں وہ تقریباً چالیس سال کی صحت مند، پر وقار اور اچھی شکل وصورت کی حامل خاتون تھیں۔ دروازہ خود کھولا اور اندر آنے کی اجازت دی۔ مسز ثروت نے رسمی تعارف کرایا' وہ اپنے ڈرائنگ روم لے گئیں' ہمیں بٹھا کر خود شربت وغیرہ لے آئیں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ مسز ظافر مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

میں نے ان سے گزارش کی تھی کہ مجھے وہ جگہ

بتائیں جہاں آپ سرونٹ کوارٹر تعمیر کرانا چاہتی ہیں انہوں نے ڈرائنگ روم سے نکل کر ہاتھ سے اشارہ کیا تھا کہ اس کونے میں کوارٹرز بنانے ہیں' میں خود اس جگہ گیا تھا' وہ دونوں وہیں برآمدے میں کھڑی رہی تھیں' میں ان کی اس موقع پر ہدایات حاصل کرنا چاہتا تھا' لیکن مجوزہ کلام میں کوئی دلچسپی نہ لے رہی تھیں' میں نے خود ہی وہ جگہ دیکھ کر انہیں بتایا کہ کل میں کورڈ ایریا کی پیمائش کروں گا آپ کی منظوری کے بعد نقشہ بنواؤں گا اور اس کی Assesement بتاؤں گا۔'' یہ کہہ کر ان سے اجازت طلب کی اور واپس اپنے آفس آ گیا۔

اگلے روز میں اکیلا مسز ظافر کے گھر روانہ ہوا' مسز ثروت نے کہہ دیا تھا کہ آپ سے پارٹی ملادی ہے' اس سے ڈیل خود کرلیں۔ تقریباً ڈھائی بجے ان کی رہائش گاہ پہنچا۔ موسم اس وقت گرم تھا' گھنٹی بجانے پر وہ خود دروازے پر آئیں' میں مسز ظافر کو دیکھ کر حیران ہوا' وہ بلیک کلر کی لال دھاری دار ساڑھی پہنے ہوئی تھیں' مناسب میک اپ کیا ہوا تھا' معلوم ہوتا تھا کسی فنکشن میں جارہی ہیں' حیرانگی اس بات کی تھی کہ ایسے موسم میں دوپہر کے وقت ڈارک کلر اور پھر میک' بہرحال سلام دعا کے بعد وہ اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئیں' بیٹھنے سے پیشتر میں نے ان سے کہا تھا کہ میرے ساتھ چلیں پیمائش کرنی ہے۔'' لیکن وہ اس کام میں دلچسپی نہیں لے رہی تھیں۔ میں اکیلا ہی اس جگہ کی پیمائش وغیرہ کرکے واپس ڈرائنگ روم پہنچا تو میز پر چائے اور دیگر لوازمات قرینے سے سجے تھے' میں نے انہیں کورڈ ایریا کے حساب سے کل خرچ بتاتے ہوئے جواب طلب نگاہوں سے دیکھا تھا لیکن وہ حسب سابق اس معاملے کو نظر انداز کررہی تھیں بس مجھے گھورے جارہی تھیں۔ اور اب میں ان کی آنکھوں میں اتری ہوئی خاص چمک کو محسوس کررہا تھا۔

درست ہے کہ میں ایک کاسموپولیٹین شہر میں رہ رہا تھا' سوشل لائف تھی' اپنا ذاتی کاروبار تھا مگر زندگی کی اونچ نیچ سے واقف تھا' صنف نازک یا غیر اخلاقی بے راہروی سرگرمیوں سے بہت دور تھا۔ خاندانی وقار اور گاؤں کی روایات میری فطرت میں شامل تھیں لیکن میں مسز ظافر کی نیت جان چکا تھا' مجھے یقین ہوگیا تھا کہ ان کا مقصد سرونٹ کوارٹرز کی تعمیر نہ تھا' مجھے رہ رہ کر مسز ثروت پر غصہ آرہا تھا میں تو انہیں ایک مخلص دوست سمجھتا تھا' میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ اچانک مسز ظافر نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر دبادیا تھا' ان کی اس حرکت پر میرے پسینے چھوٹ گئے تھے اور میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ کردیا تھا کہ اسی وقت ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے سے کوئی صاحب وہیل چیئر پر بیٹھے اندر آئے' انہوں نے میرے اور مسز ظافر کے ہاتھوں کے ملاپ کو دیکھ لیا تھا' وہ یقیناً ان کے خاوند تھے' جو چلنے پھرنے سے معذور تھے اس لیے وہیل چیئر کو استعمال کررہے تھے' مسز ظافر ان سے لاتعلق تھیں' اور کسی ایسے ساتھی کی تلاش میں تھیں جو ان کے دکھ درد اور نفسانی جذبے کی تسکین میں شریک ہو' انہوں نے یہ TASK مسز ثروت کو سونپا تھا' اور مسز ثروت کے خیال میں اس کام کے لیے میں ہی میں SUIT کرتا تھا' میں کراچی میں اکیلا رہتا تھا' فیملی ساتھ نہ تھی' لیکن میں پہلے گزارش کرچکا ہوں کہ مجھے ان خرافات سے دلچسپی نہیں تھی اور غلط راستوں کا مسافر نہ تھا۔

مسز ظافر کے خاوند سخت طیش میں تھے ان کی زبان سے انگریزی میں غلیظ گالیاں نکل رہی تھیں' اس صورت حال میں مسز ظافر بہت گھبرا گئی تھیں، گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ انہیں غصہ بھی تھا' کہ شوہر

کی آمد نے تمام معاملہ خراب کر دیا تھا۔ میں نے یہ صورت حال دیکھی تو یہی سوچا کہ مجھے فوراً چلے جانا چاہیے' حالانکہ ان لمحات میں میرا کوئی قصور نہیں تھا' لیکن میں اپنی صفائی پیش کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا' ایک تو میں ان کے گھر میں موجود تھا جو قانوناً قابل گرفت تھا' دوسرا اس سے قبل میرا وہاں آنا جانا یا تعارف نہ تھا اگر غصے کے عالم میں مسٹر ظافر پولیس کو فون کرتے' یا کسی اور سے رابطہ کرتے تو میرے لیے بہت مسائل کھڑے ہو سکتے تھے' لہٰذا کچھ کہے سنے بغیر میں فوراً وہاں سے نکلا تو پسینے سے شرابور تھا اور بڑی مشکل سے اپنے آفس پہنچا تھا۔

کچھ دنوں بعد میری طارق مرزا سے ملاقات ہوئی' وہ پراپرٹی ڈیل کرتے تھے اور ہمارے آفس کے سامنے ان کا آفس تھا' بڑے اسمارٹ' ہوشیار اور لے دے کرنے والی شخصیت تھے۔ باتوں باتوں میں' غلطی سے میں ان سے اس واقعہ کا ذکر کر بیٹھا' وہ بڑی توجہ اور دلچسپی سے میری گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے مسز ظافر کے گھر کی لوکیشن بھی جان لی تھی۔

''حسین صاحب آپ نے بہت اچھا کیا کہ اپنے آپ کو ایسی غیر اخلاقی واردات میں ملوث نہ کیا آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

یہ تقریباً دو ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک کام کے سلسلے میں میرا مسز ظافر کے علاقے میں جانا ہوا ان کا گھر مین روڈ پر تھا' میں ان کے گھر کے آگے سے گزر رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا تھا کہ طارق ان کے گھر سے نکل رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں بہت حیران ہوا تھا۔

دوسرے دن میری ملاقات طارق مرزا سے ہوئی تو میرے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ خود ہی بولے تھے ''حسین صاحب! آپ تو نرے بدھو ہیں' قسمت کی دیوی نے آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن آپ نے دھتکار دیا۔ مجھے موقع ملا تو میں نے فائدہ اٹھالیا' یہ آج کے وقت کا عین تقاضا ہے اور کامیاب زندگی کی کلید ہے۔''

میں اسے بھلا کیا جواب دیتا۔ صرف اتنا کہا کہ غلط کام کا انجام غلط ہوتا ہے۔ برائی کے راستوں پر چلنے والے ایک دن خود ہی تاریک گڑھوں میں ہمیشہ کے لیے گر جاتے ہیں۔''

طارق مرزا سے اس ملاقات کے تقریباً تین ماہ مجھے پتہ چلا کہ انہوں نے کراچی میں اپنا کاروبار وائنڈ اپ کر لیا اور مسز ظافر کے ساتھ امریکا چلے گئے' مسز ظافر کے خاوند طبعی موت مرے تھے یا انہیں مار دیا گیا تھا' اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ وہ اپنی پراپرٹی فروخت کر کے طارق مرزا کے ساتھ حسین مستقبل کے خواب سجائے امریکہ چلی گئی تھیں۔

☆......☆

دو سال بعد ہماری مارکیٹ میں یہ خبر آئی تھی کہ طارق مرزا کا امریکہ میں انتقال ہو گیا ہے۔ وہ نیو یارک میں اپنے فلیٹ میں مردہ پائے گئے تھے۔ ان کی لاش تین دن تک فلیٹ میں پڑی رہی تھی۔ تعفن سے ہمسایوں کو پتہ چلا اور ان کی لاش برآمد ہوئی۔ مسز ظافر کا کوئی پتہ نہ تھا' زندہ تھیں یا مر گئیں، امریکہ کی پولیس تفتیش کر رہی تھی۔

دوسروں کی چھینی ہوئی خوشیاں راس نہیں آتیں۔ کسی کے ارمانوں کا خون کر کے اپنی دنیا آباد نہیں ہو سکتی۔ یہ قانون قدرت ہے' بقول طارق مرزا میں کم عقل' قسمت کو دھتکارنے والا شخص تھا' نتیجہ کیا نکلا۔ طارق مرزا اس دنیا میں نہیں' شاید مسز ظافر بھی نہیں' لیکن الحمدللہ میں آج بھی شاہراہ حیات پر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ گامزن ہوں!! ☆☆

اس ماہ کی عبرت اثر کہانیاں

دوسری کہانی

غیرت کے نام پر

جہانہ آفتاب

جھوٹی انا اور غیرت کے نام پر قتل ہونے والی بہن کی زندہ کہانی



"اماں مجھے بھائی سے کہہ کر زنگر برگر منگوادیں۔"

انابیہ رات کی ہانڈی بنانے کے لیے لہسن چھیلتی اماں سے ملتجی لہجے میں گویا تھی۔ اس ہفتے اس نے کوئی چھٹی مرتبہ اماں کو بھائی سے اپنی سفارش کرنے کو کہا تھا مگر نتیجہ پچھلی کئی مرتبہ کی طرح رہا تھا، لیکن اپنے شوق کے ہاتھوں مجبور اماں سے ایک بار پھر کہہ گئی۔

"یہ بیٹھے بٹھائے تجھے کون سی لت لگ گئی ہے؟" اماں نے چھری زمین میں پٹختے آنکھیں دکھائیں۔ بیٹے کے مزاج سے آشنا جو تھیں اس نے کب بہن کے لاڈ اٹھائے تھے۔

"میں کتنی بار کہہ چکی ہوں لیکن تم نے ایک بار بھی منگوا کر نہیں دیا۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"لیکن پھر بھی تجھے صبر نہیں آتا ہے۔" اماں اسے گھورنے لگیں۔

"ندا کا بھی تو بھائی ہے وہ اس اپنی بہن کی ہر فرمائش پوری کرتا ہے جب جو چیز اسے چاہیے ہوتی ہے، وہ فوراً اسے لا کر دیتا ہے۔" اس نے اپنی سہیلی کی مثال دی جو اس کی پڑوسن بھی تھی۔

"تیرے بھائی کے پاس ان چونچلوں کے لیے ٹائم نہیں ہوتا، نکما نکھٹو نہیں ہے وہ۔" اماں لہسن کے چھلکے سمیٹے بیٹے کی حمایت کرنے لگیں۔

"مگر اپنے دوستوں کے ساتھ تو دعوت اڑانے کے لیے بڑا ٹائم ہوتا ہے۔" اماں کی بھائی کی حمایت پر وہ کلس کر رہ گئی۔

"بہت لمبی زبان ہوگئی ہے تیری" اس کا یوں دوبدو جواب دینا انہیں ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔

"بھائی بھی تو آپ کو ایک بات کے بدلے دس باتیں سناتا ہے، آپ اسے تو کچھ نہیں کہتیں۔"

آج وہ ہار ماننے کے موڈ میں نہ تھی۔

اماں اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ "مجھے زنگر برگر چاہیے بس!" اماں کو خاموش پا کر اس نے صندلی لہجے میں کہا

"تو برگر کھا کر پیٹ بھرے گی تو جو ہانڈی میں بنا رہی ہوں وہ کون کھائے گا۔" اماں نے بہلانے کی سعی کی۔

"بھائی کو کھلانا، یوں بھی تو ساری اچھی بوٹیاں اس کے لیے ہی چھپا کر رکھ دیتی ہے۔" اس نے منہ بسورا۔

"یہ لے پیسے اور جا کر ندا کے بھائی سے اپنے لیے برگر منگوا لے۔" بیٹی کی مسلسل چلتی زبان سے تنگ آ کر دوپٹے کے پہلو سے پیسے نکال کر اماں نے اسے تھمائے۔

"لو یو اماں۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے پیسے ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ندا کے گھر کی طرف بھاگی تھی۔

☆......☆

انابیہ ایسے ماحول میں پلی بڑھی تھی جہاں بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت دی جاتی ہے، ہر روز وہ چیز جو بیٹوں کو دے کر بچ جائے وہ بیٹیوں کا نصیب بنتی ہے۔ اپنے بیٹے یاور کی ہر خواہش کو پورا کرنا اماں اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ یاور کی خوشیاں اماں کی اوّلین ترجیح ہوا کرتی، وہ یاور کو خوش کرنے کی خاطر اکثر انابیہ کے ساتھ زیادتی کر جایا کرتی تھیں۔ ہر اچھی چیز پر یاور کا حق تھا۔ انابیہ کے حصے میں بچی کھچی چیزیں آتیں۔

اماں کے لاڈ و پیار نے یاور کو خودسر اور بدتمیز بنا دیا تھا۔ انابیہ کی حق تلفی کر کے اماں یاور کی ہر خواہش کو پورا کیا کرتی تھیں۔ اس طرز عمل نے یاور کے اندر احساس برتری کو پروان چڑھایا تھا۔ حد درجہ اہمیت پا

کریا اور کو انابیہ کا وجود کیڑے جتنا حقیر لگنے لگا تھا۔ وہ ہمیشہ احساس برتری کے نشے میں اپنے حقارت آمیز رویے سے انابیہ کو اس کے کمتر ہونے کا احساس دلایا کرتا تھا جس کی وجہ سے اس کے دل میں بھائی سے محبت کی جگہ بدگمانی پیدا ہونے لگی تھی۔

''ندا مجھے اپنے بھائی سے کہہ کر زنگر برگر منگوا دو۔'' اس نے پیسے ندا کو دیتے ہوئے کہا تھا

''تھوڑی دیر میں منگوا دیتی ہوں۔'' ندا سموسے اور رول پلیٹوں میں نکالتی گویا تھی۔

''یہ چیزیں تم نے بنائی ہیں ندا؟'' ٹرے میں سجے لوازمات کو اشتیاق سے دیکھتے ہوئے اس نے استفسار کیا ''نہیں جاب سے واپسی پر یہ چیزیں بھائی لے کر آتے ہیں۔'' کپ ٹرے میں سیٹ کرتے ہوئے ندا نے جواب دیا۔

انابیہ کو ندا کے گھر کے طور طریقے بے حد بھاتے تھے۔ بہن بھائی کے مابین حد درجہ دوستانہ تعلقات تھے۔ اسے ندا کی قسمت پر رشک آیا کرتا تھا۔

''بھائی آپ کے لیے کھانا نکالوں؟'' ندا ٹرے لے کر صحن میں نکلی تھی' جب سامنے سے آتے زین سے استفسار کیا۔

''نہیں جو چیزیں لایا ہوں وہی نکال لو۔'' چائے کا کپ ٹرے سے اٹھاتے اس نے جواب دیا تھا' انابیہ باورچی خانے میں کھڑکی سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو بغور سن رہی تھی۔

''میں نے دوپہر میں کباب بنا لیے تھے' آپ کو پسند ہیں نا' میں وہ بھی گرم کر کے لاتی ہوں۔'' ندا ٹرے تخت پر رکھتی گویا تھی۔

''اس نے اپنے حصے کے کباب تمہارے لیے رکھ دیے تھے۔'' جائے نماز طے کرتے ہوئے ندا کی والدہ ناظمہ بیگم زین سے مخاطب تھیں۔

''پگلی! بہن کو سر پہ چپت لگاتے' زین نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھا تھا۔ کھڑکی کے پار سے انابیہ کو یہ منظر نہ جانے کیوں دھندلا نظر آیا تھا۔

☆......☆

''یہ دو ہی روٹی پڑی ہے، بھائی کے لیے رہنے دے تو چاول کھا لے۔'' اس نے باورچی خانے میں قدم رکھا تھا جب اماں نے کہا تھا۔

''چاول بھی آپ اپنے بیٹے کو کھلا دیں۔''

انابیہ پیر پٹختی وہاں سے نکل گئی۔ اس کے ساتھ تو ہمیشہ سے یہی سلوک ہوتا آیا تھا' مگر جانے کیوں آج اسے اپنی محرومی کسی ناگ کی طرح ڈس رہی تھی۔ اپنے گھر کے ماحول سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اماں کے سلوک سے اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ شیشے جیسی شفاف آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''دروازہ بج رہا ہے جا کر دروازہ کھول۔'' وہ چہرے پر دوپٹہ ڈالے اپنی محرومیوں پر ماتم کناں تھی' جب اماں کی چیخ اس کی سماعت سے ٹکرائی' وہ غصے سے اٹھتے ہوئے دروازے تک گئی اور دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔ وہ پلٹنا ہی چاہتی تھی لیکن یاور کے بجائے زین کو دیکھ کر گڑبڑا گئی۔

''معاف کیجیے گا میں نماز پڑھنے چلا گیا تھا ،اس لیے دیر ہو گئی۔'' اس نے شاپر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بہت شکریہ'!' اپنی رونی صورت پر شرمندگی محسوس کرتے جملہ ادا کر کے اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

☆......☆

''بھائی مجھے دھاگہ لا دو، مجھے اپنی قمیص پر کڑھائی کرنی ہے۔'' چھٹی کا دن تھا۔ یاور اماں کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



گود میں سر رکھے لیٹا تھا۔ اماں بڑے چاؤ سے اس کے سر میں تیل لگا رہی تھیں' انابیہ کی نظریں اپنی سوکھی چوٹی سے ہو کر یاور کے گھنے بالوں میں جا رکی۔ وہ بہت آس سے یاور کو کہہ رہی تھی۔

''میری شکل دیکھتے ہی تجھے کام یاد آ جاتے ہیں۔'' وہ ناگواری سے بولا تھا۔

''دیکھ نہیں رہی بھائی آرام کر رہا ہے چل جا یہاں سے۔' اماں کو بیٹے کے آرام میں خلل پسند نہ آیا تو وہ اس پر چڑھ دوڑیں۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

''بھائی باہر جا رہے ہو تو دھاگہ......'' شام کی چائے پی کر یاور باہر نکل رہا تھا' جب انابیہ نے اسے کٹ پیس پکڑانا چاہا۔

''ہٹ پرے تیری قمیص کو ہی آگ لگا دوں گا۔'' کٹ پیس اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر زمین پر پھینکتے وہ دھاڑا تھا۔ بھائی کی اس بدسلوکی پر دل درد سے بھر گیا، وہ اشک پیتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''السلام علیکم! آج تو بڑے لوگ ہمارے گھر آئے ہیں۔' یاور دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا۔ دروازے کے باہر کھڑی ندا کو دیکھ کر وہ چہکنے لگا۔

مجھے بیہ سے ملنا ہے۔''

ندا نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا

''اس سے بھی مل لیجیے گا پہلے ہم سے تو ملاقات کر لیں۔ برسوں سے ہم آپ کے انتظار میں ہیں۔'' وہ اس کا راستہ روکے کھڑا تھا

''آپ راستہ دیں گے یا میں واپس چلی جاؤں۔'' ندا نے سختی سے کہا۔

''دل کا دروازہ تو ہم نے پہلے ہی کھول رکھا ہے آپ ہی دیر کر رہی ہیں۔'' یاور نے ایک ادا سے کہہ کر اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ ندا سر جھٹکتی اندر داخل ہوئی۔

عرصۂ دراز سے یاور ندا کے سامنے ہیرو بننے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا لیکن ندا نے کبھی اس کی باتوں کو اہمیت نہ دی، اس کے گھر میں چاہتیں نچھاور کرنے والی ہستیاں موجود تھیں، اسے کبھی باہر والوں کی توجہ اور محبت سمیٹنے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ یاور سے وہ دانستہ دور ہی رہتی تھی لیکن اپنی عزیز از جان دوست سے ملنے کی خاطر اسے اکثر یاور کا نہ چاہتے ہوئے بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔

''دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں؟'' انابیہ قمیص کا گولہ بنا کر پلنگ کے نیچے پھینک کر پلنگ پر لیٹے چھت کو گھور رہی تھی' وہ ندا کی آواز پر اٹھ بیٹھی۔

''یہ کیا ہے' اس نے سوالیہ نظروں سے ندا کو دیکھا۔

''تمہارا پسندیدہ زنگر برگر۔'' ندا نے پلیٹ کے اوپر سے دوسری پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا

''اوہ! بہت شکریہ!'' وہ سب کچھ بھول کر برگر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''یہ بھائی نے بھیجا ہے تمہارے لیے۔''

ندا نے آہستگی سے کہا

''تمہارے بھائی نے میرے لیے۔'' منہ تک لے جاتا ہاتھ درمیان میں ہی رہ گیا۔

''ہاں میں نے انہیں بتایا تھا کہ تمہیں برگر بہت پسند ہیں۔' ندا نے بتایا۔

''اچھا تمہارے بھائی بہت اچھے ہیں۔'' برگر کا بڑا سا بائیٹ لیتے ہوئے اس نے کہا تھا، اس کی سادگی پر ندا ہنس دی۔

''اگر میرے اچھے بھائی تمہارے ''وہ'' بن جائیں تو ندا نے شوخی سے کہا تھا' بیہ کو پھندا لگا' وہ بری طرح کھانسنے لگی۔

''اف پانی پیو'' کچھ فاصلے پہ رکھے کولر سے پانی نکال کر ندا نے اسے پکڑایا تھا۔

''امی جلد ہی تمہارے لیے بھائی کا رشتہ لے کر آئیں گی۔'' ندا نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ وہ مارے حیرت کے گنگ تھی۔

''اب میں جا رہی ہوں بہت جلد امی کے ساتھ آؤں گی۔'' ندا یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

انابیہ کی بھوک اڑ چکی تھی، اس کو اپنا وجود ہواؤں میں اڑتا محسوس ہو رہا تھا' محبت کو ترسا وجود سیرابی کے احساس سے ہی سرشار تھا۔ محرومیوں اور زیادتیوں سے بھرپور زندگی اب الگ ہی روپ دھارنے لگی تھی' آنکھوں میں زین کا مہربان وجود آن بسا تو مسکراہٹ نے بھی اس کے لبوں پر جگہ بنالی۔ اسے اپنے وجود میں ٹھنڈک اترتی محسوس ہوئی دل کی زمین پہ جذبات کی کن من بارش سے محبت کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ دل کی ویران بستی سرسبز و شاداب وادی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ نیند رات بھر اس کی آنکھوں سے دور رہی۔ آنکھوں میں نیند کی جگہ نوخیز خوابوں نے لے لی تھی۔ رات کی پراسرار خاموشی میں جذبات اس کے اندر شور مچانے لگے تھے۔

☆......☆

''بیہ' ندا کے گھر سے آلو مانگ کر لے آ۔'' اماں نے باورچی خانے سے آواز لگائی تھی۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' صحن دھوتے ہوئے اس نے انکار کیا۔

''جانا تیرے بھائی نے آلو گوشت کی فرمائش کی تھی گھر میں آلو نہیں ہیں۔'' اماں نے کہا

''کیا ہے اماں'' ندا نے رات جو بات اسے بتائی تھی اس کے بعد تو اس کے دل کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ ندا کے ذکر سے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

''اپنے کام کے لیے تو بھاگ بھاگ کر جاتی ہے۔'' اماں نے طعنہ دے ڈالا۔

وہ جھاڑو صحن میں رکھ کر ہاتھ دھونے لگی۔ دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے اس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ سر کا بالوں کو ہاتھوں سے درست کر کے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ ندا کے گھر کی طرف چل پڑی۔

''آپ؟'' دروازہ زین نے کھولا تھا' طبیعت کی ناسازی کے باعث وہ جاب پر نہ جا سکا تھا۔ انابیہ کو دیکھتے ہی زین کے لبوں کو مسکراہٹ نے چھوا تھا۔

''مجھے خالہ سے کام ہے۔'' انگلیاں مروڑتے ہوئے وہ گویا تھی، زین فوراً سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

☆......☆

''کام چور کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔'' اماں انابیہ کے سر پر کھڑی تھیں۔'' وہ چارپائی پہ لیٹی آسمان پہ نظریں مرکوز کیے پرندوں کو اڑتا دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنا وجود کسی پرندے کی طرح محسوس ہوا جو ہواؤں میں اڑتا چلا جا رہا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہوں؟'' اماں کی دھاڑ پہ وہ چونکی۔ ''بھائی کے لیے روٹی ڈال لے میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔'' اماں نے کہا تو وہ خاموشی سے باورچی خانے میں چلی آئی۔ اور جب یاور آیا تو اس نے خوش دلی سے اس کے آگے کھانا رکھا، آج اسے کسی کام سے چڑ نہیں ہوئی۔ دل کا موسم اچھا ہوا تو اردگرد پھول

کھلے نظر آتے ہیں۔ جب آپ کا وجود محبت کے حصار میں ہو تو غصہ اور بیزاری جھنجلاہٹ کی کیا مجال کہ آپ کے مزاج پر اثر انداز ہو سکے، اس کے دل کی زمین پہ بھی ڈھیروں سکون اور اطمینان پھیلنے لگا تھا۔ خوشیاں کسی خوشنما بیل کی طرح اس کے دل کی دیواروں سے لپٹنے لگی تھیں، وہ بے حد مسرور تھی۔

''دروازے پر دستک ہوئی تو وہ دروازہ کھولنے کی نیت سے اٹھی تھی، جب یاور نے کہا ''تو رہنے دے میں دیکھتا ہوں۔''

وہ چائے بنانے کی غرض سے باورچی خانے میں چلی آئی اور پھر ندا اور اس کی والدہ کو صحن میں دیکھ کر انابیہ کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو گئیں۔ یاور باہر جا چکا تھا، چائے نکال کر وہ کپ ٹرے پر سجائے ہوئے اس کشمکش میں تھی کہ وہ کمرے میں جائے یا نہیں۔

''یہ چائے تو بنا لے۔'' اماں کی آواز نے اس کی مشکل قدرے آسان کر دی۔

''مٹھائی بھی منگوالو۔'' وہ چائے کی ٹرے کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی تھی، جب ندا نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کی، اماں کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر اس کے دل میں ڈھیروں اطمینان اتر آیا۔

''بہن میں آپ کو سوچ کر جواب دوں گی۔'' اماں نے انابیہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے، آپ گھر میں مشورہ کر لیں۔'' ناظمہ بیگم نے کہا تھا۔

کچھ دیر بعد ندا اور اس کی والدہ نے اپنے گھر کی راہ لی۔ جبکہ وہ نئی زندگی کے خواب سجائے کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔

☆......☆

''بیٹا میں آج نابیہ کے گھر گئی تھی تمہارے رشتے کی بات کر آئی ہوں۔'' ناظمہ بیگم موبائل میں گیم کھیلتے زین سے مخاطب تھیں۔

''اچھا پھر کیا جواب دیا ان لوگوں نے؟''

زین نے بے ساختہ سوال کیا تھا، چائے کا کپ زین کو پکڑاتی ندا نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ شرمندہ سا کپ کے کناروں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

''بیٹے سے مشورہ کریں گی اس لیے وقت مانگا ہے۔'' ناظمہ بیگم نے جواب دیا۔

''امی میرا دوست ہے سفیان وہ ندا کے رشتے کے لیے اپنے گھر والوں کو بھیجنا چاہ رہا ہے۔ میں نے اسے اگلے سنڈے کو گھر بلایا ہے۔'' زین نے کہا تو ندا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ زین نے توجہ نہ دی مگر ناظمہ بیگم نے ندا کے تاثرات کو بغور دیکھا تھا۔

''بیٹا مجھے تمہاری خالہ بھی ندا کے لیے اشعر کے بارے میں کہہ چکی ہوں۔ تم سفیان کے گھر والوں کو بلا چکے ہو تو انہیں آنے دو لیکن حتمی فیصلے کا اختیار ندا کو ہے کیونکہ زندگی ندا نے گزارنی ہے۔'' ناظمہ بیگم نے سہولت سے بات ختم کر دی۔

''جی امی مجھے یقین ہے کہ میری بہن اپنی خوشیوں کے لیے بہتر فیصلہ کر سکتی ہے۔ یہ میری بہن کی خوشیوں کا معاملہ ہے اسے پورا حق ہے کہ جو چاہے فیصلہ کرے۔'' زین نے کہا تو ندا ماں اور بھائی کی باتوں کو سن کر مطمئن ہو گئی۔

☆......☆

''آپ اس رشتے سے انکار کر دیں۔'' یاور نے روٹی کا ٹکڑا توڑتے ہوئے کہا۔ باورچی خانے میں کھڑی انابیہ کو لگا کسی نے اس کے پیروں سے زمین کھینچ لی ہے۔ وہ چکرا سی گئی۔ اماں کی خاموشی یہ

ظاہر کر رہی تھی کہ انہیں یاور کی بات سے کوئی اختلاف نہیں اور وہ ناظمہ بیگم کو انکار کر دیں گی۔ وہ امی کی خاموشی پر کھول کر رہ گئی۔

''اور تو بھی کان کھول کر سن لے اب ندا کے گھر گئی تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔'' وہ کھانے کے برتن اٹھانے کے لیے آئی تو یاور نے غضب ناک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا ''وہاں جا کر ہی تو اس نے گل کھایا ہے ورنہ اس کمینے کی اتنی ہمت بھی نہ ہوتی کہ ہمارے گھر رشتہ بھیجتا۔'' وہ کٹیلی نظروں سے نابیہ کو دیکھتے گویا تھا۔ مارے ضبط کے انابیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اماں کی خاموشی اس کے دل میں ضرب کی طرح لگ رہی تھی۔

''جس طرح آپ دوسروں کی بہنوں کو مفت کا مال سمجھتے ہیں، ضروری نہیں کہ دوسرا بھی آپ کی بہن کو ویسا ہی سمجھے آپ کے ذہن میں جو غلاظت ہے اسے آپ میرے کردار میں لگانے کی کوشش نہ کریں۔'' انابیہ نے غصہ بھری کپکپاتی آواز میں کہا تھا۔

''مجھ سے زبان چلائے گی؟'' یاور نے زور دار تھپڑ اسے دے مارا، وہ اپنی جگہ سے دور جا گری۔ اس کا سر بری طرح دیوار سے ٹکرایا۔ خون کی تیز دھار اس کے چہرے کو تر کرنے لگی۔

''ہاں چلاؤں گی زبان، تم کو تمہاری اوقات یاد دلاؤں گی۔'' ماتھے سے بہتے خون کو دیکھ کر وہ جنونی ہو گئی۔

''بیہ چپ ہو جا۔'' بیٹے کے غضب ناک انداز کو دیکھ کر اماں نے اسے سمجھانا چاہا ''تو بیچ میں مت آ!'' اماں کو پکڑ کر یاور نے کمرے میں دھکیلا اور باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ اماں کمرے کے اندر سے چلاتی رہیں۔

''کیا کہہ رہی تھی تو مجھے میری اوقات یاد دلائے گی؟'' یاور نے بالوں سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔ ''ہاں میں بتاؤں گی تجھے تیری اوقات اور اب سے ہر وہ کام کروں گی جس سے تو مجھے منع کرے گا۔'' آپ سے تم اور تم سے تو تک کا سفر انابیہ نے لمحوں میں طے کیا تھا۔ یاور نے اسے دوسرا تھپڑ رسید کیا۔ اب وہ منہ کے بل گری تھی۔

''یاور تو ہوش کر، بیہ تُو تو چپ ہو جا۔'' اماں دروازہ بجاتے مسلسل چلا رہی تھیں۔ شور کی آواز پر محلے کے لوگ بھی گھر کے باہر جمع ہو گئے اور مسلسل دروازے پہ دستک دینے لگے یاور پر جنون سوار ہو گیا تھا وہ مسلسل نابیہ کو مار رہا تھا۔

''میں مر جاؤں گی لیکن تیری کوئی بات نہیں مانوں گی۔'' یاور اسے بری طرح پیٹ رہا تھا ہر تھپڑ پر وہ یاور سے بدتمیزی کر رہی تھی اسے یاور کو غصہ دلانے میں مزہ آ رہا تھا۔

''بہت شوق ہے تجھے مرنے کا ابھی تیری خواہش پوری کر دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر یاور باورچی خانے کی طرف بڑھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں تیز دھار چھری دیکھ کر انابیہ کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا ماں جایا بھائی، اس کی جان لینے کے درپے ہو جائے گا۔

''بھائی ...... نہیں'' گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی تھی'' مجھے معاف کر دو بھائی'' موت اچھے اچھوں کو خوفزدہ کر دیا کرتی ہے، وہ تو پھر ایک بزدل لڑکی تھی جو اپنے کردار پہ کیچڑ اچھالے جانے کی وجہ سے بھائی کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ جو ایک برگر کی فرمائش کرنے سے ڈرتی تھی آج اتنی نڈر کیسے ہو گئی تھی کہ اپنے بھائی کے سامنے زبان چلانے لگی تھی۔ یقیناً یاور کے رویے نے ہی اسے باغی بنا دیا تھا مگر

یاور اس حد تک چلا جائے گا یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ چھری لے کر اس کی جانب بڑھنے لگا۔

"مجھ سے غلطی ہوگئی بھائی آئندہ کبھی تیرے آگے نہیں بولوں گی، گھٹنوں کے بل بیٹھتے خون سے تر ہوئے وجود کے ساتھ ہاتھ جوڑے گڑگڑا رہی تھی، لیکن یاور کا دل گویا پتھر بن چکا تھا جو بہن کی گریہ وزاری سے بھی نہ پگھل سکا۔ اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر اسے گھسیٹ رہا تھا۔

"پاگل ہوگیا ہے یاور کیوں اس کی جان کا دشمن بن گیا ہے۔ بہن ہے تیری" اماں کی حواس باختہ آواز آئی تھی۔

"بھ...... بھائی، پلیز معاف کر دو" مارے خوف کے وہ یاور سے لپٹ گئی۔ یاور نے جھٹکے سے اسے خود سے الگ کیا اور تیز دھار چھری اس کے گلے میں پھیر دی، عین اسی لمحے لوگ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تھے اندر کا منظر دیکھ کر سب کی آنکھیں حیرت سے وا رہ گئیں۔ اپنے حق کے لیے بلند ہونے والی نابیہ کی آواز ہمیشہ کے لیے بند کر دی گئی تھی۔

☆......☆

یاور پولیس کی حراست میں تھا، اماں نابیہ کے قتل کا صدمہ برداشت نہ کرسکیں اور ابدی سفر پر روانہ ہوچکی تھیں۔ زین اس افسوس ناک واقعہ پر بے حد افسردہ تھا۔ ان تمام واقعات میں ندا خود کو اور اپنے گھر والوں کو مجرم سمجھنے لگی تھی۔ اس کے برعکس زین کو یاور کی سوچ پر بے حد افسوس تھا۔ رہی سہی کسر اخبار میں چھپنے والی خبر نے پوری کر دی۔ اخبار کے مطابق "مقتولہ اپنے آشنا کے ساتھ بھاگنے کی سازش کر رہی تھی کہ بھائی نے بہن کو غیرت کے نام پر قتل کر دیا۔" اس معصوم لڑکی کے قتل پر زین غمزدہ تھا۔ اس خبر نے تو اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے میڈیا پر بے حد غصہ تھا مگر اس سے کہیں غصہ اسے یاور پر تھا۔ اس کے اس انتہائی قدم نے اپنی مرحومہ بہن کو اس نہج پر پہنچا دیا تھا کہ لوگ اس کے متعلق من گھڑت کہانیاں بنانے لگے تھے۔ اس خبر کے بعد اہل محلہ کو نابیہ کے متعلق باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ جس کے جی میں جو آتا وہ کہہ کر گزر جاتا۔ اس بات سے بے نیاز کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ لوگوں کو تو باتیں بنانے کے لیے موقع کی تلاش رہتی ہے اور یہ موقع لوگوں کو اس کے سگے بھائی نے فراہم کیا تھا۔ زین کو لوگوں کی ذہنیت پر افسوس اور یاور کے عمل پر سخت غصہ تھا۔ اسی غصے نے اسے سلاخوں کے پیچھے موجود یاور کے مقابل لا کھڑا کیا۔

"بہت مبارک ہو تم نے اپنی بہن کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ تمہاری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ تمہاری بہن تم سے اپنی خوشیوں کے لیے سوال کرے۔ اخبار میں یہ خبر چھپی ہے کہ بہن کو گھر سے بھاگنے کے جرم میں بھائی نے قتل کر دیا۔ اب اس غیرت مند بھائی کا ان لوگوں کے خلاف کیا اقدام ہوگا جو اس کی مرحومہ بہن پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری بہن کا کردار پاک صاف ہے لیکن تمہارے اس عمل نے اس کے کردار کو داغ دار کر دیا ہے، وہ تمہاری زیادتیوں کے جواب میں کچھ نہیں کہتی تھی۔ ہر ناانصافی چپ چاپ سہتی تھی۔ وہ تو اتنی بزدل تھی کہ جائز فرمائش کرتے ہوئے ڈرتی تھی، اسے تم نے ہی مجبور کیا کہ وہ تمہارے آگے نہ صرف ڈٹ کر کھڑی ہو بلکہ بدتمیزی بھی کرے، تم ہمیشہ اسے خوشیوں سے دور کرتے رہے، اگر تم نے اس کی خوشیوں کا خیال کیا ہوتا تو وہ تمہارے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتی لیکن تم نے ہمیشہ اسے چھوٹی چھوٹی

خوشیوں سے محروم کیا جان لو کہ محرومی سے شروع ہونے والی داستان ہمیشہ غیرت کے نام پر ختم ہوتی ہے' کیا آج ایک بھائی کا یہی فرض رہ گیا ہے کہ وہ بہن کی خوشیوں اور ضرورتوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلے اور جب بہن اپنی خوشیوں کی طرف توجہ دے تو اسے غیرت کے نام پر قتل کردے؟ خوش رہنا ہر انسان کا حق ہے۔ اگر کوئی اپنی خوشیوں کے لیے کوئی فیصلہ لینا چاہتا ہے تو تم کون ہوتے ہو کسی کو اس کی خوشیوں سے محروم کرنے والے؟ تم جیسے بھائی جس کے پاس بہن کو دینے کے لیے خوشیوں کے دو پل نہیں تو تمھیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ تم بہن کو اس کی خوشیوں سے محروم کرو اور اسے موت دے دو؟'' شدتِ جذبات سے کہتے زین کی آواز بند ہوگئی۔ آنکھوں میں نمی تیرنے لگی' درد دل کی دیواروں سے سرٹکرانے لگا۔ اچٹتی نگاہ سلاخوں کے پار سر جھکائے یاور پہ ڈال کر پلٹ گیا تھا۔

☆......☆

''اپنی بے گناہی پہ آپ کچھ بولنا چاہیں گے؟'' یاور پولیس کے نرغے میں کمرۂ عدالت میں موجود تھا۔ ''میں ہر بھائی سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی بہنوں کو چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے کبھی نہ ترسائیں۔ کبھی انہیں ان کی خوشیوں سے محروم نہ کریں کیونکہ محرومی سے شروع ہونے والی کہانی ہمیشہ غیرت کے نام پر ختم ہوتی ہے۔ قانون کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مجھے سخت سے سخت سزا سنائی جائے۔ مجھے نشانِ عبرت بنایا جائے تاکہ کوئی بھائی اپنی بہن کو قتل کرنے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے پچھتاوا بہنے لگا تھا۔

●●

غزل

ڈاکٹر نزہت عباسی

اپنا اِدراک ہو گئی ہُوں مَیں
خوگرِ خاک ہو گئی ہُوں مَیں

اُس کے الزام سے بَری ہو کر
صاف اور پاک ہو گئی ہُوں مَیں

اُس نے جنّت جو رکھ دی قدموں میں
مثلِ اَفلاک ہو گئی ہُوں مَیں

کوئی طُوفاں ڈُبو سکا نہ مجھے
اچھّی پیراک ہو گئی ہُوں مَیں

سَچ بھی کہنے سے اَب نہیں ڈرتی
اِتنی بیباک ہو گئی ہُوں مَیں

زخم اُس کے چھپائے پھرتی ہُوں
اُس کی پوشاک ہو گئی ہُوں مَیں

اُس کی صَدیوں رَفُو گری کر کے
خود ہی صَد چاک ہو گئی ہُوں مَیں

☆......☆

اس ماہ کی عبرت اثر کہانیاں

تیسری کہانی

مظلوم کی آہ!

اُم عادل

یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے



''سنو وجیہہ کہاں ہو، کیا کر رہی ہو؟''
میرے شوہر نے مجھے گیٹ سے داخل ہوتے ہی پکارا تھا۔ وہ کچھ گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔
اس وقت میں کچن میں چائے بنا رہی تھی ''یا اللہ خیر!'' کہتی، میں کچن سے نکل کر ان کے پاس گئی تھی۔ ''جی! کیا بات ہے آپ پریشان لگ رہے ہیں' خیر تو ہے؟'' میں نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے پوچھا تھا۔
''آؤ یہاں بیٹھو، بتاتا ہوں کیا بات ہے؟'' میرے شوہر نے کہا تھا۔
''چائے تیار ہے، چولہا جل رہا ہے، جل جائے گی، میں ذرا چائے کپوں میں ڈال کر لے آؤں۔'' یہ کہہ کر میں کچن کی طرف دوڑی تھی۔
میرے ذہن میں لاتعداد اندیشوں کے جھکڑ چل رہے تھے اور دل سے دعا نکل رہی تھی کہ یا خدا خیر ہو' جانے کیا خبر ہے؟ میں نے عجلت میں چائے کپوں میں نکالی تھی، اور جلدی سے جا کر اپنے شوہر کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔
میرے بیٹھتے ہی شوہر گویا ہوئے ''وہ تمہاری سہیلی عافیہ!......''
''ہاں! کیا ہوا عافیہ کو؟'' میں نے شوہر کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی گھبرا کر سوال کر دیا۔
''اسے کچھ نہیں ہوا' اس کے شوہر کا رحیم انتقال ہو گیا ہے۔''
''اُف خدایا مگر کیسے؟ وہ تو دوسری شادی کے لیے منگنی کرنے گاؤں گیا ہوا تھا۔'' میں نے اپنی معلومات کے مطابق کہا۔
''ہاں! گاؤں سے واپسی پر راستے میں رحیم اللہ کی گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا گئی، اس کی ڈیڈ باڈی آنے والی ہے' میں ذرا جا کر معلوم کرتا ہوں کہ نماز جنازہ کب ہو گی'' یہ کہہ کر میرے شوہر گھر سے باہر چلے گئے تھے اور میں پریشانی کے عالم میں بیٹھی عافیہ کی پچھلی گزری زندگی اور اب آنے والے حالات کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس مظلوم عورت کو شوہر کی زندگی میں کبھی سکھ نصیب نہیں ہوا۔ اب اس کی بقیہ زندگی کیسے گزرے گی۔''
عافیہ کا تعلق ایک روایتی پٹھان فیملی سے ہے جو ہمارے محلے میں پچھلے کئی سال سے رہتی ہے۔
کچھ عرصے قبل وہ اپنی ساس کے ہمراہ پہلی مرتبہ میرے گھر آئی تھی' انہیں کہیں سے پتہ چلا تھا کہ مجھے بہت اچھی سلائی آتی ہے۔ عافیہ اور اس گھر کی کسی خاتون کو سلائی نہیں آتی تھی' لہٰذا ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے کپڑے سی دیا کروں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں صرف اپنے بچوں اور شوہر کے شلوار قمیص سیتی ہوں۔ کمرشل کام نہیں کرتی۔
عافیہ میری بات سن کر بولی تھی ''باجی میں تھوڑا تھوڑا سی لیتی ہوں، مگر مسئلہ یہ ہے کہ مجھے کٹنگ نہیں آتی۔''
''اچھا تو محلے داری میں اتنا کر سکتی ہوں کہ تم کپڑے لے آیا کرو' میں کٹنگ کر دیا کروں گی تم خود سی لینا۔''
''باجی! ابتدا میں آپ کو مجھے تھوڑی سلائی بھی سکھانا پڑے گی، آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔'' عافیہ نے التجائیہ انداز میں کہا تھا۔
''ارے مہربانی کی کوئی بات نہیں، اچھا ٹھیک ہے تم کبھی کبھی آ جایا کرو۔ میں تمہیں کٹنگ اور سلائی سکھا دوں گی۔'' یوں میرے رضامند ہونے پر عافیہ ہفتہ میں دو تین دن میرے گھر سلائی سیکھنے آنے لگی

مگر ہر مرتبہ عافیہ کی ساس اس کے ہمراہ ہوتی اور رفتہ رفتہ جب اس کی ساس میرے گھر کے ماحول سے مطمئن ہوگئی تو اسے اتنی دیر اپنی بہو کے ساتھ میرے گھر میں بیٹھنا مشکل لگنے لگا۔ سو وہ عافیہ کو اس کی چھوٹی نند کے ہمراہ بھجوانے لگی جو اسے میرے گھر چھوڑ کر چلی جاتی، اور دو گھنٹے بعد لینے آ جاتی۔

رفتہ رفتہ میرے اور عافیہ کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہوتا چلا گیا۔ ہم دونوں تقریباً ہم عمر ہی تھیں۔ عافیہ اپنے گھر کے حالات اور پریشانیاں مجھ سے ڈسکس کرنے لگی، میں جہاں مناسب ہوتا، اسے مشورہ بھی دیتی، وہ خوش اور مطمئن ہو جاتی' عافیہ نے اپنی زندگی کے جو حالات بتائے ان کے مطابق وہ کافی پریشان حال اور مظلوم عورت تھی، اس کا شوہر رحیم اللہ قبائلی پٹھان تھا، جسے بیوی کے دکھوں اور پریشانیوں سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ وہ خود اس کی بیشتر پریشانیوں کا سبب تھا۔ عافیہ عمر میں اپنے شوہر سے پانچ سال بڑی تھی، وہ اپنی بیوہ ماں کی اکلوتی اولاد تھی، عافیہ کا باپ عافیہ کا پھوپی زاد بھائی تھا۔

جب عافیہ کے شوہر رحیم اللہ کی شادی کا وقت آیا تو رحیم اللہ کی ماں اپنی بھابی سے بیٹے کی شادی کی خواہش مند تھی جبکہ عافیہ کے سسر کی نظر انتخاب عافیہ پر تھی' عافیہ کے سسر نے بیوی کی ایک نہ چلنے دی اور کہا ''میں اپنے پھوپی زاد بھائی کی یتیم بچی کو سہارا دینا چاہتا ہوں'' یوں عافیہ صرف سسر کی پسند پر رحیم اللہ کی بیوی بنا دی گئی۔ خود رحیم اللہ کے ذہن میں بیوی کے بارے میں کوئی خاص تصور نہ تھا عافیہ چونکہ ساس نندوں کی پسند نہیں تھی لہٰذا شادی کے پہلے دن سے ہی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا عافیہ کی ماں بے چاری عافیہ کی شادی کے دو ماہ بعد ہی چل بسی مگر اپنی بیٹی کو زندگی بھر کے لیے دکھوں کے حوالے کر گئی۔

عافیہ کا سسرالی گھر بہت بڑا اور تین منزلہ تھا۔ سسرال کا گھرانہ پانچ دیوروں اور چھ نندوں اور ساس' سسر پر مشتمل تھا۔ شادی کے دوسرے ہی دن ساس نے گھر کے تمام کام اتنے افراد کا کھانا پکانا' برتن' کپڑے دھونا اور اتنے بڑے گھر کی صفائی ستھرائی کا تمام کام عافیہ کے سر پر ڈال دیا تھا۔ نندیں ہل کر پانی بھی نہ پیتیں، ایک سال بعد عافیہ کے دیور کی شادی ہوئی اس دوران اللہ نے اسے ماں بننے کی نوید دی مگر شادی کی مصروفیات میں ساس نے اسے ایک پل چین نہ لینے دیا، اسے اس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ عافیہ بھی گوشت پوست سے بنی انسان ہے' انہی مشکلات سے گزرتے اللہ پاک نے اسے ایک بیٹے کی ماں بنا دیا۔ بیٹے کی ماں بننے پر بھی اس کی حیثیت یا قدر میں کوئی اضافہ نہ ہوا بلکہ بہت دیگر امور میں بچے کی ذمہ داری کا بھی اضافہ ہو گیا اور پھر اس سے اگلے سال عافیہ کی ساس نے تیسرے بیٹے کی شادی کی تیاری شروع کر دی اب بھی کام کی ساری ذمہ داری عافیہ کے سر ہی تھی' دیورانی چونکہ ساس کی رشتے دار تھی لہٰذا اسے گھر میں خاص اہمیت حاصل تھی، جبکہ عافیہ کے خلاف وہ اپنے بیٹے کے کان بھرتی رہتی تھی' جاہل ان پڑھ شوہر کے سامنے پہلے ہی عافیہ کی کوئی اہمیت نہ تھی' ساس کی پیدا کردہ بد گمانیوں کی وجہ سے اس کا رویہ دن بہ دن روکھا اور پر تشدد ہوتا جا رہا تھا۔

عافیہ کی بدقسمتی یہ تھی کہ نہ صرف گھر میں بلکہ پوری دنیا میں اس کے دل کی بات سننے والا کوئی بھی نہیں تھا، گھر میں آ کر تھوڑی سی شفقت ملتی تھی تو صرف سسر سے ملتی' عافیہ باپ جیسے سسر کی دل سے

عزت وخدمت کرتی، جسے کئی بار اس کی ساس غلط رنگ دینے کی کوشش کرتی، اپنی اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہی، وہ بیٹے کے دل میں شک کا بیج بو چکی تھی جس کے نتیجے میں وہ کئی بار عافیہ کو روئی کی طرح دھن چکا تھا۔ ''مجھ سے زیادہ تمہیں ابا کے کاموں اور آرام کا خیال ہوتا ہے، خود ہی اپنے منہ سے بتا دو کیا چکر ہے؟''

عافیہ مار کھا کر اور شوہر کے خیالات جان کر چکرا جاتی، مگر فریاد کرتی تو کس سے؟ دن بہ دن حالات بد سے بدتر ہوتے ہوئے عافیہ کی شادی شدہ زندگی کے آٹھ سال گزر گئے، ان گزرتے سالوں میں اللہ نے اسے تین بیٹیوں کی ماں بنا دیا، اس کے شوہر کو اس بات پر بھی سخت اعتراض تھا کہ عافیہ نے بیٹیوں کی لائن لگا دی ہے بیٹا صرف ایک ہے۔

وہ اکثر کہتا بیٹا صرف ایک ہے، اس لیے میں دوسری شادی کروں گا۔ مگر اس کے اس ارادے کی راہ میں ہمیشہ اس کا باپ رکاوٹ بنتا رہا ''اگر تمہارے نصیب میں اور بیٹے ہوئے تو تمہیں اسی بیوی سے مل جائیں گے۔ میں اپنے جیتے جی تمہیں دوسری شادی نہیں کرنے دوں گا، اگر تم نے زبردستی دوسری شادی کر لی تو میں تمہیں جائیداد سے عاق کر دوں گا'' اس کش مکش میں مزید سات سال گزر گئے۔ عافیہ کو خدا نے مزید کوئی اولاد نہ دی۔ اس نے کافی علاج بھی کروائے مگر لاحاصل اس کا شوہر اسے طعنے دیتا ''تمہاری عمر بڑی ہو گئی ہے اب کوئی اولاد نہیں ہو گی۔

ان پریشان کن حالات میں پتہ نہیں خدا کو کیا منظور تھا کہ عافیہ جو پہلے ہی نہایت مشکل زندگی گزار رہی تھی۔ ایک دن اچانک سوتے میں اس کے سسر کا انتقال ہو گیا، عافیہ کے سر پر جو ایک تھوڑا سا شفقت کا سائبان تھا، وہ بھی اٹھ گیا۔ باپ کی وفات کے بعد عافیہ کا شوہر رحیم اللہ بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے خاندان کا سربراہ بن بیٹھا، باپ کے مرنے کے کچھ ہی عرصے بعد رحیم اللہ کی وہ خالہ جس کی بڑی بیٹی کو رحیم کی ماں بہو بنانا چاہتی تھی، اسی خالہ کی سب سے چھوٹی بیٹی کا منگیتر دریا میں ڈوب کر مر گیا، لوگوں اور اس کے سسرال والوں نے لڑکی کو منحوس کہنا شروع کر دیا۔ گاؤں میں اب کوئی بھی اس کے ساتھ شادی کرنے کو تیار نہیں تھا، ایسی صورت میں رحیم اللہ کو اپنی دوسری شادی کا خواب پورا ہوتا نظر آنے لگا۔ اب تو باپ بھی اس دنیا میں نہ تھا جس کا ڈر ہوتا، اس نے اپنی ماں سے بات کی، بیٹے کی بات سن کر ماں کا شرارتی ذہن جاگ اٹھا۔ اس نے بیٹے کا کندھا تھپتھپا کر کہا ''بیٹے خوش ہو جاؤ میں تمہاری دوسری شادی کروا کے رہوں گی۔'' اس دوران رحیم اللہ کے سب بہن بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں، خود رحیم اللہ کا بیٹا شمشاد علی پندرہ سال کا ہو چکا تھا جبکہ رحیم اللہ کی خالہ کی بیٹی کی عمر بیس سال تھی اور رحیم اللہ سے پورے بیس سال چھوٹی تھی، جب عافیہ کو شوہر اور ساس کے اس منصوبے سے آگاہی ہوئی تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، پہلے ہی سسرال والوں کے مظالم کم نہ تھے کہ اب سوتن کی تلوار بھی سر پر لٹکنے والی تھی، اگلے ہی دن عافیہ کی ساس نے فون پر اپنی بہن سے بات کی، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، بہن نے فوراً رضامندی دے دی اس کی منحوس گردانی گئی بیٹی کو ٹھکانا مل رہا تھا۔

عافیہ بہت روئی، ساس اور شوہر کے سامنے گڑگڑائی۔ پھر اس نے تجویز دی کہ لڑکی شمشاد سے

تھوڑی بڑی ہے، اگر اس کی شادی شمشاد علی سے کردی جائے تو پھر بھی مسئلہ حل ہوسکتا ہے، عافیہ کی اس تجویز کو انہوں نے یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ ''بچہ ابھی چھوٹا ہے اور پڑھ رہا ہے اس لیے فی الحال اس کی شادی نہیں کی جاسکتی۔''

عافیہ کی ساس بہن کے ہاں کہنے کے دوسرے ہی دن اپنی ایک بیٹی اور رحیم اللہ کے ساتھ گاؤں روانہ ہوگئی' وہاں انہوں نے نہایت دھوم دھام سے منگنی کی رسم ادا کی اور تین ماہ بعد شادی کی تاریخ مقرر کی، عافیہ کے دل پر کیا گزر رہی تھی اس سے کسی کو کوئی سروکار نہ تھا۔ منگنی کے تیسرے دن تینوں افراد اپنی گاڑی سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں ان کی گاڑی ایک ٹرالر سے ٹکراگئی' حادثہ شدید تھا، رحیم اللہ اپنی دوسری شادی کا ارمان لیے اس جہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔

عافیہ کے تمام حالات زندگی یاد کرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ عافیہ کو شوہر کی موت پر رنجیدہ ہونا چاہیے یا خدا کی لاٹھی بے آواز ہے' جان کر اطمینان کا اظہار کرنا چاہیے۔ جانے میرا ذہن اس سوچ اور سوال کا کیا جواب دیتا کہ میرے شوہر گھر میں داخل ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ حادثے میں صرف رحیم اللہ ہی نہیں بلکہ اس کی ماں بھی انتقال کر گئی ہے جبکہ نند زخمی ہے۔ اس خبر سے میری اس بات کو تقویت مل رہی تھی کہ واقعی خدا کی لاٹھی بے آواز ہے' دنیا میں عافیہ کا دکھ سننے والا کوئی نہ تھا' مگر آسمانوں کا مہربان رب تو مظلوم کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں دیکھ رہا تھا۔ وہ تو بے آسرا عافیہ کے دل سے نکلنے والی فریادیں سن رہا تھا، وہ جو سب سے بہتر انصاف کرنے والا ہے۔

غزل

اوسط جعفری

بجھنے لگے چراغ تو گھر بولنے لگے
ایسی ہوا چلی کہ کھنڈر بولنے لگے

پتہ گرے تو چاپ لگے اُس کے پاؤں کی
سناٹا ہو تو راہگذر بولنے لگے

سہمے ہوئے تھے پھول گلچیں کے خوف سے
دیکھو فغانِ گُل کا اثر بولنے لگے

آندھی اٹھی تو سارا سماں ہی بدل گیا
خاموش جو کھڑے تھے شجر بولنے لگے

گہرائیوں میں ہوگا کہیں اس کا سلسلہ
طوفاں کے سامنے جو بھنور بولنے لگے

کیسا لہو اچھال گئے ہیں چمن کے لوگ
تاریک شب میں رنگِ سحر بولنے لگے

دورِ یزیدیت کا نہ منظر ہمیں دکھا
ایسا نہ ہو لہُو کا ہنر بولنے لگے

پھر کربلا میں تشنہ لبوں کا نزول ہو
مقتل سے اُٹھ کے پھر کوئی سر بولنے لگے

ممکن نہیں ہے جذبۂ اظہار روکنا
پہرے زباں پہ ہوں تو نظر بولنے لگے

اوسطؔ جو فاش ہوں اگر یہ خلوتوں کے راز
محلاتی سازشوں کا سفر بولنے لگے

اس ماہ کی عبرت اثر کہانیاں

چوتھی کہانی

کاش وہ لوٹ آتے

کوثر پروین

دیارِ غیر میں جا بسنے والی اولاد کے لیے تڑپتی ماں کی روداد



میں شام کی چائے تیار کرنے کچن میں آئی تو عادتاً میری نگاہ کچن کی کھڑکی سے باہر سامنے نظر آتے گرین گارڈن میں پڑی۔ میں چونک گئی۔ آج چند مہینوں بعد پھر مجھے وہ خاتون نظر آئی تھیں جن کی میں لاشعوری طور پر منتظر رہتی تھی۔

گرین گارڈن، اب سے تقریباً پانچ چھ سال پہلے جس بلڈنگ میں' میں رہائش پذیر تھی اس کے عقب میں بنایا گیا تھا۔ یہ گرین گارڈن میرے کچن کی کھڑکی سے صاف دکھائی دیتا تھا۔ سو میں کام کے دوران کچن کی کھڑکی سے گاہے بگاہے وہاں نظر ڈالتی رہتی تھی، جہاں کا ہر منظر مجھے صاف طور پر دکھائی دیتا تھا۔ میں خود بھی اکثر بچوں وغیرہ کے ساتھ گرین گارڈن میں جایا کرتی تھی......

ان خاتون کا قصہ یہ تھا کہ وہ ہر ماہ' دو ماہ بعد مجھے گرین گارڈن کی سنگی بینچ پر بیٹھی نظر آتی تھیں' میں نے انہیں جب دیکھا بہت ہی صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس، بڑے سے دوپٹے میں سر ڈھانپے، ان کے ہاتھوں میں قیمتی پرس اور چمکتے دانوں کی تسبیح ہی دیکھی، جو کبھی تیزی سے گردش کرتی، اور کبھی ساکت ہوتی' اس دوران میں وہ خاتون خاموشی سے، اپنے چہرے پر ایک اداسی سجائے اردگرد سے بے نیاز فضاؤں میں تکا کرتیں، مجھے نہ جانے کیوں ان خاتون کے چہرے میں ایک کشش سی محسوس ہوتی' دوسرے لفظوں میں' دوسرے لفظوں میں دل ان کی طرف کھنچنے لگتا تھا' سو میں نے اپنے دل میں یہ ارادہ کیا ہوا تھا کہ اب جب کبھی بھی وہ خاتون مجھے نظر آئیں گی میں ان سے نہ صرف ملوں گی بلکہ ان کی خاموشی اور اداسی کا سبب بھی دریافت کروں گی۔ اور اب وہ مجھے تقریباً دو ماہ کے وقفے کے بعد نظر آئی تھیں تو میں نے گھر کے تمام کام فٹافٹ نبٹائے تھے، اور بچوں کے ساتھ گرین پارک میں چلی گئی تھی۔

میں ایک پڑھی لکھی خاتون ہوں' میرے شوہر تلاش معاش کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہیں، سو میں نے اپنے تین بچوں کو خود سنبھالا تھا، اچھی تعلیم و تربیت کے ساتھ بہترین اوصاف سے بھی روشناس کرا رہی تھی، میں اپنے بچوں کی ماں باپ اور دوست بھی تھی' میرے تینوں بچے احترام، محبت اور دوستی کے مشترکہ خوبصورت احساس سے بخوبی آگاہ تھے۔ مجھے ادبی کتابیں پڑھنے کا شوق ہی نہیں تھا' مختلف رسالوں میں افسانے بھی لکھا کرتی تھی' سو خوبصورت الفاظ اور جذبات سے مجھے ان خاتون تک پہنچنے کے بعد، اپنے محبت بھرے انداز تکلم سے انہیں دوست بنانے میں دیر نہیں لگی تھی۔

خاتون نے اپنا نام رفیع النساء بتایا تھا......وہ تقریباً دس سال پہلے لیکچرار کی حیثیت سے ریٹائر ہوئی تھیں۔ اچھے وقتوں کی تعلیم یافتہ تھیں' اور ایک متمول و معزز گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ دو بیٹیوں اور تین بیٹوں کی ماں تھیں' جو اعلیٰ تعلیم یافتہ' پروفیشنل شعبوں سے وابستہ تھے......انہوں نے بتایا کہ ان کی ایک بیٹی کلفٹن میں ہے' دو بیٹے ڈیفنس میں' ان کی بہویں بھی بہت اچھی ہیں' پوتے پوتیاں بھی ان کے نماز اٹھاتے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا جو سب سے بڑا ہے اور سب سے چھوٹی بیٹی بیرون ملک مقیم ہیں۔ وہ پوری طرح مطمئن زندگی بسر کر رہی ہیں۔

''میں یہاں بھی کبھی اپنی ایک دوست کے گھر آتی ہوں تو کچھ دیر کے لیے اس پارک آ کر بیٹھ جاتی ہوں' کھیلتے کودتے بچوں اور ان کی ماؤں کے پرسکون چہرے دیکھ کر میری ممتا کو بڑی ٹھنڈک ملتی ہے۔'' اور پھر رخصت ہونے سے پیشتر ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر بھی لیے تھے۔

دوسرے دن بھی ہماری ملاقات رہی اور بہت اچھی رہی۔ انہوں نے مجھے اپنے بچوں اور اسٹوڈنٹس

کے بہت مزے دار قصے سنائے تھے اور پھر باتوں باتوں میں ''مدر ڈے'' کا ذکر آ گیا تھا' تب اچانک ہی، رفیعہ آنٹی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے' اور میں جو ہر سال کی طرح' اپنے بچوں کے ''مدر ڈے'' پر دیئے گئے سرپرائزنگ گفٹس کے بارے میں انہیں خوشی خوشی بتا رہی تھی' یکدم ہی چپ ہو گئی تھی اور رفیعہ آنٹی نے بہت سادہ' بہت مدلل سوال کر دیا تھا۔

''ذونیرہ بیٹا! کیا ماں باپ، خاص کر ماں جیسے سچے اور مخلص رشتوں سے بھی' اظہار محبت کرنے کے لیے اولاد کو ۳۶۵ دنوں میں ایک دن ملتا ہے؟ ان کی طرف سے خیرات کے طور پر' صدقے کی طرح! کیا ماں اور اولاد کے درمیان قلبی تعلق، حرارت بھرا رشتہ اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ اب اغیار کی تقلید میں' ایک دن کی خیرات' مصنوعی گرم جوشی کی شکل میں' ماں کی جھولی میں ڈال کر' مزید ۳۶۴ دنوں کے لیے اولاد ماں کو بھلا دے' وہ اولاد جسے ماں اپنے تن میں زندگی اور دنیا میں جنم دیتی ہے...... محبت بھری آغوش اور پیار بھرے پل دیتی ہے' اپنی جسمانی تھکن کے باوجود راتوں کو اٹھ کر انہیں دودھ پلاتی ہے' ان کی غلاظت صاف کرتی ہے' اس کی انگلی تھام کر چلنا' اور گر کر سنبھلنا سکھاتی ہے' اسے تعلیم تربیت دیتی ہے' اپنی آنکھوں میں اس کی کامیابی کے خواب بننا شروع کر دیتی ہے اور جب اولاد کسی مقام تک پہنچتی ہے تو گویا وہ خود فتح کے نشے میں چور ہو جاتی ہے' اسی لیے نا کہ وہ پیدائش سے لے کر قبر تک' اولاد کو اپنے دل کا ٹکڑا، اپنے وجود کا حصہ سمجھتی ہے' اس کی خوشی ماں کی خوشی، اس کا غم ماں کا غم بن جاتا ہے' مگر یہ اولاد تمام تر احسانوں کے باوجود، اس محبت کو' ماں کی ممتا کو سال بھر بھول کر صرف ایک دن یاد کرتی ہے' جبکہ ہمارا دین اسلام تو کہتا ہے کہ ساری زندگی خدمت کر کے بھی ہم ماں باپ کا حق ادا نہیں کر سکتے' پھر یہ مدر ڈے محض ایک دن کی کاغذی پھول جیسی محبت اور رفاقت ماں تا کے اتھاہ جذبوں کا مقابلہ کر سکتی ہے؟''

میں نے نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا' ان کی تمام بات کا مقصد سمجھا اور کہا ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آنٹی۔ ہم اور ہماری نئی نسل نہ صرف اپنی اصل میراث سے دور ہو رہے ہیں، بلکہ ہم خود اپنے بچوں کو' اغیار کی ایک رسم کا پابند بنا کر' ان کو ان کے مذہب اور مسلم معاشرے کی قدروں سے دور کر رہے ہیں۔'' اور پھر میں نے ان سے وعدہ کیا کہ یہ حقیقت سمجھانے کے لیے میں اپنے بچوں سے ابتدا کروں گی کہ...... ماں کی عظمت کو کائنات سلام کرتی ہے' لہٰذا ''مدر ڈے'' ایک دن کی اندھی تقلید' اس کی عظمت کے شایان شان نہیں۔''

''دیکھو ذونیرہ! ہم نے کبھی سوچا' اللہ رب العزت نے بیشمار' ان گنت مخلوقات میں' صرف انسان ہی کو کیوں اشرف المخلوقات کا لقب دیا' صرف اس لیے کہ اس نے اپنی اس مخلوق کو علم کا زیور' عقل اور شعور دیا' جذبات اور احساسات کا لطیف ذوق دیا' اب بحیثیت انسان یہ ہمارا کام ہے کہ صحیح یا غلط کی پہچان رکھتے ہوئے اپنے لیے اچھے برے راستے کا تعین کریں۔ بیٹا! تم بھی پڑھی لکھی ہو' میں بھی استاد کے درجے پر فائز رہی ہوں۔ لہٰذا ہمارا یہ کام ہے کہ نئی نسل کے بچوں کو اپنی دینی اقدار سے' اپنے پاکیزہ اسلامی معاشرے کے روشن پہلوؤں سے آگاہ کریں' ''مدر ڈے'' منانا برا نہیں' مگر اس ایک دن کی یاد آوری تب ہی زیب دے گی' جب ہم پورے سال اپنی ماں کی عزت اور عظمت کا پاس کریں...... بہت آسان طریقے' اپنے پیارے نبیؐ کے اسوہ پر چل کر' احترام انسانیت' احترام ماں باپ کرتے ہوئے' اس دن کو ویل کم کہیں گے' تب ہی سچی خوشی ہمارے اندر پھوٹے گی۔''

ٹھنڈے میٹھے لفظوں کی ایک آبشار تھی جو میرے دل اور ذہن پر جاری تھی، اور پھر میں جب دوسرے روز اپنی والدہ سے ملنے گئی تو' ان سے ڈھیروں باتیں کیں۔ ان کے مسائل سنے' دواؤں کا پوچھا' حالانکہ گھر میں موجود تمام افراد والدہ کا خیال رکھتے تھے مگر اب کی مرتبہ میں کھڑے کھڑے ان کی خیریت دریافت کرنے نہیں گئی تھی بلکہ پہلی مرتبہ میں نے اپنی والدہ کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اپنا موبائل آف کر دیا تھا' گھر شوہر' بچے ان کی فکریں' کچھ دیر کے لیے دل میں لاک کر دی تھیں' ہمیشہ کی طرح جلدی جانے کا شور نہیں مچایا تھا اور پھر میں نے والدہ سے ملنا معمول بنا لیا تھا۔ دو تین دن کے وقفے سے میں ان کی خبر گیری کرنے لگی تھی' جبکہ اس سے پہلے میں محض پندرہ منٹ کی دوری پر واقع اپنے میکے جانے میں دو سے ڈھائی مہینے لگا دیتی تھی۔ والدہ کے شکوؤں کا جواب' میرے لبوں پر ہی دھرا رہتا تھا کہ ''امی! گھر کے کاموں سے وقت ہی نہیں ملتا۔'' میری سوچ میں یہ مثبت تبدیلی رفعیہ آنٹی کے ذریں خیالات سن کر ہی آئی تھی۔

مدر ڈے سے کوئی چار دن پہلے' مجھے رفعیہ آنٹی نے کال کر کے' اپنے گھر انوائٹ کیا تھا۔ وہاں جا کر میں ان کے بیٹوں' بہوؤں' اور پوتا پوتی سے ملی تھی...... پر تکلف کھانے اور چائے سے لطف اندوز ہونے تک میں رفعیہ آنٹی اور ان کے گھر والوں کے درمیان محبت واہمیت سے آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ مشفق ماں اور ساس ہی نہیں، محبت کرنے والی دادی بھی تھیں اور پھر وہ مجھے اپنے بیڈروم میں لے گئیں' وہاں جا کر میں گنگ سی ہو گئی تھی بیڈروم کی چاروں دیواروں پر ان کے بچوں کی، پالنے کی عمر سے لے کر بچپن، لڑکپن، اور جوانی کی تصاویر موجود تھیں۔

''ذونیرہ' یہ میرا سب سے بڑا بیٹا ہے' جس نے مجھے مامتا کے جذبے سے پہلی بار روشناس کرایا' میرے اپنے وجود کا وہ حصہ...... جسے پا کر میں نے خود کو مکمل جانا ...... جس کی پہلی زندگی سے بھری رونے کی آواز اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ میں اب بھی اس نرم اور ملائم' انگلی کا لمس محسوس کرتی ہوں' جب پہلی مرتبہ اس نے میری انگلی تھامی تھی' میں وہ وقت کیسے بھول سکتی ہوں' جب وہ میرے ہاتھوں سے کھاتا تھا' میرے بغیر سوتا نہیں تھا، اور پھر جیسے پرندوں کے بچے پر آنے پر' اڑان کا شوق رکھتے ہیں' ویسے ہی وہ بھی اچھی تعلیم، اچھے مستقبل کے لیے اڑان لے کر بیرون ملک چلا گیا، بہت ہی لمبا عرصہ گزر گیا ہے مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا، بس کبھی کبھی سالوں میں فون کر لیتا ہے' وہ وہاں اپنی زندگی جی رہا ہے اور خوش ہے' میں بھی اس کی خوشی میں خوش ہوں' اور اس کے لیے مزید خوشیوں بھری زندگی کی دعا کرتی ہوں۔ مگر اس ماماتا کا کیا کروں؟ جواب بھی چاہتی ہے کہ گیا وقت لوٹ آئے' جب وہ میرا معصوم بچہ، میری انگلی تھامے' میرے ساتھ بس میں سفر کرتے ہوئے رش کے باعث ہونے والی پریشانی کو بھانپ کے' ایئر پورٹ کا علاقہ آ جانے پر' رن وے میں کھڑے ماڈل جہاز کو دیکھ کر میرا دامن کھینچتے ہوئے کہتا تھا۔ ''امی بس میں بہت رش ہے نا! آپ پریشان نہ ہوں میں بڑا ہو کر آپ کو جہاز میں لانڈھی لے جاؤں گا۔'' ذونیرہ! میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ میرا بیٹا لوٹ آئے جو مجھے اپنے ساتھ امریکہ نہ سہی، گاڑی میں بٹھا کر لانڈھی تو لے جائے۔''

آنٹی اپنے بیٹے کی تصویر کو چوم کر' اس کی معصومیت کو یاد کر کے بے اختیار رو دی تھیں۔

اور میں اب جان چکی تھی کہ رفعیہ آنٹی کی وہ خاص اداس اپنے پاس موجود، اپنے ایک بچے سے جدائی کا شاخسانہ ہے!!

اس ماہ کی عبرت اثر کہانیاں

پانچویں کہانی

مہرباں یہ کیا کِیا تُو نے

عائشہ نور عاشا

اس بیوی کی کہانی جسے ناکردہ جرم کی سزا ملی!



''میرے ماما جی نے صائمہ کا ہاتھ مانگا ہے۔ میں نے ہاں کردی ہے' اب وہ کہتے ہیں شادی بھی جلدی کرنی ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟'' عابدہ نے اپنے شوہر افضال سے بڑی بے نیازی کے ساتھ مشورہ مانگا۔

''کیا مطلب؟'' ''تم نے مجھ سے پوچھنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور رشتے کے لیئے ہاں کردی، اب تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟'' افضال کے لہجے میں ناراضگی صاف ظاہر تھی۔

''جب ماما جی آئے تو آپ گھر پر نہیں تھے اور اگر ہوتے بھی تو' میں انہیں انکار نہیں کرسکتی تھی' ویسے بھی انہوں نے مجھ سے مانگا ہی کیا ہے، بیٹی! ہم نے کسی کو تو دینی ہی تھی، تو پھر خاندان میں کیا برائی ہے اور دیکھو یہ ٹھیک ہے کہ ہماری صائمہ ابھی سترہ برس کی، جبکہ ماما جی کا بیٹا سفیان تیس سال کا ہے مگر وہ سمجھ دار ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ماما جی کی دو مربع زمین ہے' سفیان ساری زندگی بھی کام نہ کرے تو بھی دونوں میاں بیوی کو کوئی تنگی نہ ہوگی۔''

''بات تو تمہاری سولہ آنے درست ہے۔'' افضال ایسا ہی تھا، اپنی بیوی کے آگے تو فوراً ہی سر جھکا دینے والا، اپنے آپ میں رہنے والا، اسے فرق نہیں پڑتا تھا کہ بات گائے بھینس کی ہو رہی ہے یا اس کی بیٹی کی۔''

☆......☆

چار بھائیوں کی بہن صائمہ کی شادی سفیان سے ہوگئی' سفیان کوئی کام نہیں کرتا تھا، جو پیسے زمینوں سے آتے' عیاشی میں اڑا دیتا، اس کی صحبت ہی بری تھی، جو وہ شادی کے بعد بھی نہ چھوڑ سکا کیونکہ زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب انسان چاہتے ہوئے بھی بری صحبت سے دور نہیں رہ پاتا' کچھ اس کی کمزوریاں تھیں، کچھ اس کے دوست

راحیل کی، جو دونوں بظاہر تو دوست تھے مگر ایک دوسرے کو نیچا دکھاتے رہنا ان کی عادت تھی، مگر ان تمام باتوں کے باوجود سفیان صائمہ سے بہت پیار کرتا تھا' وہ صائمہ کا بہت خیال رکھتا، وہ جس چیز کی خواہش کرتی، سفیان مہربان شوہر کی طرح محبت سے بیوی کی ہر ضد ہر خواہش پوری کرتا' شادی کے بعد صائمہ کو دکھ کا گمان بھی نہ گزرا تھا۔

دن یونہی گزرتے رہے اور جلد ہی اللہ چاند سے بیٹے سے نوازا تو ان کی خوشیوں میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ صائمہ اپنی خوش بختی پر بہت نازاں تھی، وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ خوبصورت زندگی جلد ہی عذاب بن جائے گی۔ ہوا یوں تھا کہ سفیان نے اچانک ہی راحیل کے گھر بہت زیادہ آنا جانا شروع کردیا تھا، اور بیوی اور بچے پر اس کی توجہ کم سے کم ہوتی جارہی تھی جس کی وجہ راحیل کی بہن شازیہ تھی۔

''راحیل لالہ گھر پر نہیں ہے۔'' شازیہ نے لال شربت کا گلاس سفیان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

''میں جانتا ہوں۔'' سفیان نے شربت کا گلاس میز پر رکھا اور شازیہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھر گویا ہوا'' جانتا ہوں وہ کسی دوست سے ملنے گیا ہے اور کب آئے گا۔''

''تو پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' شازیہ نے سفیان کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''میں تو اس پائل کے لیے آیا ہوں جس کی آواز ہر روز یہاں سنتا ہوں' اور وہ آواز میرا پیچھا کرتے کرتے میرے گھر تک پہنچتی ہے اور پھر مجھے یہاں آنے پر مجبور کرتی ہے۔''

''اس کا مطلب' میری پائل نے مجھ پر احسان کیا اور میرے دل کا پیغام تمہارے دل کو دیا، میں تو کبھی بھی اس کا احسان نہ چکا پاؤں گی۔''

''تم سچ بول رہی ہو؟'' سفیان نے شازیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں! آنکھیں بند کر کے یقین کرلو اس بات کا۔''

''آزمالوں تمہاری محبت کو؟''

''جب جی چاہے تمہارا، آزمالینا!'' شازیہ نے سفیان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔ یہ زیارت نہ جانے کب تک جاری رہتی کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کا سلسلہ توڑ دیا تھا۔

''اماں ہوں گی!'' شازیہ ہڑبڑا گئی تھی۔ ''تم یہیں رکو، جب اماں گیٹ سے اندر داخل ہوں گی تو فوراً اس دروازے سے باہر نکل جانا۔'' شازیہ نے گلی میں کھلنے والے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا......دروازہ کھولا تو اماں ہی تھیں، وہ سیدھی برآمدے میں جا کر بیٹھ گئیں اور سفیان باہر گلی میں کھلنے والے دروازے سے نکل گیا۔

☆......☆

وقت کے ساتھ سفیان اور شازیہ کے مراسم بڑھتے جا رہے تھے، اکثر و بیشتر وہ اسی وقت راحیل کے گھر جاتا جب وہ گھر پر نہ ہوتا۔ ان دنوں راحیل چند روز کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور اس بات کا سفیان سے زیادہ فائدہ کون اٹھا سکتا تھا، سو وہ دن رات شازیہ کی گلی میں رہتا کہ کب اس کی اماں گھر سے نکلیں اور شازیہ سے ملاقات ہو، اس شام بھی ذرا تگ و دو کرنے کے بعد سفیان کو یہ موقع میسر آ ہی گیا تھا۔

''چلو یہاں سے کہیں دور چلتے ہیں، جہاں ہمیں کسی کا ڈر نہ ہو، میں تمہیں ایک گھر لے کر دوں گا، پھر ہم شادی کرلیں گے۔''

''یہ سب اتنا آسان نہیں ہے، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔'' شازیہ نے سفیان کے کندھے پر سر ٹکاتے ہوئے کہا تھا۔

''تم چلو تو سہی، مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا؟''

''یہ اعتبار ہی تو ہے جو تم اس وقت میرے گھر میں ہو۔''

''تو ٹھیک ہے میں آج رات دو بجے تمہارے گھر کے دروازے پر تمہارا تب تک انتظار کروں گا جب تک تم نہ آ جاؤ۔''

''تم مذاق کر رہے ہو؟'' شازیہ نے سفیان کے کندھے سے سر اٹھا کر حیرانگی سے کہا تھا۔

''نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں، ہم شادی کرلیں گے، اور تمہیں کیا لگتا ہے، میں تم سے جھوٹ بول سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں آ جاؤں گی۔'' سفیان سے وعدہ کرتے ہوئے شازیہ نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنا آشیانہ چھوڑ کر نیا گھر کیسے بنا پائے گی۔ جو لڑکیاں محبت کے نام پر، اپنے والدین کی عزت پاؤں تلے روند کر گھر سے نکل پڑتی ہیں وہ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ ان سے جڑا ہر رشتہ، ان سے محبت ہی تو کرتا ہے، تو کیوں نہ ایسے اقدام پر مجبور کرنے والے مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لفظ محبت ہی ان سے چھین لیا جائے اور اس کی جگہ لفظ ''ہوس'' سے پر کروائی جائے کیونکہ یہ ہوس ہی ہوتی ہے جو تمام اخلاقی حدیں پار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

☆......☆

''سفیان ہم شادی کب کریں گے؟ تم نے کہا تھا جلدی کرلیں گے اور آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔'' شازیہ کے سوال میں شکوہ بھی تھا اور شکایت بھی۔

''تمہیں معلوم ہے کہ جس رات تم میرے ساتھ اپنے گھر سے نکلی ہو، راحیل اسی رات کی صبح ہی واپس آ گیا ہے اور وہ اب تمہاری تلاش میں ہے، اس نے پولیس چوکی میں بھی میری رپورٹ کرادی ہے، ان حالات میں نکاح کے لیے مولوی اور گواہ وغیرہ

لانا بہت مشکل ہو رہا ہے' خیر آج ابھی خاور کھانا دینے آتا ہے تو میں اس کے ساتھ جاتا ہوں تاکہ اس بارے میں اس سے بات کر سکوں۔'' عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

''خاور ہی ہوگا' میں جا رہا ہوں' دروازہ بند کر لو اور تب تک نہ کھولنا جب تک تمہیں یقین نہ ہو جائے کہ میں ہی ہوں۔'' یہ کہہ کر سفیان چلا گیا تھا' اور شازیہ پریشانی کے عالم میں سر تھام کر بیٹھ گئی تھی۔

☆......☆

''ماں جی آپ کی بیٹی اپنی مرضی سے گئی ہے' میرا شوہر اسے اٹھا کر تو نہیں لے گیا، شازیہ نے میرا گھر اجاڑ دیا ہے، اور آپ لوگ مجھے ہی الزام دے رہے ہیں'' بے چاری صائمہ کو کسی سے بات کرنا بھی نہیں آتی تھی، یہ اس کی کم عمری کا تقاضا تھا اور اب اگر وہ یہ سب کہہ رہی تھی یہ اس کے حالات کا نتیجہ تھا۔ یہ سب سن کر شازیہ کی ماں کے ہونٹ تو جیسے سل گئے تھے۔

''آپ بھی ایک عورت ہی ہیں، کیا کبھی ایسا ہوا کہ عورت ہی اپنا گھر اجاڑنے میں شوہر کے ساتھ شریک ہو؟ آپ کی بیٹی نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا' آپ ذرا سوچیں، میں اس ننھے سے بچے کو لے کر کہاں جاؤں گی؟ اور جو ابھی اس دنیا میں نہیں آیا اس کا کیا کروں؟'' صائمہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی' یہ برسات ایک ہفتہ سے جاری تھی اور دکھ کے بادل تھے کم کم ہونے کا نام بھی نہ لے رہے تھے۔

''سب جانتی ہوں بیٹا شازیہ نے ہمیں اور سفیان نے تمہیں دھوکا دیا ہے' یہ بھی سمجھ لو کہ اگر میں یہاں نہیں آؤں گی تو راحیل آ کر تمہیں تنگ کرے گا اور ہاں میری بیٹی کو جب ہماری عزت کا ہی خیال نہیں آیا تو وہ تمہارے بارے میں کیا سوچے گی'' شازیہ کی اماں یہ سب کہتے ہوئے بہت شرمندہ تھی۔

☆......☆

سفیان دوپہر کو گیا تھا اور اب رات ہو رہی تھی مگر وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا' شازیہ بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا'' ......کون؟''

''میں خاور ہوں' جو دوپہر کو کھانا دینے آتا ہوں۔''

''سفیان بھی آپ کے ساتھ گیا تھا، وہ ابھی گھر تو نہیں آیا۔'' شازیہ بند دروازے کے پیچھے کھڑی سوچ رہی تھی۔

''بھابی اسے پولیس نے پکڑ لیا ہے۔'' خاور نے گویا ایک دھماکہ کیا تھا۔

''خاور بھائی! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' شازیہ شدید پریشانی کے عالم میں بولی' اور ساتھ ہی اس نے دروازہ کھولا تاکہ ساری بات معلوم ہو سکے۔

''جی بھابی! جب ہم یہاں سے کچھ دور گئے تھے تب پولیس نے سفیان کو پکڑ لیا تھا جبکہ میں کسی نہ کسی صورت فرار ہو گیا تھا، اگر میں ان کے ہاتھ آ جاتا تو وہ میرے ذریعے آپ تک پہنچ جاتے۔ رہی بات سفیان کی تو وہ مر جائے گا مگر آپ کا پتہ نہیں بتائے گا۔''

''خاور بھائی یہ پولیس چوکی کس طرف ہے؟ میرا سفیان سے ملنا بہت ضروری ہے۔'' شازیہ بھانپ گئی تھی کہ یہ سب راحیل نے کیا ہے اور اب جان چھڑانا آسان نہیں ہے۔

''آپ ایسا کریں کل صبح دس بجے تک تیار ہو جائیے گا، میں آپ کو لے چلوں گا۔'' یہ کہہ کر خاور تو چلا گیا اور شازیہ صبح کا انتظار کرنے لگی۔ دوسری طرف صائمہ کو بھی سفیان کی گرفتاری کی اطلاع مل گئی تو وہ بھی صبح سفیان سے ملنے تھانے آئی تھی جہاں شازیہ پہلے سے ہی موجود تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ شازیہ سے کچھ کہتی سنتی، راحیل بھی وہاں پہنچ گیا تھا اور بنا کچھ کہے سنے، اپنی بہن شازیہ کا بازو پکڑ کے

گھسیٹتے ہوئے اسے وہاں سے لے گیا تھا۔
سلاخوں کے پیچھے کھڑے سفیان کو صائمہ بس دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ جہاں کہنے کو بہت کچھ ہو، اور شکایات کے انبار لگے ہوں وہاں خاموشی ڈیرے جمالیتی ہے۔ وہ مرے مرے قدموں سے سلاخوں کے بالکل پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔
''صائمہ یہ تم نے اچھا نہیں کیا!'' سفیان نے بالکل سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔
''میں نے...... کیا کیا ہے میں نے!'' صائمہ نے مرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''جانتا ہوں شازیہ کو تم نے پکڑوایا ہے' راحیل کو تم ساتھ لے کر آئی ہو۔'' سنگ دل مخلوق جسے ہم عرف عام میں مرد کہتے ہیں وہ اگر صائمہ کی آنکھوں میں جھانک لیتا تو کبھی اس پر یہ الزام نہ لگاتا۔

☆......☆

دن گزرتے رہے اور پہلے ہفتے' پھر مہینے اور آخر سال ہوا اور پھر صائمہ نے اپنی مکمل کوشش کے بعد آخر کار سفیان کو رہا کروالیا۔ اس دوران وہ جان چکا تھا کہ صائمہ نے شازیہ کو نہیں پکڑوایا بلکہ راحیل خود وہاں گیا تھا۔ سفیان جب رہا ہو کر گھر آیا تو اس کے پہلے بیٹے فیضان کے بعد عیان بھی دنیا میں آ چکا تھا۔ صائمہ کی گود میں پھول سا بچہ دیکھ کر اس کی خوشی آسمان کو چھونے لگی تھی۔
''صائمہ میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا' میں معافی کے قابل نہیں ہوں اور نہ ہی میرا جرم ایسا ہے کہ تم اسے بھول سکو، پھر بھی میں تم سے معافی کا طلب گار ہوں' میری پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر معاف کر دو۔''
صائمہ سفیان کے معافی مانگنے کے جواب میں آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بس اسے تکے جارہی تھی۔

''ان بچوں کی خاطر مجھے معاف کر دو۔''
سفیان صائمہ کے قریب آ کر اس کے آنسو پونچھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی، سفیان نے دروازے پر جا کر دیکھا تو اسکا ایک بہت پرانا دوست وہاں موجود تھا۔ اس نے سفیان کو کسی نہایت ہی ضروری کام کے لیے دس منٹ کے لیے باہر چلنے کو کہا تھا، تو سفیان صائمہ کو بس دس پندرہ منٹ میں واپس آنے کا کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔
صائمہ نے سفیان کو دل سے معاف کر دیا تھا' اس کی زندگی میں سفیان کے علاوہ اور تھا بھی کون؟ ماں باپ نے تو ان حالات میں اس کا ساتھ دینا تو دور کی بات تسلی کے دو بول بھی نہ بولے تھے' وہ تمام تر مشکلات اکیلی برداشت کرتی رہی تھی اور اب جب سفیان واپس آ گیا تھا تو، وہ کیوں نہ اسے معاف کر کے اپنا گھر بساتی مگر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے، سفیان کو گھر سے نکلے ابھی آٹھ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ گھر کے باہر سے ٹی ٹی کے فائر کی آواز سنائی دی تھی، صائمہ نے اللہ خیر کہتے ہوئے عیان کو گود سے نکال کر چارپائی پر لٹایا ہی تھا کہ پڑوس کی ایک عورت اس کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔
''صائمہ!...... صائمہ جلدی چل، غضب ہو گیا ہے۔''
''کیا ہوا......؟ کچھ تو بتاؤ؟'' صائمہ شدید پریشانی کے عالم میں اس عورت کے ساتھ چل پڑی تھی۔ گلی میں ایک ہجوم تھا، وہ ہجوم کو چیرتی آگے بڑھی تو سفیان خون میں لت پت نعش کی صورت پڑا ہوا تھا۔
سفیان کو راحیل نے یہ موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہ صائمہ سے وفا کرتا' سفیان جو کچھ دیر پہلے اسے کبھی دکھ نہ دینے کا وعدہ کر کے گیا تھا' وہی اب راحیل کے ہاتھوں اس کی بہن شازیہ کو گھر سے بھگانے کے جرم میں سزا کا شکار ہو کر زندگی سے بیگانہ کر گیا تھا۔☆☆

ناول

کاوش صدیقی

خانقاہ

قسط نمبر: 08

خانقاہوں' آستانوں' درباروں' مزاروں سے جڑی ایک مرد درویش کی داستانِ عجب
تصوف اور محبت کی پر اسرار دنیا کی کہانی

''یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔!'' فرحان نے بے بسی سے کہا۔
وہ اس وقت خانقاہ سے واپس آ رہے تھے۔ وہاں جو عبداللہ شاہ گیلانی اور قادری سرکار کی گفتگو ہوئی





تھی۔ اور جس طرح دونوں نے ایک دوسرے سے معاملات کو پرکھا سمجھا تھا۔ یہ سارا معاملہ فرحان یعقوب کی عقل سے ماورا تھا۔

''قادری سرکار روشن ضمیر صاحبِ ادراک ہستی ہیں۔ فرحان تم کتنے خوش قسمت ہو کہ ان سے ملتے رہے، ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔

''ہاں ملتا تو میں بے شک رہا ہوں۔ مگر جو کچھ آج میں نے تمہارے حوالے سے دیکھا ہے۔ اس نے مجھے حیران کر دیا۔'' فرحان یعقوب نے صاف گوئی سے کہا۔ ''جس اپنائیت کا مظاہرہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے تمہاری قسمت پر رشک آ گیا۔!'' فرحان یعقوب کے لہجے میں بے پناہ عقیدت تھی۔ ''تم میں ضرور کچھ خاص ہے۔!''

''پتا نہیں۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ ''یہ تو ان کا نظر کرم ہے۔ ورنہ مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔!''

''وہ جوہری ہیں۔ ہیرے کی قدر جانتے ہیں۔ پارس ہیں۔ مس خام کو کندن بنا دیتے ہیں۔ بھٹی میں جلا کر کندن بنا کر واپس کرتے ہیں۔ شائد ہم میں کچھ نہیں۔!'' فرحان یعقوب کے لہجے میں تاسف تھا۔ ''ابھی تو منزل بہت دور ہے۔!''

''یار تم یونہی دل برداشتہ ہو رہے ہو۔'' عبداللہ شاہ گیلانی نے اس کو دلاسہ دیا۔ ''میں کون سا ان کا مرید ہو گیا ہوں۔؟''

''یار عبداللہ میں تم سے حسد نہیں محسوس کر رہا۔ بلکہ تم پر، تمہاری قسمت پر رشک کر رہا ہوں۔ خوش ہو رہا ہوں۔ میرے دوست میں ایسی خصوصیت ہے جو اس کو دوسروں سے الگ کر دیتی ہے۔!''

عبداللہ شاہ کچھ نہ بولا۔ بس خاموشی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں فرحان کا گھر آ گیا۔ کار کا ہارن سنتے ہی گن مین نے دروازہ کھولا۔ اس کے عقب سے بالا برآمد ہوا۔ فرحان نے گاڑی اندر پورچ میں لے جا کر کھڑی کی۔

''یار مجھے اجازت دو۔!'' عبداللہ شاہ نے اس کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''خیریت۔۔؟ کھانا کھا لو۔'' فرحان یعقوب نے حیرت سے کہا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو قادری سرکار کے ہاں کھانا کھایا ہے۔ اس لئے قطعاً بھوک نہیں ہے۔ وہاں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔

''چلو۔ کوئی بات نہیں۔!'' فرحان یعقوب نے خوش دلی سے کہا۔ ''اب کب ملاقات ہو رہی ہے۔؟''

''انشاء اللہ جلدی۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا اور ہاتھ ملا کر واپس ہو گیا۔ بالا پیچھے گاڑی لئے کھڑا تھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور فرحان یعقوب کو خدا حافظ کہتا ہوا گاڑی میں آ بیٹھا۔ بالے نے سائڈ سے گاڑی باہر نکالی اور سڑک پر آ کر اس نے رخ اپنی مطلوبہ سمت کر دیا۔

گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ بالے نے کنکھیوں سے عبداللہ شاہ گیلانی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اس قدر خاموشی تھی کہ بالا کی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ پوچھے۔ آج اسے شاہ عبداللہ گیلانی بہت مختلف لگ رہا تھا۔ یوں جیسے ایک سمندر جو اوپر سے بہت پرسکون ہو، مگر اس کے اندر سونامی جنم لے رہا ہو۔ بالے کی چھٹی حس نے بتایا۔ عبداللہ شاہ گیلانی بدل گیا ہے۔ مگر کیا بدل گیا ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ بھی نہیں جانتا تھا جو شاہ ہارون کے رازوں کا امین تھا۔

''یہ خادم حسین کون ہے۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے پوچھا۔

حسین۔ خیر سے اب سیاست میں آ گیا ہے۔ وزیراعظم بننے کے لئے۔!'' تعارف کروانے والے کے انداز میں بے پناہ حقارت اور بے پناہ تضحیک تھی۔

''چل بھئی کاغذ دے ان کو۔!'' کسی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی ایک آدمی ایک کاغذ، قلم اور انک پیڈ لے آیا۔

''بھئی خادم حسین ان پر سائن کر دو۔!'' دو آدمیوں نے آ کر خادم حسین کو دائیں بائیں سے پکڑ لیا۔

''یہ کیا ہے۔؟'' خادم حسین نے پوچھا۔ اس کی آواز میں کسی گھبراہٹ کا قطعاً کوئی شائبہ نہیں تھا۔

''وہی جو علی مراد نے تیرے لئے کیا۔ تیرے حق میں دست برداری کا اعلان۔ جس کو تو نے لمحوں میں میڈیا تک پہنچا دیا۔''

اچھا تو یہ کھیل ہارون گیلانی کے شاطر ذہن نے رچایا تھا۔

''میں کوئی دستخط نہیں کرونگا۔!'' خادم حسین نے صاف، ہموار لہجے میں کہا۔ ''اور علی مراد کو میں نے نہیں کہا تھا کہ وہ میرے حق میں دست بردار ہو۔ وہ اپنی مرضی سے دست بردار ہوا۔!''

''اوے خادے۔!'' کسی نے کہا۔ ''شاہوں کے حضور گستاخی نہ کر، اِدھر پورے علاقے میں کسی کی مرضی ہوتی ہے کبھی۔ جو چاہتے ہیں۔ وہ ہوتا ہے اور وہ سب شاہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ بھلا کسی کمی کمار کی جرأت کہ وہ اپنی سوئی برابر بھی مرضی کر سکے۔!''

''تو چپ رہ طارق میں ذرا اس کی زبان کے کس بل نکالتا ہوں۔!'' اچانک کسی نے عقب سے مداخلت کی۔

''ہاں بھئی شیدے یہ تیرا ہی کام ہے۔!'' طارق ہمارے سامنے سے ہٹ گیا۔ چند ہی لمحوں میں ایک سیاہ رُو چھ فٹ سے زائد لحیم شحیم آدمی ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے خادم حسین کو گردن سے اٹھا کر تقریباً دو تین فٹ بلند کیا۔ دُبلا، پتلا چھریرے بدن کا خادم حسین ہوا میں بلند ہو گیا۔ اس نے خادم حسین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چند لمحوں تک غور سے دیکھا۔ پھر اچانک خادم حسین کو چھوڑ دیا۔ خادم حسین پنجوں کے بل گرا۔ اس نے بڑی خوبی سے اپنا توازن برقرار رکھا۔

شیدے کو غالباً اس بات کی توقع نہیں تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا زناٹے دار تھپڑ خادم حسین کے منہ پر پڑتا۔ فضا میں ایک نئی آواز گونجی۔

''ٹھہرو۔۔!'' شیدے کا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا۔

''ٹھہرو۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مار پیٹ کی ضرورت نہیں۔ انہیں کون لایا ہے۔؟''

''عبداللہ۔۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی کی بھاری آواز گونجی۔ ''اسی لئے ہم آپ کو یہاں آنے سے منع کر رہے تھے۔ ان معاملات کو ابھی آپ نہیں سمجھتے۔ جس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اُسی طرح سے بات کی جاتی ہے۔!''

''لیکن یہاں کوئی تشدد نہیں ہوگا۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''پھر انہیں الیکشن سے دست برداری پر کیوں مجبور کیا جا رہا ہے۔ میں تو ایسا بالکل نہیں چاہتا۔۔؟''

''بات آپ کے چاہنے یا نا چاہنے کی نہیں ہے عبداللہ۔۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔ ''ہمارے علاقے میں کوئی شخص ہماری مرضی کے بغیر سانس نہیں لے سکتا۔ ان کے جسم و جان صرف ہمارے اشارے پر حرکت کرتے ہیں۔ ان کی جرأت کیسے ہوئی شاہ ہارون گیلانی کی رعایا ہوتے ہوئے ہمارے مقابلے پر آنے

کی۔!''

''یہ سب گئے وقتوں کی باتیں ہیں۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے جواب دیا۔'' آج کی دنیا بدل گئی ہے ہر شخص اپنی ذات کی سطح پر احترام کا مستحق ہے۔اور ہمیں اس کی ذات کی عزت کرنا ہوگی۔کیونکہ یہ سب، اور ہم سب خدا کے بندے ہیں، ہر جسم و جان اُسی کی ملکیت ہے۔!''

''عبداللہ آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔!'' شاہ ہارون گیلانی کی پیشانی پر پسینے کے قطرات چمکنے لگے۔

''آپ حویلی میں جائیں۔آرام کریں۔!''

''نہیں۔چچا جان۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے بہت مضبوط لہجے میں جواب دیا۔'' پہلے انہیں چھوڑ دیئے پھر ہم جائیں گے۔!''

صورت حال اچانک ہی پلٹ گئی تھی۔ چچا بھتیجے میں اختلاف نمودار ہونے لگا تھا۔

''چھوٹے سرکار آپ اوپر چلیں۔۔!'' طارق نامی آدمی نے جھک کر عبداللہ شاہ گیلانی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔''یہ سارے معاملات تو شاہ جی کے روزانہ کے معمولات ہیں۔'' اس کا انداز بڑا عاجزانہ تھا۔

''ہوگا یہ معمول کا حصہ۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے بدستور اُسی لہجے میں کہا۔'' مگر آج یہ معاملہ ہم سے جڑا ہے۔اگر ان کو نہیں چھوڑا گیا تو ہم خود خادم حسین کے حق میں دست برداری کا اعلان کردیں گے۔!''

''کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کا لہجہ مارے حیرت کے تبدیل ہوگیا۔عبداللہ شاہ گیلانی کے الفاظ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ خود شاہ ہارون گیلانی کے لئے بھی بے حد حیران کن تھے۔

''ٹھیک کہہ رہے ہیں ہم۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔''جن کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا ہو۔ہم ان کو کیسے غلام بنا سکتے ہیں۔؟ ان کے بدن ضرور ہمارے حکم پر حرکت کرتے ہیں۔مگر ان کی روحیں آزاد ہیں۔ اور یہ آزادی خدائے بزرگ و برتر نے عطا کی ہے۔ہم کون ہیں ان کی آزادی کو قید کرنے والے۔ چلو چھوڑ و۔۔انہیں۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی کے لہجے میں ایسی گرج، ایسی چمک تھی کہ ہمیں پکڑے ہوئے لوگ اچانک پیچھے ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔

اچانک سیڑھیوں سے بیک وقت کئی لوگوں کے اترنے کی آوازیں آنے لگیں۔ چند ہی لمحوں میں کچھ عورتیں اور لڑکیاں پھولی سانسوں کے ہمراہ اندر داخل ہوئیں اور انہوں نے حواس باختہ انداز میں کہا۔'' شاہ جی جلدی اوپر چلیں۔سیدانی یاد فرمارہی ہیں۔قادری سرکار حویلی میں پہلی بار تشریف لائے ہیں۔!''

''قادری سرکار۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی یوں چونکا جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔'' سرکار آئے ہیں۔۔۔!''

وہ اچانک دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

ہم سب حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔سب ہی حیران تھے۔شاہ ہارون گیلانی دیوان پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔جیسے سب کچھ ہار گئے ہوں۔

☆☆☆☆

عبداللہ شاہ گیلانی کی وارفتگی یہ دیوانگی ہم سب کی سمجھ سے بالاتر تھی۔اس کا رویہ، اس کا انداز کچھ بھی شاہ ہارون گیلانی سے لگا نہیں کھاتا تھا۔کیا کمال دکھایا تھا قادری سرکار کے اسم نے، ہماری محدود سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

لیکن کوئی ایسا ان دیکھا، غیر مرئی رشتہ، ناطہ عبداللہ شاہ گیلانی اور قادری سرکار کے درمیان موجود تھا۔جس کا ہمیں ادراک نہیں تھا۔سب دم بخود بیٹھے تھے۔ساکت و صامت۔گوشت پوست کے مجسموں کی طرح۔ البتہ ہم تینوں بہت ہی مطمئن تھے۔ ہمارا خیال صحیح تھا کہ قادری سرکار تک ہمارے اس طرح اٹھا لئے

جانے کی اطلاع پہنچ گئی ہوگی اور وہ اس معاملے میں خاموش نہیں رہیں گے۔ مگر وہ سیدھے یہاں آجائیں گے۔ کون ہے ایسا کہ جس کے پاس وہ سیدھے آگئے۔ اور اس تمکنت کے ساتھ کہ لوگ ان کی آمد کی اطلاع وفورِ مسرت سے سرشار ہو کر دے رہے ہیں۔

شاہ ہارون گیلانی جو دیوان پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اچانک اٹھے اور باہر کی طرف بڑھ گئے۔

قادری سرکار حویلی کے مرکزی ہال میں اس شہہ نشین پہ بیٹھے تھے۔ جہاں صرف شاہ ہارون گیلانی بیٹھتے تھے۔ ان کے اردگرد لوگوں کا جمگھٹا تھا۔ حویلی کے ملازمین بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ ''قادری سرکار آگئے، قادری سرکار آئے ہیں۔'' ملازمین کے عجیب حالات تھے۔ چند دنوں قبل جہاں شاہ سکندر گیلانی کے سوگ نے ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ وہاں خوشی اور مسرت رقص کر رہی تھی۔ شاہ ہارون گیلانی کو جیسے کوئی دیکھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ ورنہ جہاں جہاں سے وہ گزرتے تھے۔ انسان تو کجا، عالم سارا مودب ہو جاتا تھا۔ قدم ٹھہر جاتے اور نگاہیں سرنگوں ہو جاتیں۔ گردنیں جھک کے قدموں کے بوسے لینے لگتی تھیں۔ مگر آج وہ گزر رہے تھے۔ اور کوئی ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ملازمین، خادمین، گھر والے ان کے اردگرد سے گزر رہے تھے اور شاہ ہارون گیلانی سے بے خبر تھے۔

''الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔؟'' شاہ ہارون گیلانی کو قیامت کا غصہ آرہا تھا۔ ان کا جلال اپنے عروج پہ پہنچ رہا تھا۔ اچانک ان کے سامنے سے ریاضے کمدار کا گذر ہوا۔ انہوں نے کہا۔ ''ریاضے ادھر آ۔۔۔!''

مگر وہ ان کی بات سنے بغیر ان کے سامنے سے یوں گزر گیا کہ جیسے شاہ ہارون گیلانی نے اسے پکارا ہی نہیں، فقیقے نے اُسے آواز ماری ہو۔ وہ چلتے ہوئے حویلی کے مرکزی ہال میں پہنچے۔ شاہ ہارون گیلانی کی مسند پر قادری سرکار بیٹھے تھے۔ نہایت آب و تاب سے، ان کے ہونٹوں پر مخصوص محبت بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ نرم اور بھاری قطعی آواز حویلی کے مرکزی ہال میں بلند ہو رہی تھی۔

انہیں شدید غصہ آیا۔ کیوں آیا ہے یہ شخص۔؟ اور کیوں ان کی جگہ پر بیٹھا ہے۔؟ اور کس نے اس کو بیٹھنے دیا۔؟ اس پر تو ان کا بیٹا نعمان شاہ گیلانی بھی نہیں بیٹھتا۔ ان کی بیگم بھی اس کرسی پر نہیں بیٹھیں پھر یہ کیوں ہے۔؟ کیا ہے۔؟ کیا یہ میرے غیض و غضب سے نہیں ڈرتا۔؟ کسی نے بھی اس کو نہیں سمجھایا۔؟ بے شمار سوالات ان کے ذہن میں چکرانے لگے۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے عین اپنی کرسی کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ قادری سرکار نے انہیں دیکھا اور مسکرا دیئے۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ۔

انہیں پھر شدید غصہ آیا۔ ''تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم حویلی میں آ کر اس مقام پر، میری کرسی پر بیٹھو۔؟'' ان کی گرجدار آواز بلند ہوئی۔ انہوں نے خود اپنے کانوں سے اپنی آواز سنی۔

مگر قادری سرکار پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہیں بے حد حیرت ہوئی۔ ''اٹھاؤ اس کو۔۔۔!'' انہوں نے قادری سرکار کے سامنے ہاتھ باندھے ریاضے کمدار کو حکم دیا۔ مگر ریاضے کمدار نے ان کے حکم کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ بدستور قادری سرکار میں متوجہ رہا۔ تب اچانک انہیں ایک عجیب احساس ہوا۔ وہ سب کو دیکھ رہے ہیں۔ آوازیں سن رہے ہیں۔ مگر کوئی ان کو نہ دیکھ رہا ہے۔ نہ سن رہا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟۔ شاہ ہارون گیلانی زندگی میں پہلی بار خوف زدہ ہوئے۔

''کہیں مجھے کچھ ہو تو نہیں گیا۔؟'' دفعتاً ایک احساس ان کے اندر چمکا۔ انہوں نے اپنے بازوؤں میں بڑی زور سے چٹکی لی۔ تکلیف کی شدت سے ان کی کراہ نکل گئی۔ ان کے بدن میں تکلیف کو محسوس کرنے کی حس موجود تھی۔ گویا وہ زندہ تھے۔ مگر پھر کیا ہو رہا ہے یہ۔؟ کوئی ان کی موجودگی ان کی آواز کو سن کیوں نہیں رہا۔؟

بالا چونکا۔ ایک نظر عبداللہ شاہ گیلانی پر ڈالی اس کی سوالیہ نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ ''الیکشن میں حصہ لے رہا ہے۔ لیکن دمڑی پاس نہیں۔ کوئی جلسہ، کوئی جلوس، کوئی ہلچل نہیں ہے۔!''

''اچھا۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''اور یہ علی مراد کی کیا پوزیشن ہے۔؟''

''جی علی مراد زمین دار ہے چھوٹا موٹا۔ اس کو ملک ریاض سپورٹ کر رہا ہے۔ علی مراد اور ملک کی دوستی بڑی پرانی ہے جی۔ جب ملک ریاض نے شوگر مل لگائی تھی تو گنے کی ساری سپلائی اس کے ذریعے لیتا تھا۔ اس میں علی مراد نے بڑا پیسہ بنایا۔ پھر بھی زیادہ پیسہ نہیں ہے۔ دس بیس کروڑ کا دس پندرہ فیصد جی کیا ہوتا ہے۔ مگر ملک ریاض اس کو سپورٹ کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی سیاسی پارٹی بنا رہا ہے۔ نئی پارٹی کی گراؤنڈ کے لئے وہ لوگوں کو چن رہا ہے۔!''

''کیا پوزیشن ہے اس کی۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے پوچھا۔

''جیت تو نہیں سکتا۔ یہ تو جی بس خادم حسین کے ووٹ ہی کاٹ سکے گا۔ جیتنا تو جی آپ نے ہی ہے۔!'' بالے نے جواب دیا۔

''اچھا۔۔!'' اتنی دیر میں پہلی مرتبہ عبداللہ شاہ گیلانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔؟''

''جی گیلانی خاندان کو کون شکست دے سکتا ہے۔؟ نسلوں سے آپ ہی لوگوں کی حکومت ہے۔ اب تو سرکار کی عادت سی ہوگئی ہے۔ عادت بھلا بدلتی ہے۔ اور پھر الیکشن خالی خولی باتوں سے کہاں۔؟ جی بندوں سے، ہتھیاروں سے۔ اور اس کے پیچھے پیسے کے پیٹرول سے جیتے جاتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا کچھ کہاں۔؟'' بالے نے ماضی کی روشنی میں طاقت، رعب اور دبدبے کا تجزیہ کیا اور اپنا فیصلہ صادر کیا۔

''لیکن کیا نئے خون، نئے عزم کو سامنے نہیں آنا چاہیے۔؟''

''جی آپ ہی تو نیا خون، نیا عزم ہو۔!'' بالے نے منطقی جواز دیا۔ ''آپ ہی تبدیلی ہو جی بڑی۔!''

''نہیں بالے۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے ایک گہری سانس لی۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میں تبدیلی کا نقیب نہیں، میں اس سارے نظام کو نہیں شکست دے سکتا۔ میں تو اسی بوسیدہ نظام کا نیا ستون ہوں۔ جو سہارا دینے کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ میں تو پرانے سلسلے کا اگلا تسلسل ہوں۔ کچھ بھی نہیں بدل سکتا۔!'' اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں سرکار۔!'' بالے کو اس کی بے بسی اچھی نا لگی۔ وفاداری کا ایک عنصر یہ بھی تو ہوتا ہے کہ اپنے مخدوموں کی بے بسی کو تسلیم ہی نا کیا جائے، ان کی خستگی کو محسوس کر کے بھی ان کو پہاڑ سمجھا جائے۔ وہ پہاڑ جس کو اڑانے کے لئے بارودی سرنگوں کو ان کے سینوں میں چھید کر اتار دیا گیا ہو، اور ضرورت صرف ایک چنگاری کی ہو۔ ایسی ہی وفاداری، ایسی ہی چاہت ایسا یقین جو حقائق سے نگاہیں چرا کر مجتمع کیا گیا ہو۔ وہ بالآخر ایک دن گرا دیتا ہے۔ ''آپ ہی تو جی ہمارا مستقبل ہو، آپ ہی اس نظام کو بدلو گے۔!''

''اچھا۔۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی کو دفعتاً بالے میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ ''تم نے جو نظام بدلنے کی بات کی، سمجھتے ہو کہ نظام بدلنا کیا ہوتا ہے۔؟''

''جی ہمیں تو نہیں پتا۔'' بالے نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''ہم تو بس یہ جانتے ہیں کہ جب سے سمجھ دار ہوئے ہیں۔ آپ ہی ہمارا مستقبل ہو۔ بادشاہ کا بیٹا ہی بادشاہ بنتا ہے جی۔ وہ دیکھیں نا ہمارے اوپر مغلوں نے حکومت کی، تو وہی سب باری باری۔ باپ کے بعد بیٹا، بیٹے کے بعد پوتا بادشاہ بنتا رہا۔ پھر انگریز آئے تو جی ان کا نظام بھی دیکھیں کہ جی ملکہ کے بعد اس کی بیٹی ہی ملکہ بنتی ہے۔ باہر سے کوئی باشادہ تو نہیں بنتا۔ جی

بادشاہوں کا کام حکومت کرنا ہوتا ہے۔ انہیں ہی سمجھ ہوتی ہے حکومت کی۔ یہ کمی کمار بیچنے والے، بکریاں چرانے والے، گوالے، بھٹیارے یہ کیا کر سکتے ہیں جی۔ سب اپنے اپنے پرکھوں کے کاموں سے لگے ہیں۔!''

عبداللہ شاہ گیلانی کچھ نہ بولا۔ بس ایک پھانس سی اس کے دل میں چبھ گئی۔

بالا بولتا رہا۔ ''ہم تو جی بس آپ کے غلام ہیں۔ آپ کے حکم سے سوچتے ہیں۔ آپ نے پیار دے دیا تو خوش، اپنی قسمت پر نازاں۔ آپ ناراض ہو گئے۔ سزا دیدی تو ہماری غلطی۔ ہماری تقدیر۔ جو سوہنا رب چاہے۔ جان دیدی یا جان لے لی۔ سب آپ ہی کے لئے۔ فرشتے نمک حرام تو نہ لکھیں گے جی اپنی کتاب میں۔ نمک کا حق تو جی ادا کرنا واجب ہے۔!''

''کبھی کسی کی جان لیتے ہوئے، مارتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ تم قتل کر رہے ہو۔ ظلم کر رہے ہو۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے گہرے دکھ سے پوچھا۔ ''کبھی کوئی احساس ہوا۔؟''

''احساس کا ہے کا جی۔؟'' بالے نے جواب دیا۔ ''ہماری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں، ہم تو خالی لوگ، اتنے خالی کہ ہمارے اندر دشمنی کا، پیار کا کوئی خانہ ہی نہیں ہوتا۔ ہم تو بس جی ہر کام میں آپ کی خوشنودی کو سامنے رکھتے ہیں۔ گولی کو بھلا کسی کے بدن میں گھستے ہوئے، گوشت کو پھاڑتے ہوئے، ہڈی کو توڑتے ہوئے کیا دکھ ہوگا؟۔ ہم تو جی آپ کے تیر ہیں۔ زہر میں بجھے ہوئے۔ جس پر آپ چلائیں گے جا پڑیں گے۔ عذاب، ثواب، گناہ، اجر یہ سب تو جی آپ لوگوں کی، سوچنے والوں کی مصیبتیں ہیں۔ ہمیں کیا۔؟'' بالے نے کندھے اچکائے۔

عبداللہ شاہ گیلانی کو یوں لگا کہ جیسے وہ ہزاروں من مٹی کے نیچے دب گیا ہو۔ جیسے اس کو چاروں طرف سے اندھیرے نے اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ وہ اندھیرا جس میں اُجالے کی کوئی رمق نہ ہو۔ جس میں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ ہو۔

دفعتاً گاڑی نے بڑے زور سے جھٹکا لیا۔ عبداللہ شاہ چونک گیا۔ سڑک کے درمیان میں سے بکریوں کا ریوڑ گزر رہا تھا۔ شائد بالے نے اسی کو دیکھ کر جھٹکے سے بریک لگایا تھا۔

''تو گویا نجات کی۔ ہماری نجات کی اُس بارگاہ میں کوئی صورت نہیں!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے سر کو نشست کی پشت سے لگا لیا۔ پتا نہیں کیوں دو آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل کر نیچے آ گئے۔

''نجات تو ہے۔!'' اس نے سنا۔ جانی پہچانی آواز۔ جس کو وہ لاکھوں آوازوں کے ہجوم میں شناخت کر سکتا تھا۔

''ذرا اپنے آپ کو دیکھو۔ تم اِن میں سے ہو کر بھی، ان میں نہیں ہو۔؟'' قادری سرکار نے کہا۔

''آپ یہاں۔۔؟''

''ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔'' وہ مسکرائے۔

''کیا کفارے کی صورت نہیں۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی شکستگی سے پوچھا۔

''ہے۔۔ بالکل ہے۔!'' قادری سرکار نے کہا۔ ''اپنی انا کو تج کر کے، اپنے نقصان کو سرمایہ بنا کے سب بدل سکتے ہو۔ یہی ہے اصل کفارہ۔!'' انہوں نے کہا۔ ''تمہارے پاس طاقت ہے۔ اس کو بے سہاروں کے لئے استعمال کرو۔ تمہارے پاس وسائل ہیں اس کو ضرورت مندوں کے لئے وقف کرو۔ اور۔۔!'' انہوں نے ذرا ٹھہر کے کہا۔ ''اور وہ سچائی ہے کہ جس کے ذریعے تم انہیں اپنا بنا سکتے ہو۔ ضرورت صرف ہمت کی ہے۔ ان زخموں کا تریاق تمہارے پاس ہے۔ جن کی وجہ سے یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔ بھیڑوں

کے رکھوالے۔ بھیڑوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔؟''

''صحیح فرمایا آپ نے سرکار۔ ہم اس کے ذمے دار ہیں۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔

''کیا ذمہ داری دے رہے ہیں چھوٹے سرکار۔!'' بالے نے پوچھا۔

عبداللہ شاہ گیلانی جیسے ایک جھٹکے سے ہوش میں آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھا۔ گاڑی میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اور بالا سڑک کے ایک طرف گاڑی لگائے کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے سرکار۔؟'' بالے نے تشویش آمیز انداز میں پوچھا۔ ''شائد آپ سو گئے تھے۔ خواب دیکھ رہے، کچھ بول رہے تھے۔ کیا ذمہ داری دے رہے ہیں سرکار۔؟''

اچانک ہی عبداللہ شاہ گیلانی ہنس پڑا۔ ''تم ہی تو کہتے ہو کہ سوچنا ہمارا کام ہے۔ ہم سوچ رہے تھے۔ تو پھر تم کاہے کو پریشان ہو رہے ہو۔؟''

بالا کچھ نہ سمجھا بس اس کو دیکھتا رہا۔

''نہیں سمجھے۔۔۔؟'' عبداللہ شاہ گیلانی نے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔؟'' بالے نے نفی میں گردن ہلائی۔

''پھر چلو۔۔۔ راستہ تو طے کرنا ہی ہے۔!'' عبداللہ شاہ نے کہا۔ بالے نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ عبداللہ شاہ چند لمحے ونڈ اسکرین کو گھورتا رہا۔ پھر سی ڈی پلیئر کا بٹن دبا دیا۔ فضا میں مغنی کی آواز ایک ردھم سے پھیلنے لگی۔

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موج دریا ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

یہ شاعر بھی الہامی ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات، افکار، تصورات ان سے برسوں آگے چلتے ہیں۔ جو ان کا وجدان انہیں دکھا، سنا، سمجھا رہا ہوتا ہے۔ اپنے عہد کے بونوں میں عقل و شعور کے حوالے سے ان کا قد و قامت اس قدر بڑا ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ان پست قامت عقلوں میں نکو بن کر رہ جاتے ہیں۔ مگر پھر وقت کا بہتا ہوا دریا ان کے افکار کی ضوفشانیوں سے انہیں ایسا اعتبار عطا کرتا ہے کہ شعور ان کے افکار کے حضور بے ساختہ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ عبداللہ شاہ گیلانی نے سوچا۔ پھر اچانک ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی کی آواز سن کر بالا نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی نگاہ میں نہ جانے کیا تاثر تھا کہ عبداللہ شاہ گیلانی ایک دم چپ ہو گیا۔

''نہیں۔۔۔ پاگل نہیں ہوا ہوں میں۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے کہا۔ ''تم پریشان نہ ہو۔!''

''نہیں۔۔۔ نہیں میں ایسا نہیں سمجھ رہا'' بالے نے گڑبڑا کے کہا۔ ''میں تو بس ایسے ہی۔!''

''تم لوگ کیا کرتے ہو۔ جب اچانک کوئی بیٹھے بیٹھے ہنسنا شروع کر دے۔ رونا شروع کر دے یا پھر بے وجہ چیخنا چلانا شروع کر دے۔؟''

''جی ہم تو ایسے لوگوں کو آسیبی سمجھتے ہیں۔ جسے کوئی شر شرار چمٹ گیا ہے۔ پھر اس کے لئے کسی سیانے کے پاس جا کر جھاڑ پھونک کرواتے ہیں۔ مرچوں کی دھونی، کیلوں والا ڈنڈا، یا پھر گیلی مونجھ کی رسی سے باندھ دیتے ہیں۔ جوں جوں رسی سوکھتی ہے بندھن سخت ہوتا جاتا ہے۔ پھر شر شرار تنگ آ کر چھوڑ بھاگتا ہے یعنی

منطقی تجزیے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور ہر فرد یہ تجزیہ اپنی ذات کے داخلی مسائل کے پس منظر میں کرتا ہے۔!''

وہ کہہ رہے تھے اور لوگ بڑے احترام سے ان کو سن رہے تھے۔ یہ قادری سرکار کا ایک خاص وصف تھا، کہ لوگوں کو اپنی باتوں کے سحر میں ایسا جکڑ لیتے تھے کہ جب تک وہ نہ چاہتے کوئی اٹھ کر نہ جا سکتا تھا۔

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہوتے ہیں۔ جو کچھ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کا سارا معاملہ ہمارے تجربات سے عبارت ہوتا ہے۔ اور تجربات، ذاتیات اور مشاہدات کے دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اب ہمیں ایک فیصلہ کرنا ہے۔ اچھے اور برے کا۔ ہمارے تجربات اچھے اور برے ہوتے ہیں۔ ہمارا مشاہدہ برے ماحول کا عطیہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور بری چیزیں بری ہی ہوتی ہے۔ لیکن۔۔!'' وہ ذرا ٹھہرے اور اپنے سامعین کی طرف دیکھا جو پوری شدتوں سے ان کے طرف متوجہ تھے۔ وہ دوبارہ بولے۔

''لیکن یہاں ہمارا کائناتی شعور ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ ازلی شعور جو کائناتی سچ ہے۔ اچھائی۔ لاغرضی۔ بے طمع تعلق۔ دوسروں کی مدد کا جذبہ۔ شعور سچ کا ساتھ دینے پر اکساتا ہے۔ اس کی مثال وہ تاریخی حقائق ہیں کہ جب اسلام تو نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ چین کی تاریخی مثالیں۔ والدین کی عزت، استاد کا احترام، یونان کی شہری حکومت، سقراط کا زہر پینا۔ نوشیرواں کا عدل، قبل از اسلام عربوں کی بہادری، سخاوت، ساتھ دینے کی خصوصیات۔ یہ سب اس ازلی اور ابدی سچائی کی علامات ہیں کہ جو بے توحید معاشرے میں بھی حق اور سچائی کی شمعیں روشن کرتی تھیں۔

تو صاحبو! وہ ذرا ٹھہرے اور مسکرا کے کہنے لگے۔''تو صاحبو! آج تو ہمارے پاس واضح اور حقیقی پیغام توحید، تحریری ضابطۂ حیات، ریاست کا نقشہ اور ریاستی قوانین، افراد کی ذمہ داریاں اور مملکت کے فرائض۔ یہ سب قرآن مجید، سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ مدینے کی ریاست، اور خلفائے راشدینؓ کی عملی صورت میں موجود ہے۔ اس لئے دوستو! ہمارے پاس فرار کی، پہلو تہی کی، لاعلمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کوئی بہانہ۔ نہ افراد کے لئے۔ معاشرے کے لئے، ریاست کے لئے، مملکت کے لئے موجود نہیں ہے۔ ہمیں یا تو ذمہ داری پورا کرنا پڑے گی یا پھر حساب دینا پڑے گا۔'' انہوں نے کہا اور خاموش ہو گئے۔

تمام حاضرین ان کے درس کی کیفیت میں گم تھے۔ اچانک خادم خاص ندیم آیا۔ اس نے جھک کر بڑے ادب سے ان سے کچھ کہا۔ قادری سرکار کے چہرے پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔

☆☆☆☆

میں تجھ سے التجا کرتا ہوں۔۔۔ تو اپنا عدل دکھا

''یہ کیا لکھ گیا ہے۔؟'' پارٹی سربراہ نے رف پیڈ اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر ہارون گیلانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ذرا اس کو پڑھو، میری قریب کی عینک نہیں ہے۔!''

''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں حکومت چلانے کے قابل نہیں ہوں تو پھر میں اسمبلی تحلیل کر دیتا ہوں۔'' شاہ ہارون گیلانی نے تحریر پڑھی۔

''یہ کیا کر رہا ہے یہ۔؟'' پارٹی سربراہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''ذرا اس کو بلاؤ، سمجھاؤ۔!''

''کچھ نہیں ہوگا۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے نہایت سکون سے کہا۔ ''یہ محض گیدڑ بھبکیاں ہیں۔ ذرا ان کو کہیں کہ اس معاملے پر اپنی کابینہ سے بھی مشورہ لیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔!''

''یہ کیسے کہہ سکتے ہو۔ اگر اس نے پہلے ہی کوئی قدم اٹھا لیا تو۔؟'' پارٹی سربراہ کی پریشانی دیدنی تھی۔

''ویسے مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے کس خصوصیات کی بناء پر ان کو وزیراعظم کے لئے نامزد کیا تھا۔ سوائے وفاداری کے ان کے پاس کیا ہے۔؟''

''ہارون وفاداری معمولی چیز نہیں ہوتی۔!'' پارٹی سربراہ نے ناگواری سے کہا۔''سارا کچھ تو وہی کرتا ہے جو تم سب اس سے کہتے ہو، مگر تم لوگوں کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔!''

''ان لوگوں میں مجھے شامل نہ کیجئے۔ آج تک میرا کوئی ٹینڈر، کوئی کام، کوئی دوست ان کی نظر کرم کا محتاج نہیں رہا۔ میں اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہوں۔!''

''مجھے معلوم ہے۔!'' پارٹی سربراہ نے مسکرا کے کہا۔''تمہارا بیوروکریسی میں جو اثر و رسوخ ہے جس طرح لوگ تمہارا دم بھرتے ہیں اور تمہارے ایک اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔!''

شاہ ہارون گیلانی کچھ نہ بولے۔ پارٹی سربراہ نے دوبارہ کہا۔''تم وزیر اعظم کی دوڑ میں کیوں نہیں شامل ہوئے؟''

''میں۔۔۔؟'' شاہ ہارون گیلانی نے انتہائی حیرت سے کہا۔''میں وزیر اعظم بن کر کیا کروں گا۔؟ مجھے بے بس، بے وزن، محدود اختیارات نہیں چاہئیں۔!''

''جیسے تمہاری مرضی۔!'' پارٹی سربراہ نے کندھے اچکائے۔''میں ذرا بات کرلوں۔ دیکھوں کدھر ہے۔؟''

''مجھے اجازت دیجئے۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے کہا۔

''الیکشن کی تیاری کیسی چل رہی ہے۔؟'' پارٹی سربراہ نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''ارے یہ کیا۔؟'' اچانک شاہ ہارون گیلانی کی نظر ٹی وی اسکرین پر پڑی۔

''کیا ہوا۔؟'' پارٹی سربراہ نے ٹی وی اسکرین پر نگاہیں جمائیں۔ بریکنگ نیوز فلیش ہو رہی تھی۔

''حکمران پارٹی میں اختلافات۔ وزیر اعظم کا عالم برہمی میں کابینہ تحلیل کرنے کا امکان۔!''

''اوہ میرے خدایا۔!'' پارٹی سربراہ نے سر پکڑ لیا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ پھر اس کے بعد فون کی گھنٹیوں کا تانتا بندھ گیا۔ شاہ ہارون گیلانی باہر نکل آئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی مختلف نیوز چینلز کے نمائندوں نے ان پر یلغار کردی۔ طرح طرح کے سوالات کی بھرمار ہوگئی۔ مگر ہارون گیلانی نے ان کے ہر سوال کے جواب میں سوائے نو کمنٹس کے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی روانہ ہوگئی۔ وہ اندر ہی اندر بہت خوش تھے۔ ہر چیز ان کے اندازے کے مطابق ہو رہی تھی۔ ان کے اسکرپٹ میں کہیں کوئی جھول نہیں تھا۔ ان کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر تھا۔ جب پارٹی سربراہ نے سر پکڑ کے کہا تھا یہ خبر میڈیا تک کیسے پہنچ گئی۔ کس نے بتایا۔؟

حالانکہ صرف اتنا ہوا تھا کہ رف پیڈ پر لکھے کو پڑھنے سے قبل انہوں نے احمد اورنگ زیب کو لائن پر لے لیا تھا۔ جو خبر انہوں نے پارٹی سربراہ کو پڑھ کر سنائی تھی وہ احمد اورنگ زیب تک بھی پہنچ گئی تھی۔ ذہین اور فطین احمد اورنگ زیب ہر خبر کو صحیح جگہ پہنچانے کا کامل ہنر رکھتا تھا۔

☆☆☆

علی مراد کی غصے سے بھرپور آواز سب سن رہے تھے۔''یہ کھلا دھوکا ہے۔ میں نے دست برداری کا اعلان کیا تھا۔ لیکن اس کو ٹی وی پر نشر کر کے میری بے عزتی کیوں کی۔ کیا میری زبان پر بھروسہ نہیں تھا۔ میرے سارے حلقے والے کیا کہیں گے۔؟''

''تمہاری بات مکمل ہوگئی۔؟'' قدیر نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔تم بولو۔۔۔!''

آج پہلی بار قادری سرکار کا یہ روپ ہمارے سامنے آیا تھا۔ اور ساتھ ہی مجھے اس سوال کا جواب بھی مل گیا تھا کہ لوگ سرکار سے پیار، اتنی محبت، اتنی عقیدت کیوں رکھتے ہیں۔ واقعی جن کی عزتوں اور نیکیوں کا اللہ پاک محافظ ہو۔ ان کے مقامات کا کیا کہنا۔ مجھے قادری سرکار کا درس یاد آیا۔ ''لوگ پوچھتے ہیں سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقامات کیا ہیں۔ ارے پہلے ان کے غلاموں کے مقامات تو جان لو۔ پھر غلاموں کے آقا کے مقامات سمجھ لینا، تو وہ تو اُس مقام پر ہیں جہاں عقل سجدہ کرتی اور شعور جلا پاتے ہیں۔ جن کی آنکھوں نے رب کو دیکھا۔ جن کے دل نے عرشیں معلیٰ پر تجلیات کا مشاہدہ کیا ہو۔ اپنے ان مقامات کی تعبیر وتشریح خود سرکارِ مدینہ ہی کر سکتے ہیں۔ نہ ہماری تاب نہ مجال کہ ہم اپنے سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقامات بتا سکیں۔ نا اہل دنیا کے دِل، سوال کرنے والوں کے ذہنوں میں اتنی وسعت ہے۔ اگر ان مقامات کو جاننا سمجھنا چاہتے ہو تو پھر پیار کا، محبت کا، عشق کا کاسہ پھیلا دو۔ دیکھو مقام والے تمہیں کیا مقام عطا کرتے ہیں۔''

''کیا شاہ ہارون گیلانی کے علم میں سرکار کے درجات نہیں۔؟''

''یہ اہل سیاست، دنیاوی علم رکھنے والے ان باتوں کو عقیدت مندوں کی داستان سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ یہ سارے معاملات عقیدت مندی کی ہرزہ سرائی کے سوا کچھ نہیں۔'' خادم حسین نے کہا۔

''لیکن سرکار کی ایک پیش گوئی تو ہر جگہ گردش کر رہی ہے کہ ضمنی انتخابات سے ایسا اپ سیٹ ہوگا کہ حکمران اتحاد کے لئے مشکلات ہونگیں اور ان میں پھوٹ پڑنا شروع ہو جائے گی۔'' قدیر نے بتایا۔ میں نے تائید میں سر ہلایا۔

''اچھا۔۔۔!'' خادم حسین نے حیرت سے کہا۔ ''مجھے اس پیش گوئی کا نہیں پتا۔ لیکن سرکار کا کہنا غلط نہیں ہوسکتا۔!'' اس کے لہجے میں حد درجہ یقین تھا۔

ہم لوگوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا۔ اور پانچ سات افراد اندر آ گئے۔ وہ جدید رائفلوں سے مسلح تھے۔

''چلو اٹھو۔۔۔!'' ان میں سے ایک نے درشت لہجے میں کہا۔

ہم تینوں کھڑے ہوئے، وہ پھٹ کر دو قطاروں میں بٹ گئے۔ ہم تینوں ان کے درمیان سے ہوتے ہوئے باہر نکل آئے۔ باہر اچھی خاصی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اندر کمرہ تو نیم تاریک تھا۔ وہ ہمیں رائفلوں سے ہنکاتے ہوئے ایک وسیع وعریض تہہ خانے میں لے آئے جہاں ایک طرف سے وسیع اور اونچا سا دیوان تھا۔ جس پر ہارون گیلانی اپنے پورے کروفر کے ساتھ براجمان تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک کرسی پر ایک خوش شکل نوجوان بیٹھا تھا۔

وہ لوگ ہمیں تقریباً دھکیلتے ہوئے دیوان کے قریب لے آئے۔ شاہ ہارون کے ساتھ بیٹھے ہوئے نوجوان کو میں پہلی ہی نظر میں پہچان گیا۔ وہ عبداللہ شاہ گیلانی تھا۔ اس کی تصاویر سے تو سارا علاقہ ہی بھرا ہوا تھا۔

''بہت خوب۔۔۔!'' شاہ ہارون گیلانی نے ہم پر نظر پڑتے ہی کہا۔ ''کافی لوگ مذاکرات کے لئے آئے ہیں۔!''

ہم تینوں میں سے کوئی نہ بولا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''شاہ جی یہ سفید کرتے پاجامے والے تنزیل میاں ہیں، خلیفہ جی قادری سرکار کے۔'' میں نے دیکھا کہ عبداللہ شاہ گیلانی اس تعارف پر اپنی کرسی پر بری طرح کسمسایا۔

''اور یہ ان کے ساتھ خانقاہ سے آئے ہوئے قدیر۔ ان کے دوست۔ اور یہ اپنے کھوجی غلامو کا پتر، خادم

''چلو ٹھیک ہے۔!'' حافظ سلمان نے کہا۔ ''ہم پولنگ اسٹیشنوں کے معاملات دیکھ لیتے ہیں۔ تمام امام صاحبان کو ان کے پولنگ اسٹیشن اور پھر وہاں قائم پولنگ بوتھ کی تمام تفصیلات سمجھا دی گئی ہیں۔ اس لئے اس طرف سے تو اطمینان ہے۔''

''چلیں یہ تو سب ٹھیک ہو گیا۔ لیکن یہ بھی دیکھ لیں کہ ووٹرز کو پرچیاں صحیح طریقے سے تقسیم ہو گئی ہیں یا نہیں۔ اور ایک بار سب کو اچھی طرح یاددھانی کروا دیں کہ اپنے شناختی کارڈ ضرور ساتھ لائیں۔!'' میں نے تاکیداً کہا۔

سب نے ہی اس پر صاد کیا اور محفل برخواست ہو گئی۔

''یار ایک بات پوچھوں۔؟'' قدیر نے لوگوں کے جانے کے بعد پوچھا۔

''کہو کیا بات ہے۔؟'' میں نے پوچھا۔

''قادری سرکار نے پولنگ اسٹیشن پر پولنگ ایجنٹس کے لئے امام صاحبان پر کیوں زور دیا؟ اور بھی لوگ ہو سکتے تھے۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔؟''

''بالکل ہے۔۔!'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''بالکل سیدھی سی، آسان سی، انتخابات کے نتائج پر اثر انداز، اور سو فیصد اثر انداز ہونے کی حکمت عملی ہے۔!''

''یار پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ مجھے ذرا صاف، صاف سمجھاؤ۔!'' قدیر الجھ گیا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔؟''

''شروع، شروع میں میری سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن جیسے ہی میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔''

قدیر میری طرف کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھتا رہا۔

میں نے کہنا شروع کیا۔ ''ہم امام صاحبان کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں۔ وہ ہمیں ہر جمعے کے دن خطبہ دیتے ہیں۔ اچھائی برائی سمجھاتے ہیں۔ سچ اور جھوٹ کی اہمیت بتاتے ہیں۔ ذمہ داریوں اور فرائض کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ ہم مسجد میں بیٹھ کر یا کسی جگہ حلقہ درس میں بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ یہ ساری باتیں تو ہماری اچھائی کے لئے ہیں۔ ہمیں ماننا چاہئیں۔ مگر وہاں سے اٹھتے ہی ہم بدل جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی وعدہ ہم ان سے کر لیں۔ اور وقتِ وفا وہ ہمارے سامنے ہوں تو کیا ہم انکار کر سکیں گے۔؟'' میں نے اپنی بات مکمل کر کے اس کی طرف دیکھا۔

''کمال ہے خدا کی قسم کمال۔۔!'' قدیر بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لپک کر میرا منہ چوم لیا۔ ''واقعی یہ کتنی سادہ اور زوداثر ترکیب ہے کہ مولانا صاحبان جس امیدوار کی تعریف کر رہے ہوں۔ لوگوں سے اس کو ووٹ دینے کے لئے کہہ رہے ہوں۔ لوگ وعدے کر رہے ہوں تو پھر جب وہاں وہ پولنگ اسٹیشن پر جا کر ان ہی امام صاحبان کو دیکھیں گے، تو چاہے شرما شرمی ووٹ دیں۔ یا امیدوار کے پروگرام سے متفق ہو کر، دونوں صورتوں میں ووٹ تو مطلوبہ امیدوار کو ہی پڑیں گے۔!'' وہ اچانک چپ ہو گیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ''یار یہ قادری سرکار کیا ہیں۔؟''

''معلوم نہیں۔۔۔!'' میں نے پوری سچائی سے جواب دیا۔ ''وہ سب میں رہ کر، سب سے مختلف ہیں۔ شائد خدا نے انہیں کسی خاص کام کے لئے بھیجا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایسے ہی مخلص، بے ریا افراد ملک و ملت کی تقدیر بدل دیتے ہیں۔!'' قدیر نے کہا۔ ''وہ کتنی خاموشی سے دوسروں کو اپنا اسیر کر لیتے ہیں۔!'' قدیر نے انتہائی عقیدت سے کہا۔

میں کچھ نہ بولا۔ اچانک غلام حسین نے ہمیں مخاطب کیا۔ ''کیا سوچ رہے ہیں آپ دونوں جی۔؟''

''علی مراد کے متعلق۔!'' قدیر نے کہا۔

''اس کے متعلق کیا سوچنا جی۔؟'' غلام حسین نے کہا۔''رب کے کھیل نیارے ہوتے ہیں۔ وہ تو جی انسان اپنی سوچ رہا ہوتا ہے۔لیکن رب کی اپنی ہی مرضی ہوتی ہے۔آپ دیکھنا ہر شئے میں، ہر حرکت میں کوئی نا کوئی مصلحت ہوتی ہے۔بس کبھی کبھی ہم سمجھتے نہیں۔ کیونکہ ہمارے سامنے سارا کچھ واضح نہیں ہوتا۔غیب کے پردے کے پیچھے ہوتا ہے۔!''

''غلام حسین چاچا۔۔!'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔''بہت ساری باتیں پردہ غیب میں کیوں ہوتی ہیں۔سامنے ہوں تو فیصلہ کرنا آسان ہو جائے۔؟''

''نہ خلیفہ جی، سُوہنے پتر۔۔!'' غلام حسین نے بڑے ہی پیار سے کہا۔''سب کچھ سامنے ہو تو پھر بازی کھیلنے کا مزہ کیا۔کبڈی کے پہلوان کو پالا مارنے کے لئے کوشش کرنا پڑتی ہے۔اگر اس کو پہلے سے ہی معلوم ہو کہ وہ پالا مار لے گا تو پھر کھیل کا سارا مزہ، سارا جذبہ ہی جاتا رہے گا۔ ہر چیز اپنی ہی ہونے کا چلن ہو جائے گا۔سب اپنے اپنے فائدے سوچیں گے۔تو پھر ہار جیت کی، کامی، ناکامی کی جو کھد بد دل کو تلملائے رکھتی ہے۔ وہ ہی ختم ہو جائے گی۔زندگی تو جی بالکل سادی ہو جائے گی۔اس لئے جی ساری رونق ہونے نا ہونے کے خوف سے ہے۔ یہی خوف بندکو، زندگی کو آگے بڑھاتا رہتا ہے۔حوصلہ دیتا ہے۔لڑنے کا، بیقرار رہنے کا۔ ورنہ پھر تو ساری حیاتی بےزار ہی رہنا پڑتا۔!''

''خلیفہ جی۔۔۔!'' دفعتاً غلام حسین نے مجھے مخاطب کیا۔''جی یہ علم شلم کچھ نہیں ہوتا۔بس رب کا کرم، مرشد کا فیضان ہوتا ہے۔اُس علیم و خبیر کے آگے مَیں ترک کر دو، انکساری اور عاجزی کی چادر اُوڑھ لو تو سارے انجان راستے ہاتھوں کی لکیر بن جاتے ہیں۔علیم اور خبیر بتاتا رہتا ہے۔خبر دیتا رہتا ہے۔سب کچھ اُسی کی طرف سے ہے۔جن پر کرم ہوتا ہے وہ تو سرکار ہوتے ہیں۔آپ کے ہمارے مرشد قادری سرکار۔!'' غلام حسین کے انداز میں، بات میں، ادا میں پیار تھا۔شرارت تھی۔ چلبلاہٹ تھی۔ بچے کو بہلانے والی پچکار تھی۔ استاد والی جھڑک اور ماں والی لاڈیاں تھیں۔کتنا رنگین، پرت در پرت تھا۔غلام حسین۔

''تم میں کچھ خاص ہے۔'' میرے وجدان نے کہا۔

''یہی خاص ہے کہ ہم عام ہیں۔پوشیدہ ہیں۔اب اور کیا جانو گے خلیفہ جی۔؟'' کسی نے کہا۔میں چونک گیا۔غلام حسین مسکرا رہا تھا۔سب خاموش تھے۔مگر خاموشی بول رہی تھی۔یہ میں جانتا تھا یا غلام حسین۔

☆☆☆

ہم لوگ کھانا وغیرہ کھا کے لیٹے ہوئے تھے۔قدیر اور ہم باتیں کرتے کرتے عالم غنودگی میں ہی تھے کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔آہٹ سے میں اور قدیر دونوں چونک کے اٹھے، مگر اس سے پہلے کہ کوئی آواز نکالتے یا ان کا مقابلہ کرتے، کسی نے ہمارے اوپر چادر ڈال کر ہمیں گردنوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ان کے ہاتھوں سے عجیب سی بو آ رہی تھی۔اس عجیب تلخ بو نے ہمیں چند ہی لمحوں میں بےحواس کر دیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔اور میں فرش پر پڑی ایک موٹی سی چٹائی پر پڑا ہوا تھا۔میرا منہ حلق تک کڑوا ہو رہا تھا۔میں نے ادھر ادھر گردن گھمائی۔تھوڑے فاصلے پر کوئی عجیب آڑھا ٹیڑھا وجود پڑا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ جیسے خادم حسین ہے۔ میں نے آہستہ سے آواز دی۔ ''خادم حسین۔۔خادم حسین۔۔!''

''تنزیل۔۔۔!'' اچانک ایک اور آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔میں پہچان گیا۔یہ قدیر کی آواز تھی جو میرے دائیں جانب سے آ رہی تھی۔میں دائیں جانب مڑ گیا۔کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔سب کچھ

دُھندلا دُھندلا دکھائی دے رہا تھا۔
''میں ادھر ہوں۔۔۔!'' قدیر نے کہا۔
میں آہستہ آہستہ زمین پر ہی کھسکتا ہوا اس کی طرف پہنچا۔ مجھ میں سیدھا کھڑا ہونے کی ہمت ہی نہیں تھی۔
''کیسے ہو۔۔۔؟'' میں نے قدیر کو چھوا۔ وہ بندھا ہوا تھا۔ ہاتھ پیروں سے، سیدھا پڑا ہوا۔ میں نے اسکے ہاتھوں کو ٹٹولا، وہ کسی مضبوط رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ ''میری جیب میں چھوٹا چاقو ہے۔۔۔!'' قدیر نے کہا۔ ''وہ نکالو۔۔۔!''
میں نے بڑی مشکل سے اس کی پچھلی جیب سے چاقو نکالا۔ بظاہر یہ لائیٹر تھا مگر اس میں ایک چھوٹا سا چاقو بھی تھا۔ میں نے اس کے ایک ابھرے ہوئے حصے کو دبایا تو چاقو ایک دم باہر نکل آیا۔ میں نے چاقو آہستہ آہستہ سے اس کے ہاتھ کی رسیوں پر رگڑنا شروع کیا۔ تھوڑی سی کوششوں سے قدیر کے ہاتھ آزاد ہو گئے۔
''ہم کہاں ہیں۔؟'' قدیر نے اپنے دونوں ہاتھوں کو تیزی سے ملتے ہوئے پوچھا۔ اور پیروں کی طرف جھک گیا۔
''معلوم نہیں۔۔۔!'' میں نے اس کے پیروں کی رسیوں کو بھی کاٹ دی اس کے پیر بھی آزاد ہو گئے۔
''یہ کس کی کاروائی ہو سکتی ہے۔!'' قدیر کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔
''تیسرا یقیناً خادم حسین ہی ہو گا'' میں نے تیسرے وجود کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ خادم حسین ہی تھا بے سدھ پڑا ہوا۔ میں نے اور قدیر نے مل کر اس کی رسیاں کھولیں، اس کے ہاتھ پیروں کی مالش کی جو برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ دس پندرہ منٹوں میں اس کو ہوش آ گیا۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔
ہم تینوں چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک قدیر کی نگاہ ایک کونے میں رکھے ہوئے گھڑے پر پڑی، وہ اس کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے مٹکا چھوا اور ہلایا ''اس میں پانی ہے۔!'' اس کی ہیجان آمیز آواز سنائی دی۔ اس وقت یہ خبر ہمارے لئے بے حد اہم تھی۔ پانی کی اطلاع کے ساتھ ہی جیسے ہمارے حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ اس نے مٹی کے آب خورے میں پانی بھرا اور میری طرف بڑھایا۔
''پہلے تم پی لو۔۔!'' میں نے کہا۔
''قدیر نے میرا جواب سنتے ہی پانی کا آب خورہ منہ سے لگا لیا۔ اور چند ہی گھونٹ میں آب خورہ خالی کر دیا۔ پھر وہ مٹکا ہی اٹھا لایا اور ہمارے درمیان رکھ دیا۔ اس میں سے پانی نکال کر اس نے باری باری ہمیں پلایا۔ پانی پینے کے بعد حلق کی کڑواہٹ کم ہو گئی۔ اعصاب قدرے ڈھیلے ہو گئے۔
''ہم کسی قید میں ہیں۔!'' قدیر نے کہا۔
''یہ بات تو بالکل ظاہر ہے کہ ہم کسی کی قید میں ہیں، مہمانوں کو تو یوں نہیں رکھا جاتا۔!'' میں نے کہا۔
قدیر جھینپ گیا۔ ''میرا یہ مقصد نہیں تھا۔''
''بات یہ تو طے ہے کہ ہم کو ڈاکو تو اٹھا نہیں سکتے، ڈاکو تو ایسی واردات کرنے سے پہلے اپنے شکار کا خاصا ہوم ورک کرتے ہیں۔ مال کا حساب لگاتے ہیں تا کہ ڈیمانڈ بھی کر سکیں۔!'' میں نے کہا۔
''میری پوچھیں جی تو یہ سیدھی کاروائی علی مراد کی ہے۔!'' خادم حسین نے کہا۔ ''وہ کافی غصے میں تھا۔!''
''شائد مگر مجھے نہیں لگتا۔۔!'' میں نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ ''علی مراد کی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ قادری سرکار کے خلاف کوئی حرکت کرے۔۔۔!''
''پھر۔۔۔ پھر تو یہ حرکت ایک ہی شخص کر سکتا ہے۔'' قدیر نے دفعتاً جیسے معاملے کی تہہ تک پہنچتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہم تین یک لخت چپ ہو گئے۔ دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک تھال تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو بندوق بردار بھی اندر آ گئے۔ وہ بے حد محتاط اور چوکنا تھے۔

''ارے یہ تو کھل گئے۔۔!'' ایک بندوق بردار نے حیرت سے کہا۔

اس کی بات سنتے ہی دوسرے نے اپنی رائفل سیدھی کر لی اور پوری طرح مستعد ہو گیا۔

سب سے پہلے اندر آنے والے نے آگے بڑھ کر تھال ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس میں کھانا تھا۔ وہ دونوں محفوظ فاصلے پر کھڑے رہے، مبادا ہم کوئی حرکت کریں اور ان کو ممکنہ جوابی کاروائی کرنا پڑے۔

اچانک جیسے میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ لمحوں میں کچھ خیالات میرے اندر ابھرے اور مجھے متفق کر گئے۔ اپنے اندر لمحوں میں فیصلہ کر لینا۔ یہ میں نے پہلی بار کیا تھا۔

''سنو۔۔!'' میں نے کھانے کا تھال رکھنے والے سے کہا۔ ''ایک تو مٹکے کا پانی ختم ہو گیا ہے۔ دوسرے کھانے کے بعد ہمیں چائے کی عادت ہے۔ ذرا تیز پتی کے ساتھ چائے لانا۔ چینی علیحدہ۔۔!''

میری اس فرمائش پر تھال والے نے مجھے ایسے دیکھا کہ جیسے میں کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ میرے دونوں ساتھی خادم حسین اور قدیر نے بھی چونک کر مجھے دیکھا۔ اور جیسے برقی سرعت سے تمام ماجرا ان کے ذہن میں منتقل ہو گیا۔ ''ذہنی ہم آہنگی خیالات کی تیزی سے منتقلی کا سبب بنتی ہے۔'' مجھے قادری سرکار کے خطاب کا ایک جملہ یاد آیا۔

''بڑی بات ہے بھئی۔!'' رائفل برداروں میں سے ایک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں قید میں ڈر نہیں لگتا۔؟''

''کوئی بھی قید ہمیشہ کی نہیں ہوتی۔۔۔!'' میں نے جواب دیا۔

''تم شاہ کی قید نہیں جانتے، یہاں سے تو بچے بھی بوڑھے ہو کر رہائی نہیں پا سکتے۔!'' دوسرے نے کہا۔

ہم تینوں نے بیک وقت ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ہماری ذرا سی لاپرواہی کے مظاہرے نے ہمارے پہلے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

''ہر چیز خدا کی مرضی سے ہے۔!'' میں نے انہیں جواب دیا۔ ''خدا ظالموں کی رسی ضرور دراز کرتا ہے۔ مگر ہمیشہ کے لئے انہیں معاف نہیں کرتا۔ تم شاہ جی کے ظلم کا آلۂ کار ہو۔ ان کے گناہوں کی پاداش میں تم بھی مارے جاؤ گے۔ گیہوں کے ساتھ گھن نے لازمی پسنا تو ہے۔''

''تو جی کیا مثال دی خلیفہ جی۔!'' رائفل برداروں میں سے ایک ہنسا۔ ''یہ کیسا انصاف ہے کہ جی گیہوں کے ساتھ روزی حاصل کرنے والا ننھا گھن بھی پیسا جائے۔ یہ اللہ والے بھی کیا مثال دیتے ہیں۔۔!''

''مثال کی سچائی تو تم نے خود ہی جان لی۔!'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''تم ہی کہہ رہے ہو نا کہ روزی کا چکر تھا۔ تو جہاں سے روزی حاصل کی جائے گی۔ جس سے روزی حاصل کی جائے گی۔ اس کے حشر میں تمہیں بھی ساتھ پیسا جائے گا۔ کیونکہ تم ظالم کے ظلم کا سبب بنتے ہو۔ ظلم کی چکی سے اپنی ضرورت پوری کرتے ہو، دوسری وجہ گھن کی پسنے کی یہ ہے کہ گندم کھانے کے بعد بھی اس کی نیت نہیں بھرتی۔ مزید کھانے کا لالچ اس کو گندم کی دنیا سے نکلنے ہی نہیں دیتا۔ پھر جب بورے کے بورے گندم چکی پر الٹائی جاتی ہے تو پھر گیہوں کو طوعاً و کرہاً پسنا ہی پڑتا ہے۔ تم بھی ایک دن پیسے جاؤ گے۔!''

''چل اوئے فقیے یہ تو ہمیں باغی کر دیں گے۔!'' دوسرے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ میرے ساتھ قدیر اور خادم حسین بھی ہنسنے لگا۔ لمحے بھر کیلئے ہمیں یوں لگنے لگا کہ جیسے ہم کسی

قید میں نہیں پکنک پر آئے ہوں۔ جب کسی چیز کا سبب معلوم ہو جائے تو بے چینی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ تینوں کھانا رکھ کے چلے گئے۔ ہم لوگ کھانا کھانے لگے۔ گوشت اور چاول ملا کر طاہری نما کوئی چیز بنائی گئی تھی۔ ہلدی کا ذائقہ سب سے زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔

''یار تنزیل تم نے بڑی تیزی سے حکمت عملی مرتب کر لی۔!'' قدیر نے توصیفی لہجے میں کہا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں قدیر بھائی۔۔!'' خادم حسین نے بھی اس کی تائید کی۔'' خلیفہ جی کا ذہن تو گویا بجلی ہے، کمپیوٹر ہے۔ فوراً ہی نتیجہ اخذ کر لیا۔!''

''اگر ہم سیدھے سبھاؤ ان سے پوچھتے تو وہ ہم پر رعب ڈالنے کے چکر میں کچھ نہ بتاتے۔'' میں نے کہا۔

''خدا کا شکر ہے کہ تم لوگ فوراً ہی میرا اندازِ فکر سمجھ گئے۔!'' میں نے ان کی طرف دیکھا۔

''لیکن اب ہو گا کیا۔؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ دیر ہمیں اپنی قید میں نہ رکھ سکیں گے۔!'' میں نے کہنا شروع کیا۔''شاہ ہارون گیلانی نے اگر یہ فیصلہ کیا ہے تو اس کو یہ فیصلہ واپس لینا ہو گا۔ وہ کسی بھی صورت قادری سرکار کی مخالفت مول نہیں لے گا۔!'' میرے ذہن میں قادری سرکار کی خانقاہ میں شاہ ہارون گیلانی کا انداز واضح ہو گیا تھا۔

''مگر کیسے۔۔۔؟'' انہوں نے پوچھا۔

جواباً میں نے انہیں خانقاہ میں شاہ ہارون گیلانی کی آمد والا واقعہ سنا دیا۔ وہ دونوں خاموشی سے سارا واقعہ سنتے رہے۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ اس مرتبہ شاہ ہارون گیلانی نے قادری سرکار سے کھلی مخالفت مول لے لی۔!'' قدیر نے پُرسوچ انداز میں کہا۔''کیا اس کو اندازہ ہے کہ اس حرکت کا نتیجہ کیا نکلے گا اس کے حق میں۔؟''

''اگر عاقبت اندیش ہوتے تو ایسا ہرگز نہ کرتے۔!'' خادم حسین نے کہا۔''اب تک سرکار کو ان کی اس حرکت کی اطلاع مل چکی ہو گی اور سرکار نے ضرور کوئی نہ کوئی قدم اٹھایا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ قادری سرکار کی بددعا سے بچائے۔!''

''کیا مطلب۔۔؟'' اس مرتبہ ہم دونوں نے حیرت سے کہا۔ سرکار کی شخصیت کے اس پہلو سے ہمیں کبھی واقفیت ہی نہیں تھی۔ ہم نے تو اب تک انہیں سراپا محبت اور پیار ہی دیکھا تھا۔ ان کے جمال کا رُخ ہم پر اس شدت سے روشن تھا کہ جلال کی متعلق ہمیں کچھ علم ہی نہ تھا۔

''یہ میں آپ کو لکھ کے دینے کو تیار ہوں کہ شاہ ہارون گیلانی کا بُرا وقت شروع ہو چکا ہے۔!'' خادم حسین نے کہنا شروع کیا۔

''آپ لوگ شائد خلوت یا جلوت میں سرکار کے ساتھ مسلسل نہیں رہے۔ نا ہی آپ کو کبھی سرکار کی خدمت میں دن رات بتانے کا موقع ملا۔ مجھے یہ سعادت حاصل ہوتی رہی ہے۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے ان کے کسی مرید کو نقصان پہنچایا، یا غلط کام کئے اور پھر ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی سے ان پر ڈٹے رہے۔ ان کے بڑے عبرت ناک انجام ہوئے۔ یا پھر جنہوں نے قادری سرکار کو دکھ پہنچانے کی یا ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ ان کے بھی بڑے خوفناک انجام ہوئے۔ میں اور ندیم سرکار کا خادم خاص ان میں سے کئی معاملات کے عینی شاہد ہیں۔ ایک مرتبہ ایک بہت مشہور سیاست دان نے سرکار کو ایک خاتون کے معاملے میں بدنام کرنے کی کوشش کی۔ یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ سرکار کے کئی عقیدت مند بھی ڈانوڈول ہو گئے۔ سرکار نے سب کو بلا لیا۔ ڈی آئی جی جو سرکار کے عقیدت مند تھے۔ ان کو بھی سرکار نے حکم دیا کہ وہ بھی آ جائیں، وہ خاتون خود بھی بہت معروف تھیں۔ بہت خوبصورت تھیں۔ خانقاہ میں یہ سارا معاملہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ ان

خاتون کے گاڈ فادر سیاست دان نے بڑی باتیں بنائیں۔ سرکار سب کچھ خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔

''میں اس تمام معاملے کو اپنے اللہ کریم عادل و رحمٰن حفیظ و مقتدر کے سپرد کرتا ہوں۔ خاتون خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتائیں کہ میں نے ان کے ساتھ کیا گستاخی کی۔؟''

خاتون کو بھی موقع مل گیا۔ اس نے اپنے بیان میں جو کچھ کہا، اس کو زبان پر لانا ہی باعث شرم ہے۔ اس نے جو کہا کم از کم کوئی شریف زادی اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔

اُدھر سرکار کمالِ ضبط سے سنتے رہے۔ ہم سب دم بخود تھے۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ ٹوکے سے اس عورت کا قیمہ قیمہ کردوں۔ جس کی زبان اس قدر فحش ہوگی۔ اس کے کردار کا کیا کہنا۔ کیا سننا۔؟ مگر سوہنے رب کو تو جی اپنے بندوں کی عزت پیاری ہوتی ہے۔ وہ اندھوں کو آنکھیں، اور تاریک دلوں کو روشنی ایسے ہی واقعات سے عطا فرماتا ہے۔ جب عورت بک جھک کر خاموش ہوگئی، تو قادری سرکار نے دو رکعت نماز نفل پڑھی اور بلند آواز سے دُعا کی۔

''اے اللہ اے۔ میرے معبود۔ اے ستار العیوب۔ اے مقلب القلوب۔ تو میرا سچا رب ہے۔ ہم سب کے دلوں کا حال، میری بے گناہی اور گناہ ہر شئے کو حقیقی طور پر جانتا ہے۔ اے میرے معبود اس خاتون نے جو الزامات لگائے۔ اگر یہ سچ ہیں تو میرے بدن کا وہ حصہ سڑ جائے، کوڑھ زدہ ہو جائے۔ جس کے ذریعے میں نے اس خاتون کی بے حرمتی کی ہو۔ یا عادل یا غفار یا قہار میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو اپنا عدل دکھا۔''

قادری سرکار دُعا کے بعد آنکھیں بند کر کے وہیں جاءِ نماز پر بیٹھے رہے۔ قادری سرکار کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ابھی دو چار منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ وہ خاتون بدن کے مختلف حصوں کو کھجانے لگی۔ اچھر اچانک وہ چیخنے لگی۔ اس کے ناخون، خون اور گوشت کے ریزوں سے بھر گئے۔ یوں لگا کہ جیسے ان تمام حصوں سے خون اور گوشت گل کر گر رہا ہو۔ پھر اچانک ہی اس عورت کے ساتھ آئے ہوئے سیاست دان بھی چیخنے لگے۔ ''مجھے گرمی لگ رہی ہے۔ مجھے آگ لگ رہی ہے۔'' ذرا دیر میں انہوں نے اپنا تھری پیس اُتار پھینکا اور تقریباً برہنہ ہوکر چیخنے لگا۔

قادری سرکار رب کے آگے سجدہ ریز ہوگئے۔ ہم سب حیران تھے۔ اچانک ڈی آئی جی صاحب اٹھے اور انہوں نے سرکار کے پاؤں پکڑ لئے۔ ''حضور بس کردیں۔ سرکار معاف کردیں۔ معاف کردیں۔!'' خود وہ بھی کپکپا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اللہ رب العزت نے اپنے ولی، اپنے پیار کرنے والے کا معاملہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ چاروں طرف جلال کی تابانیاں عروج پہ تھیں۔ ہم سب بری طرح کپکپا رہے تھے۔ ہمارے گھٹنے کانپنے لگے اور ہم سب جہاں تھے اللہ کے حضور سجدے میں گر پڑے۔ بس ڈی آئی جی تھے جو سرکار سے مسلسل التجائیں کر رہے تھے۔ آخر کار سرکار کو رحم آ گیا۔ انہوں نے درودِ تاج کی بڑی خوش الحانی سے تین مرتبہ تلاوت کی۔ جوں جوں درود شریف کی تلاوت ہو رہی تھی، خاتون اور ان سیاست دان کو قرار آتا جارہا تھا۔ خانقاہ کی فضاؤں سے جلال کے اثرات کم ہونے لگے۔

سرکار نے فرمایا۔ ''بی بی ہم فقیروں کو تنگ نہ کیا کرو۔ جاؤ اللہ حفاظت فرمائے۔!'' وہ دونوں بڑی ہی مشکل سے وہاں سے توبہ کرتے اور گھسٹتے ہوئے اپنے وجود لے گئے۔ ایسے نجانے کتنے ہی واقعات ہیں۔!'' خادم حسین خاموش ہوگیا۔

''اللہ والوں سے محبت رکھنی چاہیے ان پر الزامات توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔!'' قدیر نے بے ساختہ توبہ توبہ کی۔

مریض ٹھیک ہو جاتا ہے۔!'' بالے نے تفصیل سے بتایا۔
نجانے کیوں یہ سب سن کر عبداللہ شاہ کو جھرجھری سی آ گئی۔ گاڑی حویلی پہنچی تو سب اس کے منتظر تھے۔

☆☆☆☆

درگاہ حضرت میاں کے ٹھیکے کا نوٹیفکیشن اپنے ہاتھوں میں لیکر پیر ستارہ شناس کی عجیب سی حالت ہو گئی۔ بعض کامیابیاں بار بار یقین کی محتاج ہوتی ہیں۔ وہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو بار بار چھو کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک اور آنکھوں کی پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بدن ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا ستارہ۔۔؟'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کی آواز اس کو دوبارہ حواسوں کی دنیا میں لے آئی۔

''یہ۔۔یہ۔۔۔!'' اس نے بس اتنا ہی کہا۔ اور اس سے زیادہ کہا بھی نہیں گیا۔

''دیکھ لو ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے بڑے مربیانہ لہجے میں کہا۔'' پیر اپنا وعدہ ہر حال میں پورا کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو بندوں کو خدا سے کیسے ملائیں۔؟'' ان کے لہجے میں دنیا جہان کا اعتماد اور بلا کا طنطنہ تھا۔

''جی۔۔۔جی۔۔!'' پیر ستارہ شناس نے صرف اتنا ہی کہا اور چپ ہو گیا۔

''یہ لیجئے شربت لے لیجئے ذرا دل ٹھہر جائے گا۔!'' سہیل نے ایک گلاس اس کی جانب بڑھایا۔ پیر ستارہ شناس نے سہیل کے ہاتھ سے گلاس لیکر غٹا غٹ چڑھا لیا۔ اور ہونٹوں پر زبان پھیری۔ سہیل نے اس کی کیفیت دیکھ کر دوسرا گلاس بھرا اور اس کو پکڑایا۔ اس مرتبہ پیر ستارہ شناس نے ٹھہر ٹھہر کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنا شروع کیے۔ شربت صندل کا تھا۔ خوش ذائقہ، رنگت اور خوشبو سے بھرپور۔ پہلی بار تو اس کو احساس ہی نہ ہوا تھا کہ اس نے کیا پیا ہے؟۔ لیکن اب گھونٹ گھونٹ، تری اور ٹھنڈک اس کے اندر اتر رہی تھی۔ اس کے حواس جو مختل ہو گئے تھے۔ دوبارہ بحال ہو رہے تھے۔

جب اس نے پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کو بتایا کہ اس نے ساٹھ لاکھ کا بندوبست کر لیا ہے۔ تو اول تو پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کو یقین ہی نہ آیا مگر جب اس نے کہا کہ اس میں کیا جرأت کہ وہ شاہ ہمدانی سے اس قسم کا مذاق کرے تو انہوں نے کہا۔ ٹھیک ہے وہ پیسے لیکر آ جائے۔ مگر پیر ستارہ شناس جانتا تھا کہ اگر یہ پیسہ بغیر کسی ضمانت کے اس نے تھما دیا تو پھر کام نہیں ہونے کا۔ اس کی اتنی حیثیت تو تھی نہیں کہ وہ پیسہ واپس شاہ ہمدانی سے لے سکتا۔ لہٰذا اس نے کہا کہ یہ پیسہ زینت کا آبائی گھر بیچ کر لیا ہے۔ اب زینت ہی سے آپ بات کر لیں۔ زینت نے صاف صاف کہا کہ پیر جی میں تو اپنے میاں کے سارے ہتھکنڈے جانتی ہوں۔ آج تک اس نے پیسہ ڈبویا ہے کمایا نہیں۔ اب میں اپنی ساری جمع پونجی بغیر کسی ضمانت کے کیسے اس کو تھما دوں۔؟ مجھے تو ٹھیکے کا نوٹیفکیشن چاہئے۔ پیسہ حاضر ہے۔ اِس ہاتھ لے، اُس ہاتھ دے۔

پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کی دنیا میں اگر کوئی کمزوری تھی تو وہ پیسہ تھی۔ اور پھر نقد نارائن پر تو ان کی جان جاتی تھی۔ اور ویسے بھی ان کا خرچہ کیا تھا؟۔ انہوں نے مقصود حمیدی سے کہہ کر بنک چالان بنوا کر پیر ستارہ شناس کو دیا۔ اس نے بنک میں چالان جمع کرایا۔ دو گھنٹے کے بعد ہی مقصود حمیدی نے ٹھیکے کی منظوری کا نوٹیفکیشن بھجوا دیا۔ اور اب وہی نوٹیفکیشن پیر ستارہ شناس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری کیے ہوئے تھا۔

کامیابی یوں بھی ملتی ہے۔ قسمت اس طرح بھی مہربان ہوتی ہے۔ قدرت کے کھیل کتنے نیارے ہیں۔ آگ لینے جائیں پیغمبری مل جائے۔ یہ تو سنا تھا۔ ایمان کا حصہ تھا۔ مگر جو بھی تھا جگ بیتی تھا۔ آپ بیتی تو اب بنا۔

واہ مولا۔ کمال ہے تو۔ کیسے کیسے نوازتا ہے۔ اس کو یاد آیا۔ ایک مرتبہ اکبر نے ملا دو پیازہ سے پوچھا۔

''یہ بتاؤ کہ خدا ہر وقت کیا کرتا رہتا ہے۔؟''

ملا نے کہا۔ ''عالم پناہ! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟''

بادشاہ۔ جہاں پناہ عالم پناہ۔ اپنے مزاج، اپنی تمناؤں، اپنی ذات کے اسیر ہوتے ہیں۔ ضدی، ہٹ دھرم، انا پرست۔ اپنی آرزوؤں کو پورا کرنے والے۔ انہیں تو جواب وہ چاہیے ہوتا ہے جو انہیں مطمئن کرے۔ کہا۔ ''ملا تمہیں جان کی امان دی۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہماری تسلی ہو۔''

ملا آگے بڑھا۔ کورنش بجالایا۔ قدم بوسی کی اور بولا۔ ''حضور! تا قیامت بلندر ہے اقبال، نہ ہو آپ کی سلطنت کو زوال، دنیا ازل سے جانتی ہے۔ سرکار والا تبار کے ذہن رسا سے کب یہ امر پوشیدہ ہے کہ سوال کرنے والے کا رتبہ جواب دینے والے سے ادنیٰ ہوتا ہے۔ اگر سرکار کے مزاج کو گراں نہ گزرے تو جواب شافی و کافی اسی وقت ممکن ہے کہ حضور والا اس ادنیٰ کی جگہ آئیں اور میں آپ کی جگہ آؤں۔ آپ سوال کریں اور میں جواب دوں۔!''

مزاج شاہی کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔ خبطی اگر بادشاہ نہ ہوں تو دنیا کی تاریخ کیسے بدلے۔ لوگ خبطی کو برا سمجھتے ہیں۔ مگر خبطی ہی تو کسی چیز کے پیچھے پڑ کر خواہشوں کے سمندر سے گوہر مراد کو لاتے ہیں۔ اگر عشق خلل نہ ہوتا دماغ کا، تو کاہے کو مقبرہ تاج محل کا روپ لیتا۔ بڑے بڑے کام خبط سے سرانجام پائے۔ پاگل اور سڑی پن تو مقصد کے تعین سے ظاہر ہوتا ہے۔ عشق بلا خیز نہ ہو، تو معشوق کے شوہر کا قتل بھی محبوب کو مرغوب ہوتا ہے۔ اور دنیا کے پردے پر نور جہاں ملکۂ جہاں کے روپ میں رونق افروز ہوتی ہے۔ اگر یہی عشق کسی معمولی فرد کا ہو تو جذبات چاہے، جس قدر بھی عالی قدر ہوں، انجام بدتر ہی ہوتا ہے۔

حکم صادر ہوا۔ ''بسر و چشم۔'' بادشاہ اٹھے۔ اپنی جبہ اور دستار اتاری۔ ملا دو پیازہ کو عطا کی، عصائے شاہی تھمایا۔ اور خود ملا کی جگہ جا کھڑے ہوئے اور بڑے عجز اور انکسار سے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ کہ خدا ہر وقت کیا کرتا رہتا ہے۔؟''

ملا دو پیازہ نے کہا۔ ''اے بادشاہ۔ اے عالی پناہ۔ خدا علیم و خبیر، عادل و غفار، جبار و قہار۔ خدا۔ اکبر کو سوالی بنا کر غلاموں کی صف میں کھڑا کرتا ہے۔ اور ملا کو بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھاتا ہے۔ وہ عالی مرتبت ہے۔ مؤخر ہے۔ مُبدی ہے۔ اوّل ہے۔ دنوں کے الٹ پھیر اور دلوں کے الٹ پھیر دونوں پر قادر ہے۔ شاہ کو گدا بنانا، اور گدا کو شاہ بنانا اس کی قدرت کاملہ کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔'' وہ اٹھا اور جھک کر بادشاہ کی قدم بوسی کی۔

بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ زندگی کا۔ مرتبے کا، عہدے کا بھروسہ کیا؟ یہ سارے تام جھام خدا کی رضا سے مشروط ہیں۔ اس کی رضا سے، اس کے اشارے پر دلوں میں محبت، رعب اور دبدبہ پڑتا ہے۔ لوگ نگاہوں کو، دل کو فرش راہ کرتے ہیں۔ اور جب عطا قضا میں بدلتی ہے۔ تو یہی بوریہ نشین، عزلت نشین، خاک نشین جو دلوں کو، نگاہوں کو فرش راہ کرتے ہیں۔ پھر ان ہی فرشوں پر شاہوں کے بدن گھسٹتے ہیں۔ احترام کا رشتہ، انتقام میں ڈھل جاتا ہے۔ عالم پناہ۔ ظلِ الٰہی، اقبال مند، بخت جہاں، بدبخت ہو جاتا ہے۔ گردن اٹر کر لڑھکتی ہوئی قدموں میں جا پڑتی ہے۔ اور بدن پیروں تلے روندا جاتا ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

پیر ستارہ شناس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور وہ رونے لگا۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی اسے دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر میں وہ رو کر چپ ہو گیا۔ اس نے اپنی آستینوں سے آنسو پونچھے۔ ارد گرد دیکھا۔ سہیل اس کو شربت دیکر چلا گیا تھا۔ صرف جہانگیر شاہ ہمدانی ہی موجود تھے۔ ''معاف کیجئے گا شاہ جی مجھے اپنے اوپر قابو نہ رہا۔!'' پیر ستارہ شناس نے سادگی اور صاف گوئی سے کہا۔ ''آپ کی یہ عنایت میری اوقات سے بڑی تھی۔

اس لئے جلدی سنبھالی نہ گئی۔ سننا، دیکھنا اور خواہش کرنا ایک علیحدہ امر ہے، اور اس کو پورا ہوتے دیکھنا دوسرا۔''

''مسئلہ اوقات کا نہیں، ظرف کا ہے۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔'' آہستہ آہستہ سنبھل جاؤ گے۔!''

''مگر میری ایک شرط ہے استدعا کے روپ میں!'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''کہو۔۔۔!''

''میری راہ نمائی کرتے رہئے گا۔ یہ درگاہ بہت بڑی ہے۔ اور میں بہت چھوٹا۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے۔ ذمہ داری کا۔'' پیر ستارہ شناس نے بڑی آہستگی سے کہا۔

''بس ایک بات یاد رکھنا۔۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اسے جواب دیا۔''اس درگاہ پر اہل غرض، فقیر بھی آتے ہیں۔ اور صاحبِ اقبال، ثروت مند، ظفر مند بھی۔ ہر آدمی ضرورت رکھتا ہے۔ مگر کہنے اور برتنے کی غائیت مختلف۔ اگر کسی سے کسی کام کے لئے پیسے لئے ہیں تو ہر صورت وہ کام کرنا ورنہ پیسے واپس کرنا۔ اس سے ساکھ بنتی ہے۔''

''برا نہ مانئے گا۔ لیکن آپ کے متعلق تو مشہور ہے کہ آپ کسی کا پیسہ واپس نہیں کرتے۔!'' پیر ستارہ شناس نے پوچھا۔ اور ان کی طرف دیکھا۔ مبادا وہ برا تو نہیں مان گئے۔

مگر وہ برا مانے بغیر ایک قہقہہ لگا کے بولے۔''ہاں سچ تو یہی ہے کہ ستارہ ہم سے پیسے لئے جاتے ہیں۔ دیئے نہیں جاتے۔ تم ہی بتاؤ کہ تم نے کبھی کسی سائل کے پیسے واپس کیئے۔؟ نہیں نا۔ تو پھر ہم کیسے واپس کر دیں؟ مگر اس کے لئے بھی کچھ طریقہ کار ہوتا ہے۔ معدہ، نیت اور شخصیت یہ تینوں ہی تکون بناتے ہیں ایک ایسی مثلث کا جس کا ابھی تم ایک ضلع بھی نہیں بنے۔'' وہ ہنسے اور بولے۔''سہج سہج کے کھانا۔ ورنہ بد ہضمی ہو جائے گی۔ بدنام ہو گئے تو ٹکے کے نہ رہو گے۔''

''سچ کہتے ہیں آپ۔؟'' پیر ستارہ شناس نے انتہائی عقیدت سے کہا۔ اور ذہن میں اس مثلث کو بٹھا لیا۔''بس ایک کرم اور کیجئے گا۔''

''بولو بھئی! آج تو ہمارا دریائے کرم اپنی روانی پر ہے۔'' وہ ہنسے۔

''وہ جو میں نے آپ سے شجرے کا کہا تھا۔؟'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''تم اپنا شجرہ تو لاؤ پھر دیکھ لیتے ہیں۔!'' وہ بولے۔''ہم کب اپنی بات سے پھرتے ہیں۔؟''

''ہم کیا۔ ہمارا شجرہ کیا۔'' پیر ستارہ شناس نے عاجزی سے کہا۔''قلم آپ کے ہاتھ میں، مہر آپ کی، نسبت آپ کی، تصدیق آپ کی۔ ہم کیا اور ہمارا حسب نسب کیا۔؟''

پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔''چلو یہ بھی ہوا۔ تم درگاہ حضرت میاں کے سجادہ نشین بھی، اور بولو۔؟''

پیر ستارہ شناس اٹھا۔ اور ان کے پیروں میں بیٹھ گیا۔''اب جب اپنا بنا ہی لیا ہے تو کبھی جدا نہ کیجئے گا۔!''

''ہم تو جدا نہیں کرتے۔ لوگ جدا ہو جاتے ہیں۔ ستارہ۔۔! یہ دنیا غرض کی ہے۔ ہم سے لوگ ملتے ہیں۔ اپنا کام نکلواتے ہیں۔ ہم اپنے بچپن سے یہی دیکھتے آ رہے ہیں۔ جب تک کسی کی گوٹ کہیں نہیں پھنستی۔ کوئی قابو میں نہیں آتا۔ سانپ سارے دنیا میں ٹیڑھا میڑھا چلتا ہے۔ مگر اپنے بل پر آ کر سیدھا ہو جاتا ہے۔ مگر انسان وہ چیز ہے جو اپنے بل پہ بھی سیدھا نہیں ہوتا۔ دنیا ہم سے غرض کا رشتہ رکھتی ہے۔ ہم بھی غرض کا رشتہ نبھاتے ہیں۔ اپنے تعلقات، اپنے رتبے اور حیثیت کے مطابق قیمت وصولتے ہیں۔ تم بھی ایک دن معتبر ہو جاؤ گے تو ہم میں سو کیڑے نکالو گے۔!''

''اللہ نہ کرے۔!'' بے ساختہ پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''اللہ کرے۔۔نا کرے۔۔ بندہ ضرور کرتا ہے۔!'' انہوں نے اس بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔ ''ہر آدمی اپنے ظہور سے ڈرتا ہے، اپنی کمزوری اور خامی کو سامنے لانے سے ڈرتا ہے۔ ہم لوگوں کی کمزوری اور خامیوں کو جانتے ہیں۔ اسی لئے لوگ ایک وقت کے بعد ہم سے آہستہ آہستہ دور ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی یہ پیری ،مریدی کی دنیا ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہر شخص خود اپنی سلطنت کا خدا بنا بیٹھا ہوتا ہے۔''

پیر ستارہ شناس نے کچھ نہ کہا۔ کہنے کو تھا بھی کیا؟۔ جب تک وہ ایک مرتبے پر فائز نہیں ہوا تھا۔ تب تک بات اور تھی۔ مگر اب اس کو ان کی بات میں سچائی کا عنصر مل گیا تھا۔ جب ہم اپنی ذات سے سمجھوتے اور اپنے آپ سے پہلا جھوٹ بولتے ہیں تو سیاہی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ خال خال ہی کوئی اس سیاہی سے بچ سکا ہے۔ جس کو دل کی سیاہی کہتے ہیں۔

☆☆☆☆

''کاہے کی مٹھائی اٹھائے چلے آ رہے ہو۔؟'' زینت نے پیر ستارہ شناس کو مٹھائی کے ڈبے اٹھائے اندر لاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''ارے نیک بخت بھول جاتی ہو کیا۔؟'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔ ''آج بتاؤ تو بھلا کیا ہوا؟''

''اُسی نحس صورت نے کچھ گُل کھلایا ہوگا۔؟'' زینت نے صبح کی بات یاد کرتے ہوئے کہا۔

''کون۔۔؟'' پیر ستارہ شناس کے ذہن سے بات نکل گئی تھی۔ ''کس کے پیچھے پڑ گئی ہو اب؟''

''وہی حکیم منڈی بہاؤالدین والے کی، صبح اس نے تمہیں نہیں بلایا تھا کیا۔؟'' زینت نے اسے یاد دلایا۔ ''جب صبح پانچ بجے ہی اس نے گھنٹی بجا دی تھی، خطرے کی۔''

''اچھا۔۔!'' پیر ستارہ شناس ہنسا، یاد کر کے صبح کی بات۔ ''وہ تو میں نے تمہیں ٹالنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ ورنہ تم اس وقت ہی میرے کان کھانے لگتیں۔''

''کیا مطلب۔۔؟'' زینت خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''دراصل میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا وہ فون پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کا تھا۔ انہوں نے بلایا تھا۔ میں نے سوچا نجانے کیا بات ہو اور تم چراغ پا ہو جاؤ۔ اس لئے ٹالا تھا۔ یہ دیکھو ہمیں درگاہ حضرت میاں کا نوٹیفکیشن مل گیا ہے۔ اب ہم وہاں کے قانونی ٹھیکے دار ہیں۔'' پیر ستارہ شناس نے مٹھائی کے ڈبے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھے۔ اور جیب سے سرکاری مہر والا لفافہ نکال کر زینت کو دیا۔ ''لو یہ دیکھو اور پڑھو۔''

''مجھے نہیں پڑھنا۔!'' زینت مسکرائی۔ ''مجھے تمہاری زبان سے سننا ہی کافی ہے۔!''

''کیوں۔۔۔ثبوت نہیں۔؟'' پیر ستارہ شناس ہنسا۔

''جب تمہاری زبان کے آگے ہار مان کر نکاح کے فارم پر دستخط کر دیئے تو ان کاغذی ٹکڑوں کا ثبوت کیا؟۔ میرا تو ثبوت تم ہو۔!''

پیر ستارہ شناس نے بڑی محبت سے اس عورت کو دیکھا۔ جس نے اپنے دولت مند باپ کی دولت، کروڑ پتی منگیتر کو صرف اس کے لئے، اس کی محبت میں ٹھکرا دیا تھا۔ اور ہر اچھے برے، تنگی، ترشی میں اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اور منہ سے اُف تک نہ کیا تھا۔ اتنے بھروسے، اتنے مان کے قابل تو میں نہ تھا۔ پیر ستارہ شناس نے سوچا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔؟'' وہ بولی۔ پیر ستارہ شناس نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ آج تک ویسی ہی تھی، کسی ہوئی، شوخ، چنچل، آگ صفت، شبنم، کبھی کبھی ٹھنڈ بھی تو آگ لگا دیتی ہے۔

''اپنی قسمت پر ناز کر رہا ہوں۔!'' وہ ہنسا۔ ''شکر کرتا ہوں کہ تم جیسی بیوی ملی۔!''

''ہاں ناز کرنا بھی چاہیے ستارہ جی! ویسے پیر تو تم ہو مگر ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ ہم دونوں ہی جنتی ہیں۔!''

''اچھا۔۔۔!'' پیر ستارہ شناس نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''یہ انکشاف کیونکر ہوا۔ کس کیفیت میں، مراقبے میں، یا حالت جنون میں۔؟''

''عالم حواس میں۔۔!'' اس نے ترنت جواب دیا۔ ''تم مجھے دیکھ کر شکر کرتے ہو۔ اور میں تمہیں دیکھ کر صبر کرتی ہوں۔ اور میاں جی صابر اور شاکر دونوں ہی جنتی ہیں۔ چاہو تو پوچھ لو کسی عالم دانا و بینا سے۔!''

پیر ستارہ شناس ہنسنے لگا۔ زینت نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا۔ اس میں سے ایک گلاب جامن نکالا اور پیر ستارہ شناس کو دیا۔ اس نے آدھا کھایا اور آدھا زینت کو کھلایا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میری اصل خوش قسمتی کیا ہے۔؟'' پیر ستارہ شناس نے پوچھا۔

''تم ہی بتاؤ۔۔!'' وہ مسکرائی۔ اس کے سفید ہموار دانت، بھرے بھرے گلابی ہونٹوں کے پس منظر میں جھلملائے۔

''تم۔۔ تمہارا پیار، تمہاری محبت، تم سے اللہ نے مجھے بچے دیئے، مجھے مکمل کیا۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے ورنہ میں دیکھتا ہوں کہ لوگ کس قدر گھریلو مسائل، ازدواجی جھگڑوں، شک اور وہم کے باعث اپنی زندگی اجیرن کئے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے میں بہت قسمت والا ہوں۔''

زینت کچھ نہ بولی۔ بس پیار سے اس کو دیکھتی رہی۔ بعض اوقات خاموشی بھی جذبات کی تفسیر بن جاتی ہے۔

''پھر کب سے درگاہ سنبھال رہے ہو۔؟'' زینت نے پوچھا۔

''پہلی نومبر سے سنبھالوں گا۔ آج دیکھ آؤں گا۔''

''کیا مطلب؟۔۔ زینت نے پوچھا۔'' کیا اس سے پہلے نہیں دیکھا ہے درگاہ کو۔؟''

''پگلی۔۔ اب تو اس کو سجادہ نشین کی نگاہ سے، ٹھیکے دار کی نگاہ سے دیکھوں گا۔!'' اس نے وضاحت کی۔

''میں بھی چلوں۔؟'' زینت نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ اس کے لہجے، آنکھوں، پور پور سے شوق چھاجوں برس رہا تھا۔ بعض مختصر جملے بھی آدمی اور جذبے کے درمیاں کیسی کیسی مناسبت پیدا کر دیتے ہیں۔ سارا اندر باہر جھانکنے لگتا ہے۔

''اچھا ٹھیک ہے چلو تم بھی، آج شام کو چلتے ہیں۔'' پیر ستار شناس نے کہا۔

''اسی وقت پیر ستارہ شناس کے فون پر بیل ہوئی۔ ''ہیلو۔۔!'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔

''کیا حال ہے پیر جی۔؟'' دوسری طرف سے رائما کی مترنم آواز سنائی دی۔ ''میں نے سوچا پیر جی کو سلام کر لوں۔؟''

''کہاں ہو۔؟'' پیر ستارہ شناس نے خوش دلی سے پوچھا۔ ''جنیوا میں، جنوبی وزیرستان میں یا پھر اپنے وزیر آباد میں۔؟''

''پیر جی واقعی تم پہنچے ہوئے ہو۔!'' رائما ہنسی۔

''ارے ہم کہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ وہی ہماری بیگم ہیں کئی برس پرانی، تم سناؤ جس کے دن عید، رات شب برأت کہو کس جنت میں ہو۔؟''

''ہم جنت میں کہاں۔ جنت میں ہوتے تو ملک ریاض یہاں ہوتے۔؟''۔ اس نے قہقہہ لگایا۔

اس کے ساتھ ہی کسی نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔ ''ارے اس کے ساتھ تو جہنم بھی قبول ہے۔!'' ملک ریاض کی کھلکھلاتی ہوئی آواز آئی۔

''یہ تو آپ کے دم قدم کی برکت ہے۔ جہاں گئے انگارے بجھا دیئے۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔ ''مگر اس موقع پر اس پیر کو نہ بھول جایئے گا کہ جس نے آپ کے دل کی کلی کھلا دی۔''

''پیر جی تم سے تو بہت کام ہیں۔!'' اب تو رابطہ رہے گا'' ملک ریاض نے کھلکھلا کے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

''لگتا ہے بہت خوش ہے۔!'' زینت نے تبصرہ کیا۔

''ہاں۔۔۔!'' پیر ستارہ شناس نے جواب دیا۔ ''جب بے تحاشہ پیسہ ہو، اور پیسہ لٹانے کے لئے معقول وجہ خرابات، تو پھر آدمی خوش ہی ہوتا ہے۔''

''اب تمہارے پاس بھی بہت پیسہ ہوگا۔ کہیں تم بھی ان خرافات میں تو نہ الجھ جاؤ گے؟'' زینت نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔۔۔!'' پیر ستارہ شناس نے سچائی سے جواب دیا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے شراب نہیں پی۔ رشوت نہیں لی، گناہ نہیں کیا، جوا نہیں کھیلا۔ مگر اصل بات تو یہ ہے کہ موقع کتنا ملا؟۔ اور جب موقع ملا تو باز رہے؟۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ بس تم ضمیر کے احتساب کی صورت میرے ساتھ رہنا۔''

''پیر جی! ضمیر انسان کے اندر ہوتا ہے باہر نہیں'' زینت نے کہا۔ ''کردار دباؤ، دھونس، زبردستی سے نہیں سنورتے، اپنے آپ سے سنورتے ہیں۔ سنبھلنا تو صرف تم ہی کو ہوگا۔ ورنہ جو دوسروں کا اثاثہ تباہ کرتے ہیں۔ ان کا اپنا اثاثہ آگ کی نذر ہو جاتا ہے۔''

''کونسا اثاثہ۔۔۔؟'' پیر ستارہ شناس نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ اثاثہ جس کو عزت، شرم، حیا کہتے ہیں۔ بیوی، بہو، بیٹی۔!'' زینت نے پیر ستارہ شناس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

پیر ستارہ شناس نے زینت کی طرف دیکھا۔ زینت کی نگاہوں میں نجانے کیا تھا کہ پیر ستارہ شناس کی آنکھیں جھک گئیں۔

☆☆☆

''زندگی کی خوبصورتی اور بدصورتی کا فیصلہ ہمارے خیالات کرتے ہیں۔ اگر خیالات مثبت ہیں۔ تو پھر ایک ایسی دنیا تعمیر کرتے ہیں جہاں سکون ہوتا ہے۔ کیا کبھی آپ نے سوچا کہ خیالات سکون بھی دیتے ہیں۔ اور خیالات سکون چھین بھی لیتے ہیں۔ ذرا اپنے آپ پر غور کیجئے۔ کتنے خیالات ایسے تھے کہ جن کی وجہ سے ہماری نیندیں اڑ گئیں۔ اور کتنے خیالات ایسے تھے کہ جن کے ذریعے ہم نے دوسروں کا سکون برباد کر دیا۔ خیالات کیسے ظاہر ہوتے ہیں۔؟'' قادری سرکار کا درس جاری تھا۔ ان کے عقیدت مند، مداح، مریدین نہایت ادب سے سر جھکائے ان کے خیالات سے مستفید ہو رہے تھے۔

وہ ذرا ٹھہرے اور ان لوگوں کی طرف دیکھا کر دوبارہ بولے۔ ''خیالات، لفظ کی صورت ظاہر ہوتے ہیں۔ اور لفظ حرف سے، اور لفظوں کو جوڑ کر جملے اور جملوں پر عبارت قائم ہوتی ہے۔ غور کیا آپ نے؟ ہر شے ایک تسلسل سے چلتی ہے۔ خیالات کا اظہار، گفتگو سے، باہمی مکالمے سے ہوتا ہے۔ خیالات اور لفظوں کے پیچھے احساسات کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ احساسات، جذبات خیالات پر منفی اور مثبت دونوں طریقوں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور آدمی کا رخ متعین ہو جاتا ہے۔ خیالات، احساسات، جذبات ہمارے تجربات کے

قادری سرکار کی انہیں آواز سنائی دی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔

"صاحبو!۔ قرآن مجید کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اس میں موجود بعض قصے ایسے ہیں، جو کہ نا صرف یہ کہ تاریخی حقیقتوں کو سامنے لاتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ خدا ان کی مثال کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی پر منطبق فرما دیتا ہے۔ اور ہمیں اس کے ذریعے اپنی اصلاح کا موقع دیتا ہے۔ ایسی ایک مثال اصحاب کہف کی ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ظالم بادشاہ سے بچا کر ایک غار میں گہری نیند میں سلا دیا تھا۔ اور پھر کئی سو برس کے بعد انہیں بیدار کیا تو انہیں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ دو چار گھڑی ہی سوئے ہیں۔ جب ان میں سے ایک کھانا لینے باہر نکلا تو انہیں ان کے سکوں کے ذریعے پہچانا گیا۔ اور ان بھائیوں پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ کئی سو برس سوتے رہے ہیں۔ دوستو! اس قصے میں عبرت کے کئی پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں موت کے بعد جی اٹھانے پر قادر ہے۔ دوسرے یہ کہ جو اللہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ظلم کے خلاف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ فانی زندگی کتنی طویل کیوں نا ہو جائے بالا آخر اس کو ختم ہو جانا ہے۔ چوتھے یہ کہ اللہ چاہے تو انسان کے بدن کو مٹی نہیں کھا سکتی۔ پانچویں یہ کہ خدا جب چاہے کسی کو بھی، کسی بھی نگاہ سے پوشیدہ کر دے۔ چھٹے یہ کہ زندگی جو بھی بے خبری میں گذاری جائیگی اس کی جواب طلبی لازمی ہوگی۔ ساتویں یہ کہ خدا مظلوم کو ظالم کے مقابلے میں ہمیشہ محفوظ رکھتا ہے۔!" وہ کہہ کر ذرا رک کے اور بولے۔

"صاحبو!۔ اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک ہے "اللطیف جل جلالہٗ" دوسرا اِسم مبارک ہے "السلام جل جلالہٗ" "الطیف کو یالطیف" کے اِسم ندا سے پڑھتے ہیں۔ اور اس کا مطلب ہے انتہائی درجے کا باریک بین، چیزوں کی کیفیات اور حقیقتوں کو سمجھنے اور تخلیق کرنے والا، کہ ہمیں جن میں سے بعض کی جہت کا علم بھی نہیں ہوتا۔ مگر وہ ہوتی ہیں۔ دوسرے معنوں میں اسم الطیف ایک ایسا پردہ ہے۔ جس کے پار غیب کی دنیا ہے۔ وہ غیب جس کی حقیقت صرف اللہ کے علم میں ہے۔ جیسے عالم برزخ، جو پردہ ہے دنیا اور آخرت کے درمیان۔ جو پردہ ہے دوزخ اور جنت کے درمیان۔ جو پردہ ہے یوم حساب اور یوم مرگ کے درمیان۔ جو پردہ ہے عذاب قبر اور دنیا کے درمیان۔ اور جو پردہ ہے نگاہوں سے نگاہوں کے درمیان۔ تو جب چاہے اللہ اپنی صفتِ لطیف سے کثیف اجسام کو اتنا شفاف کر دے کہ وہ نظر ہی نہ آئیں۔ اپنے وجود کے باوصف، ان کے ہونے کے احساس کو ہی سلب کر لیا جائے۔!" آخری جملہ کہتے ہوئے قادری سرکار کی نگاہوں نے اُن کی نگاہوں کو جکڑ لیا۔

شاہ ہارون گیلانی کو محسوس ہوا کہ قادری سرکار انہیں دیکھ بھی رہے ہیں اور ان سے مخاطب بھی ہیں۔

ان کی آواز دوبارہ بلند ہوئی۔ "اللہ لطیف، خ اللہ سلام جو ظاہر اور باطن دونوں کا تخلیق کار اور جاننے والا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اپنی صفتِ سلام کے ذریعے انہیں پھر سے مکمل کر دیتا ہے۔ ان کے وجود کو کثیف کر دیتا ہے۔ اور ظاہر آنکھوں کی کیفیت اور ذہن کی صلاحیت کے مطابق انہیں ڈھال دیتا ہے۔ اور یوں زندگی کی اتھل پتھل کو ہموار کر دیتا ہے۔ تو کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنی اصلاح کر لیں۔ دوستو۔! ہمیں اپنے آج کی قدر کرنی چاہیے۔ وہ پل غنیمت ہیں کہ جن میں ہم ہیں۔ اس پل کی بہ نسبت کہ ہم جس میں نہیں ہونگے۔ فقط ایک یاد کی صورت باقی رہ جائیں گے۔ کیا وقت نہیں آیا کہ ہم توبہ کر لیں۔ اور عقل مند ہیں وہ نفوس جو کہ اپنے آپ کو بدل لیتے ہیں۔ اپنے آپ کو سنوار لیتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ہر چیز وجود سے عدم کا رخ کر لے، اور ہم پائیدار سے ناپید ہو جائیں۔ ہمیں اپنی اصلاح کر لینی چاہیے۔" ان کے لہجے میں بے پناہ نرمی حلاوت گداز تھا۔ ایک مشفق رہنما۔ ایک صلاح کار، ایک مخلص راہبر کا خلوص۔

شاہ ہارون گیلانی کو لگا کہ صرف اور صرف وہ قادری سرکار کے مخاطب ہیں۔ سب ہی کچھ تو ان سے کہا

جا رہا تھا۔ تمثیل کے پیرائے میں، کسی اور کی صورت حال ان پہ کلی طور پر منطبق ہو رہی تھی۔

ان کا جی چاہا کہ وہ بیٹھ جائیں قادری سرکار کے پاس اور ان سے کہیں کہ بتائیں کہ وہ ان سب سے کیسے نکلیں۔؟ ان کی ذات کی چاردیواری اتنی اونچی ہوگئی تھی کہ وہ کوشش کے باوجود پھلانگ نہیں سکتے تھے۔

''کوشش کرنا چاہئے ہمیں۔۔۔!'' قادری سرکار کی آواز انہیں سنائی دی۔''خدا کی طرف سے اصلاح کا جو بھی لمحہ مل جائے تو اس کے لئے پوری کوشش کرنا چاہیے۔ آیئے شاہ ہارون گیلانی۔!'' اچانک قادری سرکار ان سے مخاطب ہوئے۔

اس کے ساتھ ہی جیسے دنیا بدل گئی۔ ان پر نظر پڑتے ہی سب لوگ بے ساختہ کھڑے ہوگئے۔ بھلا کس میں جرأت تھی کہ وہ شاہ ہارون گیلانی کے سامنے بغیر اجازت بیٹھ سکے۔ سب ہڑبڑا کے اٹھے۔

قادری سرکار مسکرانے لگے۔

ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہیں۔ کیا کریں۔ کیا بولیں۔ جیسے سماعت، آواز، ہر چیز بے بس ہوگئی ہو۔ لمحے بھر میں ہونے اور نا ہونے کا سفر انہوں نے طے کرلیا تھا۔

انہوں نے دیکھا۔ سیدانی ان کی عزیز ترین بیگم بڑے احترام سے چائے بنا کر اپنے ہاتھوں سے قادری سرکار کو پیش کر رہی ہیں۔ نازاں سیب کاٹ کر ان کی قاشیں ان کو پیش کر رہی ہیں۔ اور عبداللہ شاہ گیلانی ان کے قدموں میں بیٹھا ہوا ہے۔

''عزیز جہاں بہن ہمارے تین بچے آپ کی پرانی حویلی میں موجود ہیں۔ ذرا ان کو بلوایئے۔ ہم ان کے ساتھ ہی چائے پینا چاہتے ہیں۔!''

''جی سرکار۔!'' سیدانی عزیز جہاں بیگم نے ادب سے سر جھکایا اور ریاضے کمدار سے کہا۔''جاؤ انہیں لیکر آؤ۔!''

ریاضے کمدار نے احترام سے گردن خم کی اور تعمیلِ حکم کے لئے روانہ ہوگیا۔

شاہ ہارون گیلانی کو یوں لگا کہ جیسے ان کا سارا وجود بے مصرف ہوگیا ہو۔

''آپ کے لئے چائے بناؤں۔؟'' سیدانی عزیز جہاں بیگم نے انہیں مخاطب کیا۔''آپ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔؟''

شاہ ہارون گیلانی کچھ نہ بولے۔ نازاں نے اپنے ہاتھوں تراشے ہوئے سیب کی قاشیں شاہ ہارون گیلانی کے سامنے رکھیں۔

انہوں نے بڑی حیرت سے قادری سرکار کی طرف دیکھا۔ جن کی خدمت کے لئے سیدانی اور بنتِ سیدانی خود دیدہ و دل فرشِ راہ کئے تھیں۔

چند ہی لمحوں میں ریاضے کمدار کے ساتھ ہم تینوں بھی حویلی کے مرکزی ہال میں پہنچ گئے۔ جہاں سرکار موجود تھے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرائے۔''آؤ میرے بچو۔۔!''

ہم تینوں دوڑتے ہوئے ان سے جا لپٹے۔ اس وقت اگر ہمیں سلیمانی خزانہ بھی مل جاتا تو شائد ہم اتنے خوش نہ ہوتے، جتنے ان کے پیار بھرے لہجے سے ہوئے تھے۔''آؤ میرے بچو!۔''

ہماری آنکھوں میں آنسو تھے۔

''شاہ ہارون گیلانی۔۔۔!'' قادری سرکار نے بڑی ملائمت سے کہا۔''جب ہمیں پتا چلا کہ بچے آپ کے مہمان ہیں۔ تو ہم نے بھی سوچا ہم بھی آپ کے مہمان بن جائیں۔!''

''یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے سرکار۔!'' سیدانی عزیز جہاں بیگم نے بہت ادب سے کہا۔''آج تو حویلی کی

نہیں، ہماری قسمت سنور گئی۔ اس حویلی پر تو آپ کے احسانات اس قدر ہیں کہ ہم مرنے کے بعد نہیں بھول سکتے۔!'' سیدانی عزیز جہاں بیگم کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

''نہیں بہن، بھائی اپنی بہنوں کے لئے دُعا کرتے ہیں احسان نہیں۔۔!'' وہ نرم لہجے میں بولے۔

''میں تو سچ مچ بھاگوں والی ہو گئی۔ آج اپنی ساری عبادتوں کا صلہ مل گیا کہ آپ کی بہن کے درجے پر فائز ہو گئی۔!''

شاہ ہارون گیلانی نے سوالیہ نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھا۔

وہ بولیں۔ ''نجانے کتنے احسانات ہیں میری ذات پر، اس حویلی پر سرکار کے۔ مگر سرکار نے کبھی پلکوں کے معمولی سے اشارے سے بھی اپنے احسانات کو نہیں جتلایا۔ یہ آج میں آپ کو بتاتی ہوں۔ مرحومہ بھابھی جان یعنی عبداللہ کی والدہ کے ہاں شادی کے آٹھ برس تک جب کچھ نہیں ہوا تو شاہ سکندر گیلانی اللہ ان کو کروٹ، کروٹ جنت نصیب کرے۔ اماں بیگم کے اصرار کے آگے مجبور ہو گئے تھے، دوسری شادی کے لئے، یہ آج سے اٹھائیس برس پہلے کا قصہ ہے۔!'' وہ سانس لینے کو رکیں اور پھر شوہر کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''ہم نے قادری سرکار کے متعلق کسی سے سنا تھا۔ غرض مند تو دیوانہ ہوتا ہے۔ سرکار کے در پر جا پہنچے۔ اور ان سے دُعا کی درخواست کی۔ سرکار نے کمالِ شفقت سے ہماری درخواست قبول فرمالی اور دُعا دی۔ اسم الٰہی کی تلقین کی اور اسی وقت فرمایا۔

''بیٹے کا نام عبداللہ رکھنا۔ یہ ہمارا بچہ ہوگا۔ ہماری دُعا سے، ہمیں اپنے رب سے سو فیصد اُمید ہے کہ وہ ہماری دعا اور تمہاری آرزو کو رد نہیں کرے گا۔''

اس دُعا کے ٹھیک نو مہینے کے بعد عبداللہ شاہ پیدا ہوئے۔ سکندر شاہ گیلانی کے گھر وارث کیا پیدا ہوا پھر دو رحمتیں اور بھی آ گئیں۔ مگر عبداللہ شاہ تو قادری سرکار کی دُعا ہے۔ پھر جب آپ شادی کے لئے راضی نہیں تھے۔ اور انگلینڈ میں کیتھرائن کے معاملات میں الجھ گئے تھے۔ تب سرکار ہی کی دُعا تھی جو آپ اس کے چکر سے نکل آئے۔ پھری ہماری شادی ہوئی۔ پھر آج سے پندرہ سال پہلے جب مخالفوں نے ہمارے اوپر سخت قسم کے وار کیے تھے۔ ہماری عزت داؤ پر لگ گئی تھی۔ تب بھی سرکار کی دعاؤں نے ہمیں بچا لیا تھا۔ آپ کے لئے ہم نے ہمیشہ قادری سرکار سے پوچھ کر دعائیں مانگیں۔!'' سیدانی عزیز جہاں بیگم طویل گفتگو کے بعد چپ سی ہو گئیں۔ چند لمحوں تک خاموشی طاری رہی۔ پھر سیدانی عزیز جہاں نے دوبارہ کہا۔ ''یہ بات تو ہم جانتے ہیں کہ آج سرکار کی آمد بے وجہ نہیں ہے۔ سرکار نے ہمیں دیا ہے لیا نہیں، آج پہلی بار اس حویلی کی دھول نے سرکار کے قدموں کا بوسہ لیا ہے۔ سرکار کا جو حکم ہوگا۔ اس پر سر آنکھوں عمل ہوگا۔!''

شاہ ہارون گیلانی جو انکشافات کے پے در پے بوجھ تلے دبے تھے۔ کچھ بھی نہ بول سکے۔

''حکم کیجئے سرکار۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے قادری سرکار کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا۔

''میرے بچے۔۔!'' قادری سرکار نے اس کے سر کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام کے بلند کیا۔ ''بچے یہاں نہیں ہوتے۔۔!''

''بچے یہیں تو ہوتے ہیں۔ اپنے بڑے، اپنے بزرگوں کے قدموں میں۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس کو اب سمجھ آیا کہ قادری سرکار کیوں اس کو اپنے اپنے سے لگے تھے۔ دُعا اور قبولیتِ دُعا کا رشتہ جو تھا۔

''میرے بچے تم ہماری دُعا ہو اور وہ ہماری تربیت۔!'' انہوں نے عبداللہ شاہ گیلانی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہماری طرف اشارہ کیا۔ ''تم دونوں ہی ہمیں عزیز ہو، پیارے ہو، ہم تم دونوں کی سبکی نہیں

چاہتے۔ ہمارے کہنے سے پہلے ہی تم تہہ خانے میں اپنا فیصلہ سنا چکے ہو۔!''

کتنا سچ ہے کہ جو ہونے والا ہوتا ہے۔ قدرت اس کے متعلق ہمیں پہلے ہی سے تیار کر دیتی ہے۔ ہمارے منہ سے نکلنے والے لفظ آنے والے معاملات کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔

''یہ تو ایک معمولی سا کام ہے سرکار۔۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی نے وفورِ مسرت سے کہا۔'' کاش آپ مجھ سے اپنی جان کا نذرانہ مانگتے۔!''

''جان صرف خدا کی امانت ہے میرے بچے۔!'' قادری سرکار نے کہا۔''اور صرف اسی کے لئے قربان ہو سکتی ہے۔!''

شاہ ہارون گیلانی خاموش رہے۔ قادری سرکار نے کہا۔''جو ہو رہا ہے۔ اس کے بہت سے فائدے ہیں۔ اللہ کی مصلحتیں بعض اوقات ہماری سمجھ میں اس لئے نہیں آتی ہیں کہ وہ قبل از وقت ہماری محدود عقل کے دائرے میں سما نہیں سکتیں۔ لہٰذا ہم ان میں الجھنے لگتے ہیں۔ جبکہ خدا کی رضا میں جھک جانا عافیت کا باعث ہوتا ہے۔ پردے رہ جاتے ہیں۔ کچھ حقیقتوں پر گرد پڑ جاتی ہے۔ سفر آگے بڑھ جاتا ہے۔ کدورتیں آہستہ آہستہ دور ہو جاتی ہیں۔'' قادری سرکار کہہ کر خاموش ہو گئے۔

ہم میں سے کوئی نہیں سمجھا کہ قادری سرکار کی اس گفتگو کی غرض و غایت کیا ہے۔؟ لیکن ان جملوں کا اثر میں نے شاہ ہارون گیلانی کے چہرے کی بدلتی رنگت میں دیکھ لیا تھا۔

''آپ لوگ میرے ساتھ آئیں۔!'' عبداللہ شاہ گیلانی قادری سرکار کے قدموں سے اٹھا اور ہمیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ہم نے قادری سرکار کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے ہمیں جانے کی اجازت دیدی۔ ہم کمرے سے باہر نکلے ہی تھے کہ ریاض کمدار نے بڑے ادب سے روک کر ہمارے موبائل فون ہمیں پکڑا دیئے۔ ہمیں تو ان فونوں کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے ہمیں اغوا کرتے ہوئے ہمارے موبائل اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ مگر اب بدلتی فضا میں وہ ہمیں دوبارہ دیدیئے گئے تھے۔

عبداللہ شاہ ہمیں لئے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں پہنچا۔ یہ کمرہ بھی مہمانوں کے لئے آراستہ تھا۔ مگر اس میں دیواروں کے ساتھ تین چار بیڈ بھی لگے ہوئے تھے۔ غالباً مہمان خانہ تھا۔ ہم وہاں جا کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔

عبداللہ شاہ گیلانی نے گفتگو کا آغاز کیا۔''آپ لوگ میرے متعلق تو جان ہی چکے ہونگے۔ آپ لوگوں کے متعلق میں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ مگر میں تمام معاملات میں سرکار کے حکم کو پیشِ نظر رکھتا ہوں۔ میری سچے دل سے خواہش ہے کہ میں الیکشن سے دستبردار ہو جاؤں۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ میری فطرت کے خلاف ہے۔ شائد اس کی وجہ یہی ہے کہ میں جس نیک ولی کی دُعا کا ثمر ہوں اُسی کا اثر مجھے غلط ہونے سے روکتا ہے۔ ظلم، خوف، جبر، زیادتی، میں ان سب سے نالاں ہوں۔ اس لئے میں واقعتاً الیکشن سے دست برداری کا اعلان کر رہا ہوں۔ آپ اس کو جس طرح چاہیں میڈیا پر لے آئیں، میں تیار ہوں۔''

''ہمیں تو سرکار کی مرضی مقدم ہے۔!'' قدیر نے جواب دیا۔ اور خادم حسین کی جانب دیکھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔''ٹھیک ہے جب فیصلہ ہو ہی گیا تو پھر لیت و لعل کا ہے کا۔؟''

قدیر مسکرایا۔ وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔ ہارون گیلانی ابھی تک ایک خاص کیفیت میں تھے۔ اور اس سے پہلے کہ یہ کیفیت ٹوٹ جائے، معاملات کو ان کے منطقی انجام تک پہنچانا ضروری تھا۔

قدیر نے نمبر پش کئے۔ چند ہی لمحوں میں احمد عبدالحئی سے رابطہ قائم ہو گیا۔ رسمی سلام دعا کے بعد قدیر نے کہا۔''میں آپ کو ایک بریکنگ نیوز دینا چاہتا ہوں۔''


Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !
i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.
All Done
Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

''اچھا وہ کیا ہے۔؟'' احمد عبدالحئی نے پوچھا۔''کیا علی مراد اپنی دستبرداری سے پھر گیا۔؟''

''ارے نہیں۔۔۔!'' قدیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔''ذرا آپ ان سے بات کیجئے۔!'' قدیر نے فون عبداللہ شاہ گیلانی کو تھما دیا۔

ان دونوں کی گفتگو شروع ہوگئی۔تقریباً پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد عبداللہ شاہ گیلانی نے فون خدا حافظ کہتے ہوئے قدیر کو پکڑا دیا۔

قدیر نے پوچھا۔''آپ مطمئن ہو گئے۔؟''

''یار یہ خادم حسین کیا قسمت لے کر آیا ہے۔اس کے راستے تو ایسے صاف ہو رہے ہیں کہ گویا معجزات ہو رہے ہیں۔کمال ہے بھئی۔!''

''یہ سب قادری سرکار کی دعا ہے۔۔!'' قدیر نے کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو۔اب تو مجھے بھی ان کے پاس حاضر ہونا پڑے گا۔!'' احمد عبدالحئی نے کہا۔ہمیں پہلی مرتبہ احمد عبدالحئی کے لہجے میں عقیدت کا تاثر محسوس ہوا۔

''چند ہی منٹوں کے بعد بریکنگ نیوز دیکھ لینا۔سمجھو کہ خادم حسین الیکشن جیت گیا۔!'' احمد عبدالحئی نے ہمیں اطلاع دی اور خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

عبداللہ شاہ گیلانی نے مہمان خانے میں پڑا ہوا ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا اور نیوز چینل ٹیون کرنے لگا۔نیوز چینل ٹیون ہوا تو ہم سب سکرین پر نظریں گاڑے بیٹھ گئے۔تقریباً پندرہ منٹ کے بعد بریکنگ نیوز کی مخصوص موسیقی شروع ہوگئی اور چند لمحوں کے بعد نیوز کاسٹر نے کہنا شروع کر دیا۔''ضمنی انتخاب کے حوالے سے بریکنگ نیوز سب سے پہلے ہم پیش کر رہے ہیں۔سب سے مضبوط اور با اثر امیدوار عبداللہ شاہ گیلانی نے خادم حسین کے حق میں دست برداری کا اعلان کر دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ ملک کے نوے فیصد افراد کی نمائندگی وہی لوگ کریں جو کہ نوے فیصد کا حقیقی حصہ ہیں تاکہ مسائل صحیح طور سے حل ہو سکیں۔اس طرح الیکشن کے غیر حتمی اور غیر مصدقہ نتیجے کے تحت خادم حسین عملاً الیکشن جیت چکے ہیں۔وہ بہت مضبوط امیدواروں کی دستبرداری کے باعث اس ضمنی انتخاب میں بلا مقابلہ منتخب ہو چکے ہیں۔ناظرین ہم ایک بار پھر آپ کو بتا دیں کہ خادم حسین ضمنی الیکشن۔۔۔!''

اچانک سسکیوں کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔خادم حسین ہچکیوں سے رو رہا تھا۔اور ان کے منہ سے بار بار ایک ہی لفظ نکل رہا تھا۔''بس اللہ میاں جی۔۔۔!بس اللہ میاں جی۔۔۔!''

نجانے اس کی ان سسکیوں،ان لفظوں میں کیا تھا کہ بے ساختہ ہم سب کے آنسو نکل آئے۔قدیر،خادم حسین،اور میں تینوں ملکر رونے لگے۔آنسوؤں کی برسات تھی کہ رک ہی نہیں رہی تھی۔اللہ میاں کے کرم نے ہمیں بارش کی طرح بھگو دیا تھا۔

بس اللہ میاں جی۔۔۔بس اللہ میاں جی۔۔۔!

اچانک دروازہ کھلا۔ہم نے چونک کر دیکھا۔قادری سرکار اندر داخل ہو رہے تھے۔ان کے ہونٹوں پر وہی پیار بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔جو ہمیں حوصلہ دیتی تھی۔''مبارک ہو میرے بچو۔۔!'' انہوں نے کہا۔

خادم حسین لپک کر ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔''سرکار مبارکاں آپ کو۔سرکار سب مبارکاں آپ کو۔!'' بس یہی تکرار تھی جو اس کے ہونٹوں سے نکل رہی تھی۔انہوں نے اسے گلے سے لگا لیا۔پھر باری باری ہم دونوں کو گلے سے لگا یا۔

تصوف اور محبت کی اس پُر اسرار دنیا کے حیرت ناک واقعات' اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے

اس ماہ کی ناقابل یقین کہانیاں

کنویں والی عفریت

نفیسہ سعد

ایک گاؤں کی کہانی، جہاں کنویں عفریت رہتی تھی



یہ بہت پرانی بات ہے، شاید 1975 یا اس سے بھی پہلے کا عرصہ جو مجھے صحیح طرح یاد تو نہیں' البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ ہمارا گاؤں چک 136 ٹین ڈی کے نام سے مشہور تھا۔ ٹین ڈی وہ نہر تھی جس کے کنارے یہ گاؤں آباد تھا۔ پرانا زمانہ، ریاکاری سے پاک مخلص لوگ، جن کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور خلوص سے پیش آنا غالباً دنیا کا سب سے اہم کام تھا جو سب لوگ مل کر سرانجام دیا کرتے تھے۔ گاؤں کے عین درمیان میں ایک قدیم کنواں تھا جس پر چمڑے کا ایک مشکیزہ ہمیشہ موجود رہتا، تاکہ جس کا جب دل چاہے وہ اس کنویں کے پانی سے استفادہ کر سکے۔ کنویں کے بالکل پاس ذرا سا ہٹ کر بڑ کا بہت بڑا اور پرانا درخت تھا جس کی بڑی بڑی شاخوں نے اس کنویں کو ایک ماں کی طرح اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی جو اس کنویں کا پانی عام کنوؤں کے مقابلے میں زیادہ ٹھنڈا اور فرحت بخش تھا۔ عام طور پر گرمی کی دوپہر میں گاؤں کے زیادہ تر لوگ اس بڑ کے درخت کے نیچے چارپائی بچھا کر اپنی بیٹھک جمایا کرتے تھے' پاس ہی بچے کھیلا کودا کرتے' عورتیں کنویں سے پانی بھرتیں' غرض ساری دوپہر خوب رونق میلا لگا رہتا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ہفتہ کے کسی بھی ایک دن، اس کنویں کے قریب کوئی جانور ذبح کیا جاتا کبھی بیل، کبھی بکرا اور کبھی گائے۔ یہ اہتمام گاؤں کے قصائی کی جانب سے ہوتا جس کا اعلان صبح منہ اندھیرے ہی گاؤں کی مسجد میں کر دیا جاتا، لہٰذا جسے بھی یہ گوشت خریدنا ہوتا وہ قصائی سے پہلے ہی رابطہ کر کے اپنی بکنگ کرا لیتا۔ ایسی اور بھی بہت ساری میری چھوٹی چھوٹی یادیں جو اسی گاؤں سے وابستہ تھیں، بچپن کے حسین دن جو ہم نے اس کنویں کے قریب چھپن چھپائی کھیل کر گزارے' نہ کوئی ڈر نہ خوف' ایک پرسکون سا ماحول جو ہمیں ہمیشہ اپنے حصار میں لیے رکھتا، پھر شاید ہمارے گاؤں کے پرسکون ماحول کو شاید کسی کی نظر لگ گئی۔

وہ جاتی گرمیوں کی ایک شام تھی، جب چاچا اللہ دتہ اپنے اکلوتے تانگے کے ساتھ گاؤں کے واحد لاری اڈے پر موجود تھا۔ آخری بس آج خلاف توقع کچھ لیٹ ہوگئی تھی ورنہ عام طور پر آٹھ بجے کے بعد وہ اڈا تقریباً پورا ویران ہو جاتا مگر آج چونکہ ابھی تک بس بھی نہیں آئی تھی لہٰذا چاچا بھی وہاں واحد چائے کے کھوکے پر موجود تھا۔ اور پھر ساڑھے سات والی بس آٹھ تیس پر آئی جس میں اتفاق سے چک 136 کا کوئی بھی مسافر موجود نہ تھا۔ چاچا نے جلدی سے گھوڑے کو گاؤں جانے والی کچی سڑک پر ڈال دیا تھا۔ سارا راستہ ویران پڑا تھا اور ہر طرف ایک ہو کا عالم طاری تھا۔ جو عام طور پر گاؤں میں سورج ڈھلتے ہی نظر آنے لگتا ہے۔ تیز تیز گاڑی چلاتا چاچا اللہ دتہ گاؤں کی حدود میں داخل ہوا اور پھر جیسے ہی وہ کنویں کے قریب سے گزرا، پانی کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ چاچا کو ایسا محسوس ہوا جیسے رات کے اس پل کسی نے کنویں میں زور سے مشکیزہ پھینکا ہے، وہ رک گیا، تجسس اسے کنویں کے مزید قریب لے گیا، وہ شاید دیکھنا چاہتا تھا کہ اتنی رات گئے کسے پانی کی ضرورت پیش آئی جو وہ کنویں تک آ گیا۔ گاؤں کے باسی جانتے ہیں کہ وہاں مغرب ہوتے ہی سیاہی چھا جاتی ہے، مگر کنویں کے قریب پہنچ کر چاچا حیران رہ گیا کیونکہ وہاں دور دور تک سناٹا طاری تھا، کنویں کے نزدیک و دور کوئی بندہ بشر نہ تھا لیکن سب سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ کنویں پر مشکیزہ بھی موجود نہ تھا۔ چاچا کا محسوس ہوا جیسے

کنویں کی پلی لرز رہی ہے، اس نے گھبرا کر تانگا واپس سڑک پر ڈالا اور پیچھے دیکھے بنا تیزی سے دوڑا دیا۔

صبح کی روشنی پھیلتے ہی چاچا کا رات والا خوف قدرے کم ہوگیا مگر پھر بھی اس نے یہ واقعہ چوک پر بیٹھے تمام لوگوں کو سنایا، شاید کسی نے قابل اعتنا نہ جانا مگر اس کے بعد کچھ ایسے حالات وواقعات رونما ہوئے جس نے یک دم ہی گاؤں کی فضا میں خوف کی لہر سرایت کردی۔ آہستہ آہستہ لوگ اس کنویں کے پاس جانے سے ڈرنے لگے۔ وہ بچے جو کنویں کے قریب بے فکری سے کھیلتے تھے، اب مائیں ان کی فکر کرنے لگیں کیونکہ اکثر ایسا ہوتا کوئی نہ کوئی بچہ ڈر جاتا۔ دوڑتے بھاگتے بچوں کو ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے درمیان کوئی اور بھی دوڑ رہا ہے، کبھی پیچھے رہ جانے والے بچوں کو ایک سایہ سا دکھائی دیتا اور وہ ڈر جاتے مگر وہاں شام کے وقت ہم جیسے نوجوانوں کا کھیل چھپن چھپائی جاری تھا کیونکہ ہم میں سے تقریباً سب ہی خود کو بہت بہادر سمجھتے تھے، یہی وجہ تھی جو کنویں کے حوالے سے مشہور ہونے والی اتنی کہانیوں کے باوجود ہم نے اپنا کھیل نہ چھوڑا تھا۔

جیسے ہی عصر کی نماز ہوتی ہم آٹھ دس لڑکے اکٹھے ہوکر کنویں کے قریب پہنچ جاتے اور پھر مغرب تک خوب کھیل جمتا، حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے ساتھ کوئی ایسا مافوق الفطرت واقعہ بھی پیش نہ آیا تھا جو ہمیں خوفزدہ کرسکتا، سو ہم میں سے اکثر لڑکے تو کنویں سے وابستہ کہانیوں کو من گھڑت قرار دیتے۔ ظفر ہمارے گروپ کا سب سے شرارتی اور پھنے خان ٹائپ لڑکا تھا جس نے چھپن چھپائی کے کھیل میں ایک مزید اضافہ یہ کردیا کہ جیسے ہی مغرب کا وقت ہوتا، جو کہ ہمارا کھیل ختم ہونے کا وقت بھی تھا، اسی پل ظفر کنویں کے چاروں طرف سات چکر لگاتا اور پھر زور زور سے پکارتا ”ماسی نی ماسی میں سوکھا ہی واپس جارہا ہوں۔“

جس کا مطلب یہ ہوتا کہ آج بھی اسے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ شروع شروع میں یہ کام وہ اکیلا ہی کرتا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ ہم بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئے اور ہمیں مزہ آنے لگا۔ یہ ہماری ایک بے ضرر سی شرارت تھی جس کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں تھا۔

☆......☆

جاتی گرمیوں کی شام تھی عصر اپنے وقت سے پہلے ہونے لگی تھی۔ اماں تندور سلگانے کے لیے لکڑیاں جمع کررہی تھی جب افضل مجھے بلانے آ گیا ”اوئے جلدی آ جا پھر مغرب ہوجانی ہے۔“

عصر اور مغرب کی نماز کے درمیان محض ایک گھنٹے کا فرق حائل ہوگیا تھا۔ افضل کی بات سنتے ہی میں نے جلدی سے چپل پہنی اور باہر کی جانب بھاگنے کی تیاری کی ہی تھی کہ ایک دم اماں سامنے آ گئیں۔

”کنویں کی طرف نہ جانا آج سویرے سکینہ پانی لینے گئی تو جب اس نے وہاں کسی زنانی کو دیکھا جو منڈیر پر بیٹھی رورہی تھی اس کے رونے کی آواز اتنی خوفناک تھی کہ......“

”افوہ اماں!“ میں نے ان کی بات درمیان سے ہی کاٹ دی۔ ”آپ ایک اچھی مسلمان ہونے کے ناطے کیوں ان ساری باتوں پر یقین رکھتی ہیں؟“

میرے لہجے کی حیرت سے اماں شاید کنفیوز ہوگئی۔ ”تیری بات صحیح ہے پتر پر جن بھی دنیا میں ایسے ہی موجود ہیں جیسے ہم انسان، فرق صرف اتنا

ہے کہ وہ ہمیں اس وقت تک دکھائی نہیں دیتے جب تک ہم ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کریں۔''

''میں نہیں مانتا جنات وبات سب فضول باتیں ہیں'۔ بے پروائی سے کہتا میں دروازے سے باہر نکل آیا اور پھر کنویں کے پاس چھپن چھپائی کھیلتے کب وقت گزر گیا پتہ ہی نہ چلا' مسجد کا اسپیکر شاید خراب تھا جو ہمیں اذان کی آواز بھی سنائی نہ دی جب اچانک صفدر بھائی نے دور سے ہمیں آواز لگائی تھی۔

''اوئے نالائقوں جلدی آؤ نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔'' صفدر ظفر کا بڑا بھائی تھا جس کی آواز سنتے ہی ہم سب کو احساس ہوا کہ فضا میں چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا ہے۔

''چلو بھئی جلدی نکلو یہاں سے۔ افضل سب سے آگے بھاگا جبکہ ظفر ہمیشہ کی طرح کنویں کی سمت دوڑا تھا۔

''اوئے آج دیر ہوگئی ہے آجا! کل کر لینا یہ سب۔'' ظفر کو کنویں کی طرف جاتا دیکھ کر ایک پل کے لیے افضل نے رک کر اسے پکارا، جبکہ ظفر جواب دیئے بغیر کنویں کے چاروں طرف چکر لگانے لگا تھا۔

''ماسی نی ماسی میں سوکھا ہی جا رہا ہوں۔'' میں افضل کی تقلید میں آگے بڑھ گیا، جبکہ ظفر کی تیز تیز آواز ہمارے کانوں سے ٹکرا رہی تھی، ابھی ہم تھوڑا ہی دور گئے تھے کہ ظفر کی آواز آنا اچانک بند ہوگئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا مجھے ظفر دکھائی نہ دیا۔

''افضل! افضل ظفر پیچھے نہیں ہے۔'' تیز تیز دوڑتے ہوئے میں نے افضل کو جالیا۔

''وہیں ہوگا اس نے کہاں جانا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اور ولید رک گئے جبکہ دوسرے سارے لڑکے مسجد کی جانب جا چکے تھے۔ ابھی ہم نے اتنی ہی بات کی تھی کہ ظفر کی لرزہ خیز چیخ ہمارے کانوں سے ٹکرائی جسے سنتے ہی ہمارے قدموں تلے سے نکل گئی تھی۔

''اسے کیا ہوا؟'' سب سے پہلے ولید واپسی کے لیے مڑا پھر میں اور افضل بھی اس جانب دوڑے جہاں وہ پراسرار کنواں موجود تھا ہم نے دیکھا سامنے زمین پر ظفر بالکل ساکت پڑا تھا جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ ہو۔

''یہ تو مر گیا۔'' ولید نے اسے دیکھ کر پہلا نتیجہ یہی اخذ کیا کیونکہ اس کا رنگ اس سے لٹھے کی مانند سفید پڑ چکا تھا، ایسے جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو افضل نے آگے بڑھ کر اس کے دل کی دھڑکن سنی جو آہستہ آہستہ چل رہی تھی، خدا کا کرنا کہ اسی پل چاچا اللہ دتہ اپنے تانگے سمیت وہاں آ گیا تھا۔

''اوئے لڑکوں اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہے ہو؟'' یہ کہتے ہوئے وہ ہمارے قریب آن رکا۔

''ظفر بے ہوش ہوگیا ہے چاچا!'' افضل کے کہتے ہی چاچا نے نیچے اتر کر اسے ہلایا جلایا اور پھر ہم سب کی مدد سے تانگے میں ڈال کر تیزی سے گاؤں کے واحد حکیم صاحب کے دروازے پر جا پہنچا، اسی پل ظفر کے تمام گھر والے بھی وہاں آن پہنچے تھے' بظاہر ظفر میں زندگی کوئی آثار نہ تھے' اس کی گردن پر موجود انگلیوں کے نشان ایسے تھے جیسے کسی نے اس کا گلا دبوچا ہو لیکن چونکہ ہم میں سے کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا اس لیے ہم خاموش تھے۔

''کیا ہوا ہے اسے؟'' ہر شخص کا ایک ہی سوال تھا۔

''ہم کچھ نہیں جانتے!'' ہم سب کا ایک ہی

جواب تھا اور پھر حکیم صاحب کی کوشش اور گھر والوں کی دعائیں رنگ لے آئیں، ظفر کو تین روز بعد ہوش آ گیا تھا مگر اس طرح کہ کئی دنوں تک وہ کھانا پینا اور بولنا سب بھول گیا تھا۔ اس کی اس حالت نے ہمیں اتنا خوفزدہ کیا کہ ہم میں سے کسی نے اس دن کے بعد کنویں کی طرف جانے کی جرات نہ کی تھی مگر ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ ظفر کو ایسا کیا ہوا جس سے وہ خوفزدہ ہو کر تین دن تک بے ہوش رہا، اور یہ بات سوائے ظفر کے کوئی نہ بتا سکتا تھا جس کے لیے اس کا مکمل صحت یاب ہونا ضروری تھا، اور بالآخر دو ماہ بعد ظفر اس قابل ہو گیا کہ اسکول اور مدرسے جانے لگا۔ اب ہم اس انتظار میں تھے کہ وہ کب ساری بات ہمیں بتائے اور بالآخر وہ دن بھی آ ہی گیا تھا۔

☆......☆

اس دن اسکول سے واپسی کے بعد ہمارا ارادہ نہر پر جا کر نہانے کا تھا، اور ہمارے اس پروگرام میں ابھی تک ظفر شامل نہ تھا۔ جب گھر واپسی پر میں نے اس سے پوچھا تھا ''ہمارے ساتھ نہر پر چلو گے؟''

''نہیں مجھے گھر جانا ہے۔'' وہ تھکے لہجے میں کہتا آگے کی جانب بڑھا تھا تو میں نے اسے جا کر روک لیا تھا۔

''کیا بات ہے ظفر؟ ایسا کب تک چلے گا یار۔ بھول جاؤ سب کچھ آ جاؤ واپس اپنی زندگی کی طرف۔''

''کیسے بھول جاؤں؟'' اس نے رک کر میرے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے گہری سانس لی تھی۔ ''وہ چہرہ، وہ آنکھیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔'' یہ کہتے ہوئے مارے خوف کے ظفر کو جیسے جھرجھری سی آ گئی تھی۔

''کون سا چہرہ؟''

وہ پرت در پرت کھل رہا تھا، اور میں چاہتا تھا کہ اس شام کے حوالے سے ہونے والی ہر بات وہ اگل دے۔

''اس عورت کا چہرہ، جانتے ہو اس شام جب تم لوگوں کے منع کرنے کے باوجود میں کنویں کا چکر لگا رہا تھا تو یک دم وہ عورت میرے سامنے آ گئی تھی' جس کے چہرے پر ناک سرے سے غائب تھی، اپنی لال لال سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ مجھے ایسے گھور رہی تھی جیسے کچا چبا جائے گی۔ اسے دیکھتے ہی میری آواز بند ہو گئی تھی......''میں ماسی ہوں اور آج تم سوکھے واپس نہیں جاؤ گے۔'' میرے خاموش ہوتے ہی وہ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھی تھی، میں نے بہت کوشش کی تھی کہ بھاگ جاؤں یا تم لوگوں کو آواز دے کر روک لوں، مگر جانے کیسا میرا جسم بے جان ہو گیا تھا' شاید خوف نے مجھے منجمد کر دیا تھا' میرے حلق سے آواز قطعی غائب ہو گئی تھی۔

''تم روز مجھے پکارتے تھے لو دیکھو آج میں آ گئی!'' یہ کہتے ہوئے وہ ہنسی تھی، اف اس کے دانت! بہت خوفناک تھے۔ ''مجھے جانے دو'' میں کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ پایا تھا۔ اسی پل اس نے آگے بڑھ کر میری گردن دبوچ لی تھی' اس کے ہاتھ...... مارے خوف کے یکدم جیسے ظفر نے جھرجھری لی تھی' ''اس کے ہاتھ چپچپے سے تھے، ایسے جیسے مگرمچھ یا مینڈک کی کھال ہو، اپنے گیلے ہاتھوں سے وہ میری گردن دبا رہی تھی، جب اچانک تمہاری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ تم مجھے پکار رہے تھے' تمہاری آواز سنتے ہی مجھے جیسے ہوش آ گیا تھا، وہی پل تھا جب بے اختیار میرے منہ سے آیت الکرسی کا ورد جاری ہو گیا تھا۔''

یہ کہہ کر ظفر رک گیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ رو رہا تھا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بے چینی سے سوال کیا تھا۔

پھر میرے اللہ نے میری سن لی تھی' وہ غلیظ عورت میرا گلا چھوڑ کر چھپاک سے کنویں میں کود گئی تھی۔''

''او میرے خدایا' اسی لیے جب ہم تمہارے پاس آئے تھے کنویں میں کسی کے کودنے کی آواز آئی تھی تو میں سمجھا تھا شاید مشکیزہ گرا ہے۔''

''جب میں ہوش میں آیا تو مجھے لگا تھا شاید جو کچھ ہوا تھا وہ میرا وہم تھا یا کوئی بھیانک خواب جو میں نے عالم بے ہوشی میں دیکھا ہو مگر نہیں یہ دیکھو!'' ظفر نے اپنی گردن میرے سامنے کی تھی جہاں انگلیوں کے سخت نشان اب بھی موجود تھے۔

''وہ تو شاید مجھے مار ہی دیتی' اگر میرا آخری وقت قریب آ گیا ہوتا' مگر نہیں ابھی مجھے اور زندگی جینا تھی یہی سبب تھا جو کسی نور کی طرح آیت الکرسی میرے سینے میں اتر گئی تھی اور میں اس ناپاک عورت کے ہاتھوں مرنے سے بچ گیا تھا۔

یہ کہہ کر ظفر رکا نہیں تھا اور آہستہ آہستہ آگے کی جانب چل دیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ ظہر پڑھنے مسجد جا رہا تھا' مجھے معلوم تھا ظفر اب پانچ وقت کی نماز باجماعت پڑھتا ہے' اس حادثے نے اس کا اپنے خدا پر ایمان مضبوط کر دیا تھا' یہ سوچ کر میں بھی نہر جانے کا ارادہ ملتوی کرتا ہوا سامنے دکھائی دینے والی مسجد کی جانب بڑھ گیا تھا۔

نجانے کتنا عرصہ گزر گیا مگر یہ واقعہ آج بھی جب مجھے یاد آتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔

غزل

نعیم ابرار

ہم نے خود اہتمام سے اس کو بجھا دیا
اچھا نہیں لگا تھا چمکتا ہوا دِیا

ہم نے بھی ان کے کان میں چپکے سے کہہ دیا
جلتا ہوا دِیا بھی ہے بجھتا ہوا دیا

تنہائی تو دِیے کا مقدر ہے دوستو
تنہا لڑے گا رات سے جلتا ہوا دِیا

وہ جل نہیں رہا تھا دھویں کا کمال تھا
ہم کو ملا تھا ایک سلگتا ہوا دِیا

اب تند و تیز بادِ مخالف کی خیر ہو
اچھا لگا ہے ان کو سلگتا ہوا دِیا

جب سب کو شک مجھی پہ ہوا تھا تو کیا کروں
مَیں خود ہی بن گیا کوئی بجھتا ہوا دیا

وہ بجھ رہا تھا اور کسی کو خبر نہ تھی
سب کی دعا بنا تھا جو گھر میں رکھا دعا

جلتے ہوئے دیے کو بھی بجھنا ضرور ہے
سو جل بجھا ہے شام سے اچھا ہوا دِیا

☆

اس ماہ کی ناقابل یقین کہانیاں

دوسری کہانی

مجھ کو تباہ کر دیا

میر حسن

ایک خوبصورت نوجوان کا قصّہ حیرت جس پر غیر مرئی مخلوق عاشق ہو گئی!



میرا نام میر حسن ہے، میں ضلع گھوٹکی تعلقہ ڈھرکی شاہ لطیف کالونی سنیما روڈ کا رہائشی ہوں۔ شہر یار میرا جگری دوست ہے ہم ساتھ پڑھے اور کھیل کود کر بڑے ہوئے ہیں کیونکہ ہمارا بچپن سے ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ امتحانات کے دوران ہم دونوں ایک ساتھ اسٹڈی کیا کرتے تھے۔ میں عام سی شکل وصورت کا مالک تھا جبکہ شہر یار (شیری) بے پناہ حسین تھا۔ خدا نے اسے فرصت میں بنایا تھا۔ جو بھی دیکھتا اسے دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ لڑکیاں بھی اسے دیکھ کر ششدر رہ جاتی تھیں۔ وہ تھا ہی ایسا حسین وجمیل!

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم اپنی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے۔ شیری کے والد ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے گویا ان کا گزارہ اچھی طرح ہو رہا تھا۔ اس کے والد کی اچھی تربیت کا نتیجہ تھا کہ شیری نے کبھی کوئی غلط کام نہ کیا تھا۔ ایک دن شیری میرے پاس آیا اور کہنے لگا ''یار میں جم جوائن کر رہا ہوں تم بھی میرے ساتھ ہی لگ جاؤ دونوں ساتھ آیا جایا کریں گے۔''

میں نے اس سے کہا ''یار مجھے اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لیے میری طرف سے معذرت ہے'' اس نے مجھے ہر طرح قائل کرنے کی کوشش کی مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا، اصل بات یہ تھے کہ ان دنوں میرے گھر کے مالی حالات اچھے نہ تھے، میں اسے بتانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے اسے کسی طرح ٹال دیا تھا۔

شیری باقاعدگی سے جم جانے لگا تھا جبکہ میں ٹیوشن پڑھانے میں مصروف ہوگیا تھا۔ ہم دونوں فارغ ہو کر ڈھیر سری باتیں کیا کرتے تھے۔ باقاعدگی سے جم جانے کی وجہ سے شیری میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی تھی وہ اب پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آنے لگا تھا۔

ایک روز میں نے اس سے کہا تھا ''یار شیری! تو ہر روز اپنی نظر اتار لیا کر، کہیں خدانخواستہ تجھے میری ہی نظر نہ لگ جائے۔''

شیری اس بات پر زور سے ہنستے ہوئے بولا تھا ''یار میں ان چیزوں کو نہیں مانتا۔''

''یار تو میری بات کو ہنسی میں مت اڑا، نظر لگنا برحق ہے ہر شے کو نظر لگ جایا کرتی ہے، پھر تُو تو ہے ہی اتنا حسین کہ خدا نہ کرے کسی کی نظر بد تجھ پر پڑے۔'' میں اسے سمجھاتا، مگر جب وہ میری اس بات کا نوٹس نہ لیتا تو میں بھی چپ ہو جاتا، البتہ دل ہی دل میں اسے دیکھ کر ماشاءاللہ ضرور کہہ لیا کرتا تھا۔

اکثر ایسا ہوتا ہم بازار جاتے یا کسی رستے پر جا رہے ہوتے تو لڑکیاں شہر یار کو مڑ مڑ کر دیکھا کرتیں مگر شیری کوئی رسپانس نہیں دیتا، بس اپنے کام سے کام رکھتا۔ یہ اس کے والدین کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس نے کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

جب شیری کا جم والا کورس مکمل ہوگیا تو اس نے خود اپنا ذاتی جم سینٹر کھولنے کا ارادہ کیا کیونکہ ہمارے علاقے میں کوئی جم نہیں تھا اور شیری کو بھی یہ کورس کافی دور علاقے میں جا کر کرنا پڑا تھا۔ ہمارے علاقے میں ایسے بہت سے لڑکے تھے جو یہ شوق رکھتے تھے مگر اپنی کوینس نہ ہونے کی وجہ سے بیچارے اپنے اس شوق کو دل میں لیے بیٹھے تھے۔

شیری نے جم سینٹر کے ماسٹر سے اس سلسلے میں بات کی تو انہوں نے شیری کا ہر طرح ساتھ دیا اس طرح شیری نے اپنے ماسٹر کی مدد سے علاقے میں جم سینٹر کھول لیا اور پھر رفتہ رفتہ اس کے جم سینٹر نے اتنی ترقی کی کہ دور دراز سے لڑکے آنے لگے تھے، اور پھر یہ بھی ہوا کہ دن دونی رات چوگنی ترقی

کرنے اور جم سینٹر میں مصروف رہنے کی وجہ سے شیری اب مجھ سے کم ہی مل پاتا تھا۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا شاید شیری مغرور ہوگیا ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ہر معاملے میں دل کھول کر نوازا ہے، غرور تو آنا ہی ہے، پھر اپنے خیالات کو فوراً ہی اپنے ذہن سے جھٹک دیا کرتا کہ میرا دوست شیری ایسا نہیں ہوسکتا، میں جب ان خیالات کا اظہار شیری کے سامنے کرتا تو وہ خوب ہنستا اور کہتا ''دنیا ادھر کی اُدھر ہوجائے مگر میں نہیں بدل سکتا۔''

وقت کا سفر اسی طرح جاری تھا کہ، مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ شیری کئی دنوں سے کچھ بجھا بجھا سا رہنے لگا ہے، وہ میری بات کا ٹھیک سے جواب بھی نہیں دیتا اور کسی نہ کسی کام کا بہانہ بنا کر میرے پاس سے اٹھ جایا کرتا ہے۔ اس کا یہ رویہ میرے لیے کافی تکلیف دہ رہا تھا مجھے لگتا شیری بدل گیا ہے، دن رات کی کامیابی نے اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچادیا ہے، اس کے رویے سے دل برداشتہ ہوکر میں نے بھی اس سے ملنا جلنا کم کردیا مگر اس کے باوجود میں شیری کو ہر دم یاد رکھتا تھا۔

ایک دن میری ٹیوشن کے بچوں کی چھٹی تھی۔ میں نے سوچا شیری سے ملا جائے، یہ سوچ کر میں اس کے جم سینٹر روانہ ہوگیا، جم پہنچا تو دیکھا شیری خاصا مصروف ہے، جب وہ فارغ ہوکر آیا تو ہم نے کافی دیر باتیں کیں، پھر آنے کا کہہ کر میں اپنے گھر آ گیا۔ شیری سے ملنے کے بعد میں اور زیادہ پریشان ہوگیا تھا کیونکہ شیری کا رویہ اس کے مزاج کی چغلی کھا رہا تھا، میرے بہت پوچھنے پر اس نے بہانہ بنا کر ٹال دیا تھا۔

بچوں کے پیپرز ہونے والے تھے، اس لیے میں اس میں مصروف ہوگیا اور شیری کی طرف جانا ہی نہ ہوا نہ وہ خود ملنے آیا۔ ایک دن میں بچوں کی ٹیوشن دے کر گھر پہنچا تھا کہ شیری کا چھوٹا بھائی فیضی مجھے بلانے آ گیا کہ اس کی والدہ نے بلوایا تھا۔ میں اپنی امی کو بتا کر اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔

شیری کی امی نے سلام کے جواب کے ساتھ ہی میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، میں نے شیری کے ابو کو سلام کیا تھا، تو وہ دعائیں دینے لگے پھر اس کے والدین مجھے الگ کمرے میں لے آئے، مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے دونوں بھی میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس کے ابو گویا ہوئے

''حسن بیٹا تم میرے لیے شیری جیسے ہو، میں نے کبھی تمہیں غیر نہیں سمجھا اور یقیناً تم بھی خود کو اس گھر کا فرد ہی محسوس کرتے ہوگے، میں تم سے جو کچھ پوچھوں بالکل سچ سچ بتانا، ہم شیری کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ اس کی دن بہ دن گرتی صحت اور گھر والوں سے کترانا، نجانے اسے کیا ہوگیا ہے کہ ہمیں کچھ بتاتا بھی نہیں تو نہیں ہے، تم شیری کے قریبی دوست ہو، تم بتاؤ کہ کہیں کسی لڑکی وڑکی کا تو چکر نہیں ہے، اگر ایسا ہے تو وہ کون لڑکی ہے تم تو جانتے ہوگے، یا پھر اگر کوئی دوسری بات ہے تو وہ بھی بتاؤ۔''

ان دونوں کی پریشانی دیکھ کر حقیقت میں میں خود بھی پریشان ہوگیا تھا۔

''میرا شیری پہلے تو ایسا نہیں تھا، وہ تو ہر بات مجھ سے شیر کیا کرتا تھا، پھر اب پتا نہیں کیوں اتنا بدل گیا ہے کہ ہمیں کچھ بتانا گوارا نہیں کرتا، یقین کرو بیٹا اگر کسی لڑکی کا چکر ہے تو میں اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر اسے بھی قبول کرلوں گی، اس کا بیک گراؤنڈ اور نہ ہی خاندان دیکھوں گی مگر وہ مجھے بتائے تو سہی اگر کوئی اور بات ہے تو اپنے والد سے کہے، شیری

میں تو ان کی جان ہے وہ کیسے اس کی بات کو رد کردیں گے۔'' شیری کی امی بڑے ہی دکھ بھرے لہجے میں بولی تھیں۔

''میں تو خود اس بارے میں کچھ نہیں جانتا، شیری کا رویہ تو میرے لیے بھی تکلیف دہ ہے، میں سمجھتا تھا کہ وہ دن بہ دن ترقی کرتے جم سینٹر کی وجہ سے مغرور ہوگیا ہے اس لیے وہ مجھے کسی خاطر میں نہیں لا رہا مگر گھر میں بھی اس کا یہی رویہ ہے تو یقیناً کوئی بات ضرور ہے، شیری اس وقت کہاں ہے؟''

میرے اس سوال کے جواب میں شیری کی امی نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے، میں ان سے اجازت لے کر شیری کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

جب میں شیری کے کمرے میں آیا تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ بیڈ پر خاموش لیٹا چھت کو گھور رہا تھا، میں نے اسے سلام کیا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا، میں اس کے قریب گیا اور اس سے پوچھا یار کیا حال بنا رکھا ہے؟

اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا، اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا مگر اس میں اتنی نقاہت آچکی تھی کہ اس سے اٹھا بھی نہ گیا، میں اس کی یہ حالت دیکھ کر آبدیدہ ہوگیا، یہ وہ شیری تو نہ تھا جس کی خوبصورتی پر لوگ فدا تھے، اب وہ ایک عجیب سی بے بسی اور لاچاری کی تصویر بنا ہوا تھا، اس کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی اور میں گھر واپس آ گیا۔

اس کے بعد دو تین دن بہت مصروف گزرے، میں شیری سے پھر ملنا چاہتا تھا مگر ٹائم نہیں مل رہا تھا۔ اس روز چھٹی کا دن تھا، میں گھر پر ٹی وی کے آگے بیٹھا تھا کہ اتنے میں شیری کا چھوٹا بھائی مجھ سے ملنے آ گیا اور کہنے لگا ''حسن بھائی آپ کو امی نے بلایا ہے۔ اگر آپ فارغ ہیں تو ابھی چلیں یا مجھے بتادیں کہ آپ کب آئیں گے؟''

میں اس وقت فارغ تھا اس لیے فیضی کے ساتھ جانے سے پہلے اپنی امی کو بتا کر شیری کے گھر آ گیا۔ اس کی والدہ کو سلام کیا تو وہ مجھے اندر لے گئیں پھر شیری کی موجودہ حالت کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا

''بیٹا نہ جانے میرے شیری کو کس کی نظر لگ گئی ہے، اب تو وہ بالکل بستر کا ہو کر رہ گیا ہے۔ ڈاکٹروں کو دکھایا تو ہے مگر اس کا مرض کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا، ہم اس سے پوچھتے ہیں تو وہ ہمیں کچھ بتاتا نہیں ہے، بیٹا تم ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھو'' شیری کی والدہ ملتجی لہجے میں بولی تھیں۔

''آنٹی آپ فکر نہ کریں بس اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھیں، یہ کہہ کر میں شیری کے کمرے میں آیا تھا، اسے دیکھ کر مجھے ایک دھچکا سا لگا تھا۔ شیری کی بہت بری حالت تھی، مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ رونے لگا تھا۔ اس کے رونے سے میں بھی پریشان ہوگیا، میں فوراً اس کے قریب پہنچا۔

''حوصلہ کرو، اور مجھے بتاؤ یار کہ آخر یہ سب کیا ہے؟''

''یار میں تو خود ایسی زندگی سے بیزار ہو چکا ہوں، بجائے اس کے والدین کا سہارا بنوں الٹا ان پر بوجھ بن گیا ہوں، میرا ہر کام اب بیڈ پر ہوتا ہے، میں تو بس یہی دعا مانگتا ہوں کہ جلد از جلد مجھے موت آجائے تاکہ اس اذیت بھری زندگی سے نجات ملے۔''

''مایوسی کی باتیں مت کر، تو تو میرا ہمت والا دوست ہے، تیرے منہ سے مایوسی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔'' یہ کہتے ہوئے میری آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔

'' تو ہی بتا میں کیا کروں؟'' شیری نے پوچھا۔

''تو وہ کر جو میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ یار تو بتا تا کیوں نہیں ہے تیرے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ تیری خاموشی، الجھا الجھا انداز کچھ تو ہے جو تو ہم سے چھپا رہا ہے۔ دل کی بات کہہ لینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، ہوسکتا ہے مجھ سے شیئر کر لینے میں ہی تیری بھلائی ہو۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے بہت محبت سے اس کا کاندھا تھپتھپایا تھا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد شیری بہت دھیمے لہجے میں بولا تھا۔ ''یار وعدہ کر تو کسی کو بتائے گا نہیں، تب ہی میں تجھے وہ کچھ بتاؤں گا جو میں نے اب تک کسی کو نہیں بتایا ہے۔''

''وعدے کو چھوڑ یا تجھے اپنے دوست پر اعتبار نہیں ہے؟''

''یار اعتبار تو ہے مگر بات ہے ہی ایسی کہ میں بتانے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ میں نہیں چاہتا کہ سب کچھ جان لینے کے بعد کوئی میرے بارے میں غلط رائے قائم کرے جبکہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔''

''یار اب تو بتا بھی دے، پہیلیاں کیوں بھجوا رہا ہے؟'' آخر میں نے جھلا کر کہا۔

شیری کچھ دیر چھت کو تکتا رہا، پھر گویا ہوا ''تم جانتے ہو کہ میرے جم کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ میرے جم سینٹر میں ہر وقت لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے، تو ایک دن میں جم میں لڑکوں کو ایکسر سائز کروا رہا تھا کہ میرے جم سینٹر میں دو دراز قد عورتیں داخل ہوئیں، انہوں نے اپنے چہرے نقاب میں ڈھانپے ہوئے تھے، وہ چلتے ہوئے سیدھی میرے پاس آکر رکیں، ان میں سے ایک عورت نے مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ''کیسے ہو شیری؟''

میں اس کے منہ سے اپنا نام سن کر حیران رہ گیا کیونکہ وہ عورتیں ہرگز میرے خاندان یا محلے کی نہیں تھیں اور نہ ہی میں نے کبھی انہیں دیکھا تھا، پھر وہ مجھے کیسے جانتی تھیں، میں حیرت کی تصویر بنا انہیں تکے جا رہا تھا۔ آخر ہمت کر کے میں نے ان سے پوچھا آپ کون ہیں، میں آپ کو نہیں جانتا، اور اگر آپ کو مجھ سے کوئی کام تھا تو آپ کو میرے گھر آنا چاہیے تھا، یہ جگہ عورتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔''

ان میں سے ایک عورت بولی ''چھوڑو جان پہچان کو ہم تمہیں جانتے ہیں، بس یہی کافی ہے اور ہاں آج رات ہم تمہارے گھر آئیں گے، تیار رہنا۔'' یہ کہہ کر وہ دونوں عورتیں واپس چلی گئی تھیں۔ میں ان کو جاتا دیکھتا رہا اور سوچتا رہا یہ کون عورتیں تھیں اور مجھے کیسے جانتی ہیں۔ اور مجھ سے انہیں کیا کام ہوسکتا ہے؟ کافی دیر تک سوچنے کے بعد میں نے ان کا خیال ذہن سے یہ سوچ کر جھٹک دیا تھا کہ گھر آئیں گی تو ان سے تفصیل پوچھوں گا۔ جم سے گھر آ گیا تو ان دونوں عورتوں کا خیال ذہن سے نکل چکا تھا، میرا روز کا معمول تھا کہ کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں چہل قدمی اور ٹی وی دیکھا کرتا تھا، جم سے آنے کے بعد مجھے کافی تھکن ہو جایا کرتی تھی، اس لیے جلد ہی سو جایا کرتا تھا، اس رات بھی میں گہری نیند سو رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ نہ جانے احساس سے کھل گئی۔ میں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو دیکھا وہ دونوں عورتیں میرے دائیں بائیں کھڑی تھیں، اس وقت ان کے چہرے نقاب سے آزاد تھے، ان کے چہرے کے خد و خال عجیب ڈراؤنے سے تھے جنہیں دیکھ کر مجھے خوف سا محسوس ہو رہا تھا، خوف کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دروازہ اندر سے بند تھا، پھر یہ کمرے میں کیسے داخل ہو گئیں، جس

کا اظہار میں نے ان سے بھی کر دیا تو ایک عورت بولی "ہم کہیں بھی آ جا سکتے ہیں اس کے لیے ہمیں کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے اور تم سے ملنے کے لیے دیکھو ہم کہاں سے آئے ہیں، آؤ اب دیر مت کرو۔" یہ کہہ کر وہ عورت میری طرف بڑھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، اس نے وہ حرکات کرنا شروع کر دیں جس کا بتاتے ہوئے بھی مجھے شرم آ رہی ہے۔ اس عورت کے بعد دوسری عورت نے بھی میرے ساتھ گھٹیا قسم کی حرکتیں کیں، اور کافی دیر تک شیطانی کھیل کھیلنے کے بعد وہ دونوں عورتیں یہ کہہ کر غائب ہو گئیں کہ "کل ہم پھر آئیں گے تیار رہنا۔" یہ کہہ کر دونوں میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے اپنے اعصاب پر کنٹرول نہ تھا، میرا پورا جسم بری طرح لرز اور دکھ رہا تھا، کچھ دیر بعد فجر کی اذانوں کی آواز سن کر میں ہمت کر کے اٹھا۔ وضو کر کے نماز ادا کی، اللہ سے اپنے ناکردہ گناہ کی معافی مانگی، نماز ادا کر کے میں بستر پر لیٹ گیا۔ میری آنکھ ایسی لگی کہ دن چڑھے تک سوتا رہا، امی کے جگانے پر میری آنکھ کھلی۔ میں جلدی سے اٹھا۔ فریش ہو کر ناشتہ کیا، اب میں کافی بہتر محسوس کر رہا تھا، دن گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ رات کو میں جب اپنے کمرے میں آنے لگا تو کل کا منظر میری نظروں میں گھوم گیا جسے یاد کر کے مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی، پھر میں نے اپنے دل کو خود ہی تسلی دی کہ پریشان ہونے کے بجائے مجھے ان کو ان کے ارادوں سے باز رکھنا ہے، اس کے لیے مجھے ہمت سے کام لینا ہوگا، یہ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ رات کو نجانے کون سے پہر وہ دونوں عورتیں پھر نمودار ہوئیں اور سوئی ہوئی حالت میں ہی انہوں نے میرے ساتھ نازیبا حرکتیں کرنا شروع کر دیں جس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی اور میں ان کی گرفت میں بری طرح مچل رہا تھا مگر وہ نجانے کیسی فولادی قسم کی عورتیں تھیں کہ باوجود مرد ہونے کے میں ان پر قابو نہیں پا سکا تھا، پھر اچانک وہ میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ میرا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ میں تو ایسا شہ زور تھا کہ ایک عام مرد مجھ سے الجھنے کی غلطی نہ کرتا، پھر میں ان عورتوں سے کیوں پسپا ہو گیا تھا او رپھر اکثر ایسا ہونے لگا، وہ دونوں عورتیں بے دھڑک میرے کمرے میں آتیں، رات بھر گھناؤنا کھیل کھیل کر غائب ہو جاتیں۔ میں چاہ کر بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں پاتا تھا، وہ انتہائی طاقت ور عورتیں تھیں۔ جبکہ میری تمام قوتیں نہ جانے کہاں چلی جاتی تھیں کہ میں ان کے آگے بے بس ہو کر رہ جاتا تھا، یہ بات ایسی تھی کہ مارے شرم کے میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے چپ سادھ لی تھی کہ کون یقین کرتا میری ان سب باتوں پر الٹا مزاق ہی اڑایا جاتا، اس لیے مجھے چپ رہنا ہی بہتر لگا، یہ جو تم مجھے بیزار پڑا دیکھ رہا ہے، یہ ان بدبخت عورتوں کی کرنی کا نتیجہ ہے پہلے تو میں لڑکھڑا کر چل لیا کرتا تھا، اب تو مجھ سے چلنا تو دور کی بات ہے، بستر سے اٹھا بھی نہیں جاتا ہے، میرا ہر کام والدین ہی کیا کرتے ہیں۔ کتنے شرم اور افسوس کا مقام ہے کہ مجھے اپنے والدین کا سہارا بننا چاہیے الٹا میں ان پر بوجھ بن کر رہ گیا ہوں دعا کرتا ہوں کہ ایسی زندگی سے تو موت ہی آ جائے۔" یہ کہہ کر شیری بری طرح رونے لگا تھا۔

شیری کو روتا دیکھ کر میرا دل دکھ کی شدت سے کٹنے لگا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا "یار مایوسی کی باتیں نہیں کیا کرتے۔

اللہ سائیں سے خیر کی دعا کرو، وہ سب ٹھیک کر دے گا۔ میں بھی پوری کوشش کروں گا تمہیں اس مصیبت سے نجات دلانے کی، بہت دیر ہو چکی ہے اب میں چلتا ہوں تم فکر مت کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر میں اس کے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں پکا ارادہ کر چکا تھا کہ شیری کو ہر قیمت پر ان خبیث بدروح عورتوں کے چنگل سے نکالوں گا۔

شیری نے کمرے نکلنے سے پہلے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے التجا کی تھی کہ "ان باتوں کا ذکر کسی اور سے نہ کرنا تم دوست ہو اس لیے تمہیں شریک راز کیا ہے، مگر میں کسی اور کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی سے کیسے نظریں ملا پاؤں گا۔"

"میں نے سوچ لیا تھا کہ شیری لاکھ منع کرے میں یہ بات اس کے والد کو ضرور بتاؤں گا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، جس کو نظر انداز کیا جائے، میں شیری کے والد کے پاس پہنچا اور پوری بات انہیں بتا دی، پھر ان سے کہا "انکل آپ دیر نہ کریں۔ شیری کو کسے اچھے عامل کو دکھائیں کہیں خدانخواستہ شیری کو کوئی نقصان ہی اٹھانا نہ پڑ جائے۔"

ان تمام باتوں کو سن کر وہ بولے تھے "اگر شیری مجھ پر اعتماد کر کے یہ تمام باتیں مجھے پہلے بتا دیتا تو بات اتنی آگے نہ بڑھتی۔"

"انکل وہ تو اب بھی اس بات کو راز رکھنا چاہتا ہے مگر میں اسے ایسی بے وقوفی ہر گز نہیں کرنے دوں گا' حالانکہ اس تمام قصے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے مگر وہ شرمندگی سے نظریں نہیں ملا پا رہا ہے۔"

"بیٹا میں اپنے بیٹے کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں وہ کبھی کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ مجھے سب کچھ پہلے بتا دیتا تو میں بات آگے بڑھنے ہی نہ دیتا۔ بہر حال میں آج ہی سید شاہ صاحب سے ملتا ہوں اس سلسلے میں وہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔"

"انکل میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

میری بات سن کر انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

سید شاہ صاحب ہمارے علاقے کے مشہور دم درود کے ماہر جانے جاتے ہیں، ان کے پاس دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ ان کی دعا میں بڑا اثر ہے۔ وہ عشاء کے بعد بیٹھتے ہیں اور لوگوں کے مسئلے حل کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ عشا کی نماز پڑھ کر میں شیری کے گھر آ گیا پھر اس کے والد کے ہمراہ سید شاہ صاحب کی طرف روانگی ہوئی۔

کچھ دیر کے انتظار کے بعد ہماری باری آ گئی۔ شیری کے والد نے شیری کے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات سید شاہ صاحب کو بتائے، جسے سن کر سید شاہ صاحب سوچ میں پڑ گئے پھر کچھ دیر بعد بولے۔

"مسئلہ بہت گھمبیر معلوم ہوتا ہے، آپ کل بچے کو لے کر آئیں اسے دیکھنے کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

دوسرے دن ہم شیری کو لے کر سید شاہ صاحب کے پاس پہنچے، شیری کو لے ہم وہاں کس طرح پہنچے تھے یہ ایک الگ داستان ہے۔ شیری کو دیکھنے کے بعد شاہ صاحب نے کہا تھا "اس بچے پر جن زادیاں عاشق ہو گئی ہیں اور وہ بھی شیطان کی پیروکار جن زادیاں، ان سے بچنا مشکل ہے تاہم ناممکن نہیں' ان سے نمٹنا ایک مشکل عمل ہے اور وقت طلب بھی، میں انتہائی معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں میں یہ کام نہیں کر سکتا میں آپ کو ایک جگہ کا پتا دے رہا ہوں، آپ اسے لے کر سانگا روڈ (گولا گوٹھ) پیر غواری شاہ بخاری کی درگاہ پر موجود شاہ جی کے پاس جائیں، انشاء اللہ آپ کے بچے کو ان خبیث جن زادیوں سے نجات مل جائے گی، البتہ

میں یہ دم کیا ہوا پانی دے رہا ہوں اسے مسلسل پلائیں ساتھ ہی یہ عمل بھی کرتے جائیں، انہوں نے ایک عمل بھی کرنے کے لیے دیا تھا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ "کسی بھی صورت میں دیر نہ کریں اور نہ ہی عمل روکیں ورنہ وہ جن زادیاں اسے نقصان پہنچا سکتی ہیں، اس عمل کی وجہ سے وہ اس کے پاس تو نہ آسکیں گی مگر آپ اسے لے کر کل ہی روانہ ہو جائیں۔"

سید شاہ صاحب کے دیے ہوئے پانی اور عمل کی وجہ سے شیری کی حالت کچھ بہتر ہوئی تھی، دوسرے دن ہم سانکا روڈ پیر غواری شاہ بخاری کی درگاہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ ڈہرکی سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جب ہم اس گاؤں میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ مرد عورتیں اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے، حیرت کی بات یہ تھی کہ ان سب کے قد عام انسانوں سے زیادہ تھے جبکہ وہ سب کے سب سانولے تھے اور سب کی شکلیں ایک جیسی تھیں، ان کے چہرے پر آنکھیں اور ناک نمایاں تھیں، ناک اتنی بڑی تھی کہ کوئی بھی اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ سکتا تھا، یہ کیسی بستی تھی، جہاں حیرت ہی حیرت تھی۔

گاؤں چھوٹا سا تھا، اس لیے درگاہ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہ آئی، ہم درگاہ کے اندر داخل ہوئے تو سامنے دریاں بچھی ہوئی تھیں، ہم ان دریوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہاں آ کر شیری بہت مضطرب دکھائی دے رہا تھا، وہ بری طرح بے چین ہو رہا تھا۔ اگر ہم لوگ اس کا ہاتھ نہ تھامے ہوتے تو شاید وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جاتا۔ ہمارے وہاں بیٹھنے کے کچھ دیر بعد درگاہ میں ایک مرد داخل ہوا، اس نے ہمیں سلام کیا اور کہا کہ آپ لوگ آرام سے بیٹھیں، شاہ جی ابھی تشریف لاتے ہیں، یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا تھا، اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد وہاں ایک عورت ہاتھ میں ایک بڑی بالٹی اور پیالہ لیے حاضر ہوئی، اس بالٹی میں پانی تھا، اس نے وہ پانی پیالے میں انڈیلا اور پھر باری باری ہم سب کو پینے کے لیے دیا، ہم سب نے وہ پانی خاموشی سے پی لیا، ہمارے پانی پینے کے بعد وہ عورت بالٹی اور پیالہ واپس لے گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک باریش اور رعب دار شخصیت اندر داخل ہوئی، انہیں دیکھ کر ہی ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یقیناً شاہ جی ہیں۔ ہم نے انہیں باادب سلام کیا، جس کا انہوں نے جواب دیا۔ پھر انہوں نے ہم سے آنے کا مقصد پوچھا تھا۔

شیری کے والد نے مختصراً تمام قصہ کہہ سنایا تھا۔ تمام باتیں سننے کے بعد انہوں نے شیری کے والد سے کہا تھا

"سب سے پہلے تو اس لڑکے کے گلے اور بازوؤں سے بندھے تمام تعویذ نکال کر اس ڈبے میں ڈال دیں۔" انہوں نے ایک کونے میں رکھے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ان کے کہنے پر شیری کے گلے، بازو کے تمام تعویذ نکال کر کونے میں رکھے ڈبے میں ڈال دیے گئے جس سے شیری کی بے چینی میں فرق آیا تھا، پھر شاہ جی نے شیری پر دم کیا تھا۔ ان کے دم کرنے سے شیری بالکل پرسکون ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ عورت جو کچھ دیر پہلے ہم سب کو پانی پلا کر گئی تھی، پھر آئی اب کی بار اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی، اس نے پہلے دستر خوان بچھایا پھر اس پر کھانا چن دیا اور واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد، شاہ جی نے ہمیں کھانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ لوگ ہمارے مہمان ہیں اور ہمارے یہاں مہمان نوازی کا رواج ہے، دیر نہ کریں آ جائیں۔"

ہم کھانے کے لیے دستر خوان کے قریب آ گئے، کھانے سے فارغ ہوئے تو شاہ صاحب نے ایک دم کی ہوئی پانی کی بوتل دیتے ہوئے کہا تھا ''اس پانی کو بلاناغہ اس بچے کو پلانا ہے، اگر پانی ختم ہونے لگے تو اس میں دوسرا پانی ڈال لیں، اس طرح اگلے منگل تک اس پانی کو پلانا ہے، منگل کو جب آئیں تو اس بوتل کو اپنے ہمراہ لانا نہ بھولیں۔''

ہم نے شاہ جی کا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے درگاہ سے باہر آ گئے، اور گاڑی میں سوار ہو کر گھر کا راستہ لیا تھا۔

اگلے منگل کو ہم پھر غواری شاہ صاحب کی درگاہ پر پہنچے تھے' گزشتہ منگل سے اب تک شیری کی حالت میں نمایاں فرق آیا تھا، اب وہ بیڈ پر سے خود بیٹھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس بار بھی جب ہم درگاہ پر پہنچے تو حسب روایت پہلے پانی کی بالٹی اور پیالہ لائی پھر اس نے دستر خوان لگایا اور وہاں سے چلی گئی۔ شاہ جی نے ہمیں کھانا تناول کرنے کو کہا ہم سے کسی میں یہ جرات نہ تھی کہ انکار کرتے لہٰذا سب نے نہایت خاموشی سے کھانا کھایا، کھانے سے فارغ ہوئے تو ہی عورت آئی اور دستر خوان سمیٹ کر چلی گئی۔

شاہ جی نے شیری پر دم کیا، اور اسی بوتل میں دوسرا پانی دم کر کے دیا پھر گویا ہوئے

''سات منگل تک آنا ہے انشاء اللہ تعالیٰ آپ کا بیٹا اللہ کے فضل سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اس بار کی طرح اس پانی کو بلاناغہ اس لڑکے کو پلانا ہے، پانی ختم ہو جائے تو اس میں دوسرا پانی ڈال لیا جائے۔'' اس کے بعد ہم نے ان سے مصافحہ کیا اور اجازت لے کر گاڑی کے ذریعہ گھر آ گئے

علاج کے دوران ایک بار بھی وہ خبیث عورتیں پھر شیری کے پاس نہ آ سکیں تھیں جس کی وجہ سے شیری تیزی سے بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ اور ایک وقت یہ آیا کہ شیری اپنے پیروں پر کھڑا ہونے لگا تھا، اور یہ سب اللہ کے کرم اور شاہ جی کی وجہ سے ہوا تھا۔

ہم باقاعدگی سے ہر منگل کو گولا گوٹھ جاتے ہر بار وہی عورت سب سے پہلے پانی لاتی اور پھر کچھ دیر بعد کھانا دستر خوان پر لگا کر چلی جاتی، اتنے دنوں سے ہم وہاں جا رہے تھے مگر اس دوران میں اس عورت نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کسی سے مخاطب ہوئی تھی بس خاموشی سے آتی اپنا کام کرتی اور چلی جاتی تھی۔ اسی طرح وہاں موجود دوسرے لوگ بھی اپنے کام سے کام رکھتے تھے، وہ اپنے اپنے کاموں میں اتنے محو ہوتے کہ انہیں ہمارے آنے جانے سے کوئی سروکار نہ تھا کتنی عجیب بات تھی اس بستی کے رہنے والے سب ہم شکل تھے، سب ہی سانولے تھے۔ سب کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے چہرے پر بڑی سی ناک تھی جو کہ چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں تھی اس کے علاوہ شاید وہ سب قوت گویائی سے بھی محروم تھے یا شاید ہمیں ایسا لگا تھا۔

بہر حال ہمیں ان سے کیا لینا تھا ہمارے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ہمارے کام آ رہے تھے۔

بالآخر ساتواں منگل بھی آ پہنچا۔ اس دوران شیری بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ ہم شیری کو لے کر درگاہ پہنچے۔ حسب معمول پہلے ہماری پانی پھر کھانے سے تواضع کی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد شاہ جی کی آمد ہوئی انہوں نے شیری پر دم کیا پھر دم کی ہوئی پانی کی بوتل دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا بیٹا اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک ہو گیا ہے، اب وہ دونوں خبیث عورتیں کبھی اسے تنگ نہیں کریں گی، لیکن اب آپ کو ایک کام کرنا ہو گا یہ لڑکا جو جم سینٹر چلاتا ہے اس سے دستبردار ہونا پڑے گا، آپ لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوالات اٹھیں

گے کہ شیری کی طبیعت کا اس جم سینٹر سے کیا تعلق تو مختصراً آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ اس جم سینٹر سے پہلے یہاں جو گھر تھا وہ غیر مرئی مخلوق کے قبضے میں تھا، حالانکہ آپ لوگوں نے اجازت سے اس جگہ جم سینٹر کی تعمیر کرائی تھی مگر کچھ غیر مرئی مخلوق اس جگہ سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھیں، اس لیے نتیجہ آپ لوگوں کے سامنے ہے، بہرحال جو ہوا اس قصے کو چھوڑیں اللہ کا شکر ادا کریں کہ آپ کا بیٹا ان خبیثوں کے چنگل سے آزاد ہو چکا ہے اور آئندہ وہ کبھی پھر اس کو ستانے کی جرات نہ کریں گی لیکن اب اس لڑکے کو جم سینٹر کو چھوڑنا ہوگا اور کبھی بھول کر بھی اس کی طرف رخ نہیں کرنا ہوگا یہی اس کے حق میں بہتر ہوگا۔''

ہم نے ان سے اجازت چاہی تو وہ کہنے لگے ''آپ کے بیٹے کو مزید علاج کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے بلا ضرورت یہاں مت آنا، کوئی بہت ضروری کام ہو تب آیا جا سکتا ہے، ورنہ یہاں کا دوبارہ رخ نہ کرنا۔''

ان کی شخصیت کا رعب ایسا تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی کیوں کا سوال نہ کر سکا اور اثبات میں سر ہلا کر وہاں سے گھر آ گئے۔

آج شیری بالکل ٹھیک ہے اس نے اپنے تمام پرانے شوق چھوڑ دیے ہیں، اس کی صحت اب پہلے جیسی نہیں رہی نہ ہی وہ پہلے جیسا حسین رہا ہے کوئی بھی اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کبھی اتنا خوبصورت رہا ہوگا کہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہوگا۔

دوسری طرف شیری اپنے ماضی کو دہرانا بھی نہیں چاہتا جبکہ مجھے اس کا ماضی بھی یاد ہے اور وہ عجیب و غریب گاؤں بھی چاہنے کے باوجود ہم میں سے کسی نے بھی دوبارہ اس کا رخ نہیں کیا آپ لوگ یقین کریں نہ کریں یہ بالکل سچ ہے!! ☆

غزل

غالب عرفان

گزر رہا ہے جو اس امتحان کی قیمت
ہوا چکائے گی اب میری جان کی قیمت

تمہارے نام کی تختی ہے اَدھ مٹی لیکن
بڑھا رہی ہے شکستہ مکان کی قیمت

میں لکھ رہا ہوں خود اپنی حیات کاغذ پر
مگر پتہ ہے لہو داستان کی قیمت

خلا کی سیر سے لوٹا تو یہ ہُوا معلوم
میری زمیں ہے ترے آسمان کی قیمت

چڑھی تو سڑکوں پر انسان قتل ہوتا گیا
زباں سے نکلے ہوئے اِک بیان کی قیمت

سفر شناس ہے ملّاح کی نظر لیکن
ہَوا سے پوچھو کسی بادبان کی قیمت

خیال و خواب سے آگے حصارِ عرفاں میں
لگا رہا ہے کوئی میری آن کی قیمت

اس ماہ کی ناقابل یقین کہانیاں

تیسری کہانی

تم میری ہو

نسرین اختر نینا

ایک جن زادے اور گاؤں کی دوشیزہ کے پیار کی پراسرار داستان



''سلام چاچی!''

''وعلیکم سلام زہرہ دھیے کیسی ہو؟ بڑے دنوں بعد آئی ہو؟''

''وہ دراصل اماں کو ملیریا ہوگیا تھا بڑی پریشانی رہی، جب حکیم جی کے علاج سے فرق نہیں پڑا تو پھر میں اور ابا اماں کو شہر لے گئے تھے، وہاں تین دن تک اماں اسپتال میں داخل رہی، ڈاکٹروں نے اتنی توجہ سے علاج کیا کہ اماں بالکل ٹھیک ہوگئی۔''
زہرہ نے جواب دیا۔

''اچھا میں نے تو سنا ہے شہر کے اسپتالوں کے ڈاکٹر بیمار بندے کو پوچھتے ہی نہیں، بلکہ وہاں تو داخلہ بھی بڑی مشکل سے ملتا ہے۔''
چاچی نے حیران ہوکر کہا

''ہاں بات تو کچھ ایسی ہی ہے مگر چاچی وہ تمہارا ہونے والا جوائی ہے ناں غفورا، وہ اسپتال میں چپڑاسی لگا ہوا ہے، ڈاکٹر اس کی بڑی بات مانتے ہیں۔'' زہرہ نے شرماتے ہوئے اپنے منگیتر کا ذکر کیا

''اچھا اچھا خیر سے پتر غفور شہر کے اسپتال میں کام کرتا ہے۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے یہ سب دھیے تیری قسمت کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ تو تم سے منگنی ہونے سے پہلے تو یونہی آوارہ گردی کرتا پھرتا تھا۔ ماں باپ بچارے پریشان تھے کہ آٹھ جماعتیں پڑھانے کے باوجود ایک ہی پتر اور وہ بھی نکما ہے، کوئی رشتہ بھی نہیں دیتا تھا اسے، میری نوری کے لیے کئی بار اس کی ماں نے بات کی تھی لیکن توبہ کرو، نوری کے ابا نے صاف انکار کردیا تھا چن ورگی دھی ایک لوفر کے پلے باندھ کر اس کی حیاتی برباد کرنی تھی کیا؟ مگر تیرے ماں باپ نے کچھ نہ دیکھا اور خدا توکل بیٹی کا رشتہ کردیا، سوہنے رب نے تیری ماں کی دن رات کی دعاؤں کا ایسا اجر دیا ہے، تیرے تو بھاگ کھل گئے دھیے اللہ مبارک کرے۔'' چاچی نے حسد اور رشک کے ملے جلے احساسات کے ساتھ زہرہ کے منگیتر کے ماضی کو کھنگالتے ہوئے لمبی چوڑی تقریر کرڈالی۔

''چاچی نوری نظر نہیں آرہی کہاں ہے؟ زہرہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا

''اندر کمرے میں لیٹی ہوئی ہے۔''

''کیوں طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی؟''
زہرہ نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''ہاں بس کہہ رہی تھی کہ سر میں درد ہورہا ہے، میں نے کہا ایک گرم گرم دودھ کا گلاس پی کر کچھ دیر آرام کرلو ٹھیک ہوجاؤ گی'' چاچی نے کسی ماہر ڈاکٹر کے انداز میں کہا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نوری آج کپاس چننے کھیتوں میں نہیں جائے گی؟''

''نہیں ضرور جائے گی۔ جاؤ جا کر اسے کہو کہ وہ تمہارے ساتھ کپاس چننے کے لیے چلے۔'' یہ کہہ کر چاچی گھڑونچی کے اوپر پڑے میلے سے مٹی کے مٹکے سے مٹی کے پیالے میں پانی ڈال کر پینے لگی۔ اور زہرہ صحن کے دائیں طرف بنے ایک کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد زہرہ اور نوری دیگر آٹھ دس اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ لیتی اور باتیں کرتی کھیتوں کی طرف جارہی تھیں، ان سب لڑکیوں کی عمریں پندرہ سے سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھیں۔ ان میں نوری سب سے زیادہ نمایاں تھی اس کا لمبا قد، خوبصورت نین نقش گندم کے پکے ہوئے سنہری خوشوں جیسا رنگ تھا، جس میں ہلکی ہلکی سرخی کی جھلک تھی۔ معمولی سے بدرنگ کپڑوں میں بھی اس کا سراپا بے حد دلکش لگ رہا تھا۔ زہرہ نوری کے مقابلے میں بوٹے قد کی معمولی شکل وصورت کی مالک تھی مگر بے حد ملنسار بااخلاق تھی۔ دونوں

سہیلیاں ایک جان دو قالب تھیں دیگر لڑکیاں ان کی اس بے مثال دوستی پر رشک کرتی تھیں۔ نوری نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ مزاج کی بھی بے حد اچھی لڑکی تھی، اسی لیے زہرہ جیسی ہنس مکھ لڑکی کے ساتھ اس کی دوستی نبھ رہی تھی۔ دونوں بچپن سے ایک ساتھ کھیل کود کر بڑی ہوئی تھیں، جوانی کی حدود میں داخل ہونے کے بعد بچپن کی یہ دوستی نہایت مضبوط ہو چکی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے بغیر چین نہ آتا تھا، اگرچہ گاؤں کی دیگر لڑکیوں کے ساتھ بھی ان کی اچھی خاصی دوستی تھی مگر دونوں کی باہمی دوستی زیادہ پرخلوص و گہری تھی۔

جب سے زہرہ کی منگنی طے ہوئی تھی۔ نوری بڑی پریشان تھی کہ اس کی پیاری سہیلی اسے چھوڑ کر شہر چلی جائے گی تو وہ اکیلی رہ جائے گی۔ اس پہ زہرہ ہنس کر کہتی۔

”تو فکر نہ کر نوری میں تجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ غفورے کا چچازاد بھی اس کے ساتھ ہسپتال میں کام کرتا ہے۔ میں اس کا رشتہ تیرے ساتھ کروا دوں گی۔ اس طرح ہم دونوں شہر میں بھی اکٹھے ایک ہی گھر میں رہیں گی۔“ غفوراً کہتا ہے کہ اس نے اور اس کے چچازاد دینو نے مل کر ایک چھوٹا سا دو کمروں کا کوارٹر اسپتال کے احاطے کے اندر ہی لے رکھا ہے جو ہم دونوں کے لیے کافی ہوگا، ایک کمرے میں تم اور رحمت رہنا ایک میں میں اور غفورا رہیں گے، ہاں کھانا پینا ہم اکٹھا رکھیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟“ زہرہ مستقبل کے حسین سپنوں میں کھوئی کوئی نوری سے کہتی تو نوری اس تصور سے ہی خوش ہو جاتی کہ وہ اپنے بچپن کی ہم جولی کے ساتھ ہمیشہ ایک گھر میں رہے گی۔ اس وقت بھی وہ دونوں ایسی ہی باتیں کرتی ہوئی دوسری لڑکیوں سے خاصی پیچھے چل رہی تھیں۔ باتوں کے دوران اچانک زہرہ کہنے لگی۔

”نوری! مجھے یاد آ گیا میں اماں کو اس کی دوپہر کی دوائی نہیں دے کر آئی۔ تم چلو میں اماں کو دوائی دے کر آتی ہوں۔ غفورے نے کہا تھا کہ دوائی وقت پر دینی ہے۔“ یہ کہہ کر زہرہ گھر کی طرف واپس چل پڑی جبکہ نوری اپنی سوچوں میں مگن چلتی رہی، دوسری لڑکیوں کی آوازیں اب اسے نہیں آ رہی تھیں، کیونکہ وہ تیز تیز چلتی ہوئی خاصی آگے چلی گئی تھیں اب تو وہ نظر بھی نہیں آ رہی تھیں۔

دوپہر کا وقت تھا سردیوں کی گرم گرم سنہری دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں کے مرد و زن کی اکثریت کھیتوں میں کام کاج میں مصروف تھی۔ کپاس کی فصل تیار تھی۔ کپاس کے کھیتوں میں سفید سفید برف جیسی کپاس پھولی ہوئی تھی۔ کھیتوں نے جیسے سفید برف کا لباس پہنا ہوا تھا۔ عورتوں اور لڑکیوں نے موٹے کپڑے کے تھیلے بنا کر کندھوں پر ڈالے ہوئے تھے اور وہ بڑی پھرتی کے ساتھ کپاس کے پھول چن چن کر تھیلوں میں ڈال رہی تھیں۔ جب تھیلے بھر جاتے تو وہ کھیت کے کنارے موجود ایک درخت کے نیچے بچھے ہوئے کپڑے پہ اپنا تھیلا خالی کر آتیں، اور پانی پی کر تھوڑا ستا کر پھر نئے سرے سے کھیت میں جا کر کپاس چننے لگتیں۔

نوری پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے گاؤں کی عورتوں کو کپاس چنتے دیکھتے ہوئے جا تو اپنے کھیت کی طرف رہی تھی جہاں اس کی سکھیاں کپاس چن رہی تھیں مگر اپنی سوچوں کے تانے بانے میں الجھی وہ چلتی چلی گئی۔ اور اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ انجانے میں وہ اپنا اصل راستہ چھوڑ کر پرانے قبرستان کی طرف جانے والے راستے پر چل رہی ہے، یہ قبرستان بہت قدیم تھا۔ اب تو اس میں مُردوں کو دفنانے کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ اس قبرستان کے بارے میں بڑی عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں لوگ

کہتے تھے کہ قبرستان کی طرف جانے والے راستے کے قریب واقع بڑے سے پیپل کے درخت کے نیچے جنات کا بسیرا ہے۔ یہ درخت اس قدر گھنا اور قدیم تھا کہ گاؤں کے بہت زیادہ عمر رسیدہ بزرگوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ قبرستان میں اس پیپل کے درخت کو کس نے اور کب وہاں لگایا تھا۔ پیپل کی گھنی شاخیں چہار جانب سے یوں زمین پہ جھکی ہوئی تھیں کہ ان کے نیچے ایک بڑا سا کمرہ سا بن گیا تھا۔ پیپل کے درخت کے تنے کے چاروں طرف مٹی کا چبوترا بنا ہوا تھا، اگر دو پہر یا رات کو کوئی عورت یا مرد بھول کر اس درخت کے قریب چلا جاتا تھا تو جنات اس پہ حاوی ہو جاتے تھے اور بڑی مشکل سے اس کا پیچھا چھوڑتے تھے۔

نوری نے ان جنات کے بارے میں بہت سے قصے سن رکھے تھے اس لیے وہ کبھی بھی اس قبرستان کی طرف نہیں جاتی تھی، جانا تو دور کی بات ہے وہ اس طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔ خاص کر اس وقت سے جب، ایک مرتبہ اپنی بہن شیباں کے ساتھ کھیتوں کی طرف جاتے جاتے اس کی نظر قبرستان اور پیپل کے درخت پر پڑی تھی تو اس نے دیکھا تھا کہ پیپل کے درخت کے نیچے سے کالے کپڑوں میں ملبوس تین انتہائی خوبصورت پستہ قامت عورتیں برآمد ہوئیں ،نوری حیرت سے منہ کھولے ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اپنی طرف متوجہ پا کر وہ تینوں عورتیں نوری اور اس کی بہن شیباں کی طرف بڑھی تھیں، اور پلک جھپکتے میں ان کے قریب پہنچ گئی تھیں۔

اس سے پہلے کہ وہ عورتیں انہیں کوئی نقصان پہنچاتیں' نوری نے گاؤں کی طرف دوڑ لگادی تھی، اس کی بہن بھی پیچھے پیچھے دوڑتی آ رہی تھی اور اس سے پوچھ رہی تھی کیا ہوا نوری گھر واپس کیوں جا رہی ہو؟ کھیتوں میں چلو۔ اماں ناراض ہوں گی'' شیباں نے غالباً ان عورتوں کو نہیں دیکھا تھا مگر نوری اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ وہ بے تحاشاہ بھاگتی چلی گئی تھی۔ گھر پہنچ کر وہ بے سدھ ہو کر گر پڑی تھی اور پھر کئی روز تک بخار میں مبتلا رہی تھی۔

اس دن شام کا وقت تھا اور وہ جمعرات کا دن تھا نوری کھیتوں میں سے چارہ کاٹ کر اپنی دھن میں مگن کوئی لوک گیت گنگناتی ہوئی چل رہی تھی۔ اور پھر اچانک اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کے قدم بے حد بھاری ہو رہے ہیں اور پھر اسے یوں لگا جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اسے کھینچ کر قبرستان والے پیپل کے درخت کی طرف لے جا رہی ہو اور پھر جیسے ہی نوری نے اس جانب چلنا شروع کیا تھا تو اسے اپنے جسم اور قدموں میں ایک توانائی سی محسوس ہوئی تھی' اسے پتہ ہی نہیں لگا کہ وہ کب پیپل کے درخت کی شاخوں سے بنی اس کمرے جیسی جگہ پر پہنچ گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر نوری کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا کیونکہ وہاں اس طرح ایک گول سی کشادہ جگہ بنی ہوئی تھی جیسے کہ کوئی صاف ستھرا بڑا سا روشن کمرہ ہو، وہاں باہر تیزی سے پھیلتے ہوئے اندھیرے کا نام و نشان بھی نہ تھا، سامنے درخت کے چاروں طرف اینٹوں کا ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا، اور اس چبوترے پر ایک انتہائی خوبصورت نوجوان بیٹھا تھا جس کے سنہری بال کندھوں تک جھول رہے تھے۔ چہرے کی رنگت سرخ و سپید تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی مقناطیسی چمک تھی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان سے شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔

''آؤ...... آجاؤ نوری! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' اس نوجوان کی دلکش آواز نوری کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اس کے دل کی دھڑکنیں اچھل پتھل ہونے لگیں، وہ اس کے چہرے پہ نظریں

جمائے اس کی جانب بڑھتی چلی گئی اور اس کے قریب ہی چبوترے پہ بیٹھ گئی۔

''مٹھائی کھاؤ گی؟'' نوجوان نے نوری کے چہرے کو وارفتگی سے دیکھتے ہوئے کہا، جواب میں نوری نے اثبات میں سر ہلایا تو نوجوان نے اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلند کیا اور اسی لمحے اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ آ گئی تھی جس میں مختلف قسم کی مٹھائیاں سجی ہوئی تھیں، نوجوان نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر نوری کی جانب بڑھایا تھا تو اس نے جھجکتے ہوئے وہ ٹکڑا منہ میں ڈالا تھا، جو اس کے منہ میں جاتے ہی گھل گیا تھا۔ اس کا ذائقہ ایسا تھا کہ نوری نے آج تک ایسی مٹھائی پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔ پھر وہ نوجوان مٹھائی کھلانے کے ساتھ ساتھ اپنی خوبصورت آواز میں باتیں بھی کر رہا تھا، اس نے نوری کو بتایا کہ وہ اسے اکثر کھیتوں میں آتے جاتے دیکھتا تھا اور تبھی اسے چاہنے لگا تھا، آج دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے خود کو اس پہ ظاہر کر دیا تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ قوم جنات سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ نوری کو ہمیشہ چاہتا رہے گا۔

نوری دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر نہایت دلچسپی سے نہ صرف اس کی باتیں سن رہی تھی، بلکہ اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر سے پسند بھی کرنے لگی تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ جنات بھی اس قدر خوبصورت ہو سکتے ہیں، اس نے تو سن رکھا تھا کہ جن بہت زیادہ بدشکل اور خوفناک ہوتے ہیں اور انسانوں کو چاہنا اور پسند کرنا تو درکنار وہ تو جس انسان پر حاوی ہو جاتے ہیں، اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے جب تک کوئی عامل اسے نجات نہ دلائے، یا وہ جن کے ہاتھوں مارا نہ جائے، مگر یہ تو نرالا تھا، جو اسے مٹھائی کھلا رہا تھا۔ اس سے میٹھی محبت بھری باتیں کر رہا تھا۔

اسی کیفیت میں جب کافی دیر ہو گئی تو نوری کو جیسے ہوش آ گیا اور وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ ''وہ...... وہ، میں اپنے گھر جاؤں گی، گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے، باہر تو اتنا اندھیرا اچھل گیا ہے۔ میں اکیلی کیسے جاؤں گی۔''

''تم فکر نہ کرو میں ابھی تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔'' نوجوان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، جب وہ کھڑا ہوا تو نوری کو حیرت کا ایک جھٹکا اور لگا تھا، اس نے سنا تھا کہ جنات کے قد تو بے حد لمبے ہوتے ہیں، جبکہ اس کا قد تو ایک اوسط آدمی کے قد سے بھی چھوٹا تھا۔

''نن...... نہیں، تم...... تم...... میرے ساتھ مت جاؤ، کوئی دیکھ لے گا۔'' نوری نے گھبرا کر کہا تھا۔

''ارے بے وقوف مجھے تمہارے علاوہ کوئی نہیں دیکھ سکتا'' نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھا اللہ حافظ!'' جیسے ہی نوجوان نے یہ الفاظ کہے۔ نوری نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی ہے۔ ابھی شام کا ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ گھر میں داخل ہوئی تو اس کی ماں باہر آنگن میں ہی کھڑی تھی۔

''کہاں تھی تو؟ اتنی دیر لگا دی، اور چارہ کہاں ہے؟ گھنٹوں کے بعد آئی ہے اور چارہ کاٹ کر نہیں لائی، اب میں بھینس کو تیرا سر ڈالوں گی''

ماں نے نوری کو دیکھ کر غصے کے عالم میں کہا تو نوری کو یاد آیا کہ چارے کا گٹھا تو وہ پیپل کے درخت کے پاس ہی بھول آئی تھی۔ اب اگر ماں کو اصلی بات بتاتی تو وہ اس کا گھر سے باہر نکلنا ہی بند کر دیتی۔ اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا اور اندر کوٹھری میں جا کر چارپائی پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر کے اس خوبصورت نوجوان کے تصور میں کھو گئی

جو جن کے بجائے کسی ملک کا حسین وجمیل شہزادہ لگتا تھا۔

اب اکثر ایسا ہوتا کہ نوری پیپل کے رخت چلی جاتی، جہاں اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کی راہ میں دیدہ ودل فرش راہ کیے اس کا منتظر ہوتا، وہ نوری کو طرح طرح کی مٹھائیاں، مزے دار پھل، اور لذیذ کھانے کھلاتا، اس سے محبت بھری باتیں کرتا اور جیون بھر اس کا ساتھ نبھانے کے عہد کرتا۔ اس پہ نوری گھبرا کر کہتی

''تم جن زاد ہو اور میں انسان، ہمارا ملن کیسے ہوسکتا ہے؟'' تو وہ لاپروائی سے کہتا

''ٹھیک ہے، ہماری شادی ہوسکے ناممکن ہوسکتا ہے مگر ہم اسی طرح ایک دوسرے سے ملتے رہیں گے کیونکہ ہماری محبت پاکیزہ ہے۔ میں صرف تمہاری دید کا پیاسا ہوں، تم سے باتیں کرنا اور چند لمحوں کے لیے ملنا ہی میرے لیے حاصل زندگی ہے، مجھے اور کچھ چاہیے بھی نہیں، تم میری ہو اور سدا میری رہو گی۔ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے جدا نہیں کرسکتی۔''

''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ساری زندگی تو ایسے نہیں گزر سکتی نا...... آج کل میرے لیے رشتے آرہے ہیں۔ شاید جلد ہی میری شادی ہوجائے پھر ہم کیسے مل سکیں گے؟'' نوری نے فکر مند لہجے میں پوچھا تھا۔

''کس کی جرات ہے جو تم سے شادی کرنے کی کوشش کرے، میں کبھی بھی تمہاری رشتہ نہیں ہونے دوں گا۔''

نوجوان نے طیش میں آکر کہا تھا تو نوری خاموش ہوگئی تھی۔

اس جن زاد نے نوری کو اپنا نام رستم بتایا تھا۔ رستم کی محبت میں رفتہ رفتہ نوری کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ وہ زیادہ تر تنہا رہنے کو ترجیح دیتی اور رستم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اسے بلالیتی، اور پھر دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے، جب کوئی ان کی جانب متوجہ ہوتا تو یہی سمجھتا کہ نوری اپنے آپ سے باتیں کررہی ہے، کیونکہ رستم کسی کو نظر نہیں آتا تھا

اس روز نوری شروع میں تو اپنی ہم جولی زہرہ اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہی تھی، زہرہ اس سے مسلسل باتیں کیے جارہی تھی، اس کے سر پہ چارے کا گٹھا تھا۔ اس لیے وہ صرف سامنے ہی دیکھ پارہی تھی، وہ اپنی دھن میں بولے جارہی تھی، کیونکہ اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی تھی اور وہ اپنی شادی کے سلسلے میں ہونے والی تیاریوں کی تفصیل نوری کے گوش گزار کررہی تھی۔

''ہائے ہائے زہرہ تو کس سے باتیں کیے جارہی ہے؟'' اس کے دائیں طرف ساتھ ساتھ چلنے والی سہیلی چھیمو نے یوں زہرہ کو تیز تیز بولتے سن کر حیرت سے پوچھا تھا۔

''نوری سے اور کس سے؟'' زہرہ نے اطمینان سے کہا تھا۔

''مگر نوری تو اب ہمارے ساتھ نہیں ہے۔''

چھیمو کی بات سن کر زہرہ نے پلٹ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بولی ''یہ نوری کہاں رہ گئی؟ ابھی تو میرے ساتھ چل رہی تھی اور میری باتوں کے جواب میں ہوں ہاں بھی کررہی تھی، مگر اب غائب ہے۔ مجھ سے چاچی نے کہا تھا کہ نوری کو ساتھ لے کر آیا کرو، اسے اکیلی نہ چھوڑنا، میرا خیال ہے کہ ہم یہاں کچھ دیر رک کر اس کا انتظار کرلیتے ہیں......'' یہ کہہ کر زہرہ نے اپنے چارے کے گٹھا سر سے اُتار کر پگڈنڈی کے کنارے پر رکھ دیا تھا اور اپنے بائیں طرف والے کھیت کی جانب دیکھنے لگی تھی جہاں باجرے کی فصل تیار کھڑی تھی۔ اس کی تقلید میں چھیمو نے بھی اپنا بوجھ اُتار دیا تھا، اور دونوں بے چینی سے نوری کا

انتظار کرنے لگیں۔ جبکہ باقی لڑکیاں بہت آگے نکل گئی تھیں، مگر جب کافی دیر تک نوری نہیں آئی تو چھیمو گھبرا کر بولی تھی۔

''ہائے نی زہرہ! اوپر سے رات اتر آئی ہے اور ہر طرف خاموشی ہوگئی ہے۔ کوئی بندہ نظر نہیں آ رہا ، چل جلدی چل ، ورنہ بے بے پریشان ہو کر میری تلاش میں نکل آئے گی۔ گھر سے اور ابے سے میری شکایت الگ لگائے گی۔''

''تو ٹھیک کہہ رہی ہے ، چھیمو شاید نوری ہماری نظر بچا کر گھر بھاگ گئی ہو۔'' زہرہ نے کہا۔ اور پھر دونوں اپنے گٹھرے اٹھا کر تیز تیز قدموں سے اپنے گھروں کی جانب چل پڑیں۔

زہرہ جب وہ نوری کے گھر کے قریب پہنچی تو انہوں نے دیکھا کہ نوری کی ماں چاچی حنیفہ اور اس کی بہن شیباں پریشان چہرے لیے دروازے پر کھڑی تھیں۔

''سلام چاچی! نوری آ گئی کیا؟ زہرہ نے قریب جا کر دبوچا۔

''کہاں دھیے اسی نامراد کا تو انتظار کر رہی ہوں۔ ساری لڑکیاں آ گئی ہیں میرا خیال تھا کہ تمہارے اور چھیمو کے ساتھ ہوگی مگر تم دونوں تو اکیلی ہی آ رہی ہو کہیں دیکھا نہیں اسے تم لوگوں نے؟''

''چاچی جب ہم کام کر کے آ رہی تھیں تو تب تو نوری ہمارے ساتھ ہی تھی۔ مگر پھر کچھ دیر بعد غائب ہو گئی بلکہ میں اور چھیمو کافی دیر اس کا انتظار کرتی رہیں مگر جب اندھیرا پھیلنے لگا تو پھر ہم نے سوچا کہ شاید وہ گھر پہنچ چکی ہو۔''

زہرہ کی بات سن کر چاچی اور بھی پریشان ہوگئی کہ اسی وقت نوری کی آمد ہوئی تھی۔

''ارے اماں کیا بات ہے؟ اس طرح کیوں کھڑی ہو دروازے پہ؟''

''تو کہاں چلی گئی تھی؟ اتنی دیر لگا دی؟ زہرہ اور چھیمو بھی تجھے ڈھونڈھ ڈھونڈ کر اب آئی ہیں، ' حنفیہ نے غصے سے چلا کر کہا تھا۔

''اماں میں تھوڑی دیر کے لیے درختوں کے جھنڈ کے پاس رک کر کیکر سے مسواک توڑنے لگ گئی تھی ، ابا نے کہا تھا کہ اس کی مسواک ٹوٹ گئی ہے اور یہ لوگ مجھے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل آئیں۔'' نوری نے ہاتھوں میں پکڑی تین چار تر شی ہوئی مسواکیں دکھا کر کہا۔

''تجھے کیا پڑی تھی مسواک توڑنے کی؟ تیرا بھائی لے آتا تو پھر اس منحوس جھنڈ کی طرف تو نہیں گئی۔ جانتی بھی ہے کہ وہ پکی جگہ ہے شام چھوڑ سادن ادھر باہر کی چیزیں پھرتی رہتی ہیں اسی لیے تو تو ہر وقت بیمار رہنے لگی ہے اب اگر تو ادھر گئی نا تو میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔'' حنفیہ نے غصے سے نوری کی کمر پر ایک دھموکا جڑ کر کہا۔

''اماں تو ہر وقت میرے پیچھے پڑی رہتی ہے۔'' نوری نے غصے سے کہا تھا اور پھر اپنا چارے کا گٹھا وہیں دروازے پر پھینک کر روتی ہوئی گھر میں داخل ہوگئی تھی۔

''چاچی، میرا خیال ہے کہ نوری کو کچھ دنوں کے لیے باہر نا نکلنے دیا کر، اور کسی سیانے کو دکھا اسے، مجھے لگ رہا ہے کہ اس پہ سایہ ہو گیا ہے'' چھیمو کا جانے کے بعد زہرہ نے آہستہ سے کہا تھا۔

''تو ٹھیک کہہ رہی ہے زہرہ، میں اب اسے کھیتوں کی طرف بالکل نہیں جانے دیا کروں گی، اور آج ہی اس کے ابا سے کہتی ہوں کہ مولوی صاحب کو بلا کر اس کو دم کروائے، جواں جہاں کنواری لڑکی ہے ایسا نہ ہو کوئی جن بھوت اسے چمٹ جائے پھر تو کوئی اس کا رشتہ بھی نہیں دے گا۔'' حنیفہ نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



''اور ہاں چاچی یاد آیا، وہ غفورے کے دوست دینو کی ماں خالہ بشریٰ کو نوری بہت پسند ہے، دینو کو بھی تم نے دیکھا ہوگا اونچا لمبا گھبرو جوان ہے، نوری کا صحیح جوڑ ہے خالہ بشریٰ کئی بار میری اماں سے کہہ چکی ہیں کہ وہ دینو اور نوری کے رشتے کے سلسلے میں بات چلائے اگر تو کہے تو میں اماں سے بات کروں؟''

''ہاں ہاں زہرہ، میری پیاری دھی رانی تو جلدی بات کر اپنی اماں سے کہ وہ دینو کے باپ کو رشتہ مانگنے کے لیے لے کر آ جائے جب مرضی ہماری طرف سے ہاں ہی سمجھو کیونکہ دیکھے بھالے اپنی برادری کے لوگ پھر کیسی پریشانی۔ تم دونوں سہیلیاں بھی اکٹھی ہی شہر میں رہوگی۔'' حنیفہ نے خوش ہو کر کہا تھا۔

''ٹھیک ہے، چاچی میں ابھی جا کر اماں سے بات کرتی ہوں۔ اچھا رب راکھا!''

رب راکھا خیر سے اس نیک کام کی بسم اللہ کرو، اللہ تجھے اس کا اجر دے گا کہ تمہاری پیاری سہیلی کا گھر آباد ہو جائے۔'' حنیفہ نے کہا اور پھر وہ گھر میں داخل ہوگئی۔ کمرے میں آ گئی تو اس نے دیکھا نوری چارپائی پر لیٹی ہنس ہنس کر اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔

''اے ہے نوری یہ تو کس سے باتیں کر رہی ہے اور کمرے میں اتنا اندھیرا کیا ہوا ہے، بتی بھی نہیں جلائی۔'' حنیفہ نے کمرے کی بتی جلا کر قدرے غصے سے کہا۔

''اماں تمہیں تو ویسے ہی وہم ہوتا ہے۔ میں بھلا کس سے باتیں کرتی؟'' نوری نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے درشت لہجے میں کہا

''آپا جھوٹ مت بول، میں باہر برآمدے میں چولہے پر ہانڈی پکا رہی تھی اور مجھے وہاں تک تمہاری آوازیں آ رہی تھیں۔'' نوری کی بہن شیباں نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

''تو تو ہے ہی چغل خور، میسنی کہیں کی، اماں کو خوش کرنے کے لیے اپنے پاس سے الٹے سیدھے جھوٹ گھڑنا تو تیری پرانی عادت ہے۔'' نوری نے شیباں کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا تو وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

دوسرے دن جب نوری کھیتوں میں جانے لگی تو حنیفہ نے اس سے کہا ''نوری تو آج کھیتوں میں نہیں جانا، شام کو زہرہ کی اماں کے ساتھ کچھ لوگ تمہارے رشتے کی بات کرنے آ رہے ہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی زہرہ نے آ کر بتایا ہے۔''

''کون سا رشتہ، کیسا رشتہ؟ مجھے نہیں کرنی کسی سے بھی شادی وادی'' نوری نے تنک کر کہا۔

''ہاں...... ہاں تجھے تو ساری زندگی ہمارے سینے پر مونگ دلنے کے لیے یہاں ہی رہنا ہے نا، فضول باتیں نہ کر، اور چل جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ڈھنگ کے کپڑے پہن لے۔'' حنیفہ نے گویا حکم صادر کر دیا اور نوری غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے ٹرنک سے پچھلی عید والا نیا جوڑا نکالنے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔

شام کو زہرہ اس کی ماں اور دینو کے ماں باپ اور بڑی شادی شدہ بہن کے آنے پر حنیفہ نے خوشدلی سے ان کا استقبال کیا اور پھر بنوی سنوری نوری انہیں اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے فوراً ہی رشتہ مانگ لیا۔ اس پر حنیفہ اور نوری کے والد نے رسمی طور پر سوچ بچار کے لیے چھ دن کی مہلت مانگی اور مہمانوں کی خوب اچھی طرح تواضع کی جس پہ وہ بے حد خوش ہوگئے اور جاتے جاتے کہہ گئے کہ وہ ایک ہفتے بعد آئیں گے اور منہ میٹھا کر کے جائیں گے۔

مہمانوں کے جانے کے بعد نوری چھت پر

آ گئی تھی۔شام کا ملگجا اندھیرا۔رات کی تاریکی میں ڈھل چکا تھا۔آسمان پہ چاند کی نرم نرم ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔تارے جگمگا جگمگا کر چاندنی سے مقابلہ کررہے تھے۔سارے گھروں سے دھویں کے مرغولے نکل کر فضا میں تیر رہے تھے۔گاؤں میں کچھ عرصے قبل بجلی بھی آ چکی تھی اس لیے لوگوں کے گھر اور گلیاں روشن ہو چکی تھیں البتہ ابھی گیس نہیں آئی تھی جس کی وجہ سے لوگ کھانا اپلوں یا لکڑیوں کی آگ پر پکاتے تھے۔اسی وجہ سے گھروں سے کھانا بناتے وقت دھواں اٹھتا تھا۔جو آسمانوں کی جانب جاتا ہوا بڑا اچھا لگتا تھا خاص کر نوری کو شام کے وقت یہ منظر بہت پسند تھا اس لیے وہ اکثر چھت پر پڑی چارپائی پہ بیٹھ کر دھویں کے بادلوں کو دلچسپی سے دیکھتی رہتی اور اسے مختلف شکلوں میں تراشتی رہتی۔وہ چھت پر آ کر اپنی مخصوص چارپائی پہ لیٹ کر دھویں کو دیکھنے لگی۔آج اس کا دل بے حد اداس تھا کیونکہ اس کے گھر والوں نے اچانک ہی اس کی شادی کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس کے ہونے والے سسرال والوں نے نہ صرف سے پسند کرلیا تھا بلکہ رشتہ مانگ بھی لیا تھا۔وہ جانتی تھی کہ جیسے ہی رشتہ پکا ہوا اس کی ماں نے اس کی شادی کی تیاری شروع کردینی ہے۔اور یوں وہ اپنا پیارا گاؤں، اپنی سکھیاں اور سب سے بڑھ کر رستم کو چھوڑ کر شہر چلی جائے گی جہاں سے کبھی کبھار ہی آنا ہوگا'دھویں کے مرغولوں پر نظریں جمائے ایسی ہی سوچوں میں غرق تھی کہ اسے ان مرغولوں میں سے رستم نیچے اترتا ہوا نظر آیا۔اگلے ہی لمحے وہ اس کے قریب پڑی دوسری چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا ''تم ......تم یہاں ...... یہاں کیوں آئے ہو......کوئی تمہیں دیکھ لے گا۔'' نوری گھبرا کر چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

رستم کچھ دیر تو دلچسپی سے نوری کی بوکھلاہٹ کو دیکھتا رہا پھر بولا ''ارے پگلی میں نے کتنی بار تمہیں کہا ہے کہ مجھے تمہارے علاوہ نہ کوئی دیکھ سکتا ہے، نہ کوئی میری آواز سن سکتا ہے' پھر تم کیوں گھبرا جاتی ہو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن کوئی مجھے تم سے باتیں کرتا تو دیکھ سکتا ہے نا' گھر والے تو پہلے ہی یہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھ پر کوئی سایہ ہو گیا ہے' کوئی جن آ گیا ہے اور......''

''سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں، ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟'' رستم نے نوری کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

''فرق پڑتا ہے نا' اس طرح وہ کسی سیانے کو بلائیں گے جو مجھے مارے پیٹے گا۔آگ جلا کر دھونی دے گا۔عملیات کرے گا تاکہ تمہیں بھگا دے۔'' نوری نے پریشانی سے کہا

''بھگا کر تو دیکھے میں اسے نہ بھگا دوں گا۔'' رستم نے غصہ سے کہا۔کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ چلا گیا اور نوری گہری سوچوں میں کھوئی کھوئی سی نیچے چلی گئی کہ اماں کافی دیر سے اسے آوازیں دے رہی تھیں۔

اب رستم ہر روز مخصوص وقت پر نوری سے ملنے آ جاتا، دوسری طرف نوری کے گھر والوں نے اس کا رشتہ دینو سے طے کردیا تھا اور شادی کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ زہرہ اور نوری کی شادیاں ایک ساتھ ہی ہوں گی۔دونوں براتیں زہرہ کے گھر میں ہی آنی تھیں کیونکہ اس کا گھر کافی بڑا تھا جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے نوری کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اس روز رستم آیا ہوا تھا اور نوری اس سے باتوں میں مصروف تھی، نوری کی ماں چاچی حنیفہ نے یہ نوری کی خود کلامی والا منظر دیکھ لیا تھا اور گھبرا کر نوری کے باپ سے کہا تھا کہ وہ کسی عامل کو بلائے تاکہ شادی سے پہلے نوری کے آسیب سے چھٹکارا مل

سکے۔اس کے بعد ہوا یہ کہ کئی عامل آئے مگر رستم الٹا انہیں مار پیٹ کر بھاگنے پر مجبور کر دیتا تھا، حالانکہ وہ اپنے تمام عمل کرتے تھے۔نوری کو مارتے پیٹتے بھی ،اسے دھونی بھی دیتے تھے مگر رستم کے آگے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔اب تو رستم نوری کے پاس ہی رہتا، اور وہ ہوش وخرد سے بیگانہ ہو کر رستم سے باتیں کرتی رہتی تھی،اس کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی تھی، ماں باپ اور بھائی بہنوں کو فکر تھی کہ کہیں اس کے سسرال والوں کو اس بات کی خبر نہ ہو جائے کہ نوری پر جن آتا ہے اس لیے وہ چپکے چپکے اپنے طور پر اس کا علاج کروا رہے تھے مگر ہنوز کامیابی نہیں ملی تھی۔

اس روز نوری کے باپ کی ایک نئے عامل صاحب کے ساتھ آمد ہوئی تھی۔وہ سفید ریش بے حد عمر رسیدہ اور عالم فاضل شخص تھے انہوں نے ساری زندگی عبادت و ریاضت میں اور بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے گزاری تھی،ان کے پرنور چہرے پہ عجیب سی طمانیت اور سکون تھا۔وہ روحانی علم میں ماہر تھے اور کئی جنات ان کے موکل تھے جو ان کے حکم کو ماننا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔

نوری کو سامنے بٹھا کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سمجھایا کہ وہ پریشان نہ ہو بہت جلد اسے اس جن سے چھٹکارا مل جائے گا تو نوری پریشان ہو گئی اب تو اسے رستم سے ایک پل کی جدائی بھی گوارا نہیں تھی جبکہ بابا جی اسے ہمیشہ کے لیے بھگانے کی فکر میں تھے نوری نے گھبرا کر رستم کو یاد کیا تو وہ فوراً آن پہنچا۔

''رستم ! رستم دیکھو یہ عامل جی ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرنا چاہتے ہیں۔'' نوری نے روتے ہوئے رستم سے کہا تھا۔

''مجال ہے ان کی یہ ایسا کر سکیں!'' رستم نے نوری کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔مگر جب عامل جی کے جلالی چہرے پر نظریں پڑیں تو وہ گھبرا گیا، اس کے دوست جنات نے اسے عامل کی روحانی قوتوں کے بارے میں بتایا تھا۔اگر کوئی جن ان کی بات نہیں مانتا تھا تو وہ اپنے روحانی علم کو بروئے کار لا کر اسے بھسم کر ڈالتے تھے عامل کی غضبناک نگاہوں سے بچنے کی خاطر رستم فوری طور پر نوری کے جسم میں حلول کر گیا تھا۔

''او نابکار جن...... بتا تو نے اس معصوم آدم زادی کو کیوں اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے؟'' بابا جی کی غضب ناک آواز بظاہر نوری مگر اصل میں رستم کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''اس لیے کہ...... میں اس سے...... محبت کرتا ہوں ......'' نوری کے لب ہلے مگر آواز نوری کے بجائے رستم کی تھی۔

''ارے احمق جن تو جانتا ہے کہ انسان اور جن میں محبت اور چاہت کا رشتہ استوار ہونا ناممکن ہے !'' بابا جی نے نوری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔

''جانتا ہوں ...... مگر کسی کو چاہنا یا نہ چاہنا اپنے بس میں تو نہیں ہوتا نا...... یہ تو ایسا جذبہ ہے جو خود بخود ہی دل کو جکڑ لیتا ہے۔'' رستم نے شاعرانہ انداز میں کہا تھا۔

''ٹھیک ہے مگر تم جانتے ہو نا کہ اس محبت کا کیا انجام ہو گا نہ تم اس لڑکی سے شادی کر سکتے ہو نہ ہی اسے اپنی دنیا میں لے جا سکتے ہو پھر کیا فائدہ ایسی محبت کا؟'' بابا جی نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''بس یہ میری ہے اور میری ہی رہے گی، میں اسے دیکھ کر اور اس سے باتیں کر کے ہی خوش ہو جاتا ہوں، مجھے کچھ اور نہیں چاہیے'' رستم نے جواب دیا۔

''مگر کب تک......؟'' بابا جی نے پوچھا۔

''ساری زندگی......'' رستم نے کہا۔

''ہوں......!ساری زندگی مگر تم یہ بھول رہے ہو کہ یہ ایک آدم زاد ہے، اس کی کتنی عمر ہو گی۔زیادہ

سے زیادہ ستر یا پھر اسی سال ، جبکہ تمہاری عمر تو ہزاروں سال ہے تو اس کے مرنے کے بعد کیا کرو گے؟'' بابا جی اب بھی نرمی سے بات کر رہے تھے۔

''تب کی تب دیکھی جائے گی'' رستم نے لاپروائی سے کہا۔

''کیا تم واقعی اس کو سچے دل سے چاہتے ہو؟'' بابا جی نے استفسار کیا۔

''آپ کو کوئی شک ہے کیا؟'' رستم نے کہا۔

''ہاں شک ہے!'' بابا جی نرمی سے بولے۔

''کیسا شک؟'' رستم نے پوچھا۔

''کیونکہ اگر تم واقعی اسے سچے دل سے چاہتے تو یوں اس کی زندگی برباد نہ کرتے ، دیکھو نا جب دنیا والوں کو پتہ چلے گا کہ اس پہ جن کا سایہ ہے تو کوئی بھی اس سے شادی نہیں کرے گا' سبھی اس سے دور بھاگیں گے۔ ماں باپ کے بعد یہ بے چاری اکیلی رہ جائے گی۔لوگ اسے پگلی سمجھ کر پتھر ماریں گے اور یہ بھوکی پیاسی کسی بیاباں میں بھٹکتی ہوئی مر جائے گی۔ تب بھی تو تم صبر کرو گے نا تو کیوں نہ ابھی سے اس کا پیچھا چھوڑ دو تا کہ یہ اپنا گھر بسا سکے۔اس کی اولاد ہو جو بڑھاپے میں اس کا سہارا بنے۔تمہاری محبت سوائے اس کو رسوائی ، بدنامی اور تنہائی کے اور کیا دے گی اور پر میں تو تمہیں نرمی سے اس کا پیچھا چھوڑنے کو کہہ رہا ہوں۔اس کے والدین کسی اور عامل کے پاس لے گئے تو وہ تم سے نجات دلانے کے لیے اس کو ماریں گے ،اس پہ جادو ٹونے کریں گے تو ہو سکتا ہے کہ یہ ان کی مار پیٹ کی تاب نہ لا کر مر ہی جائے۔تب کیا کرو گے تم؟ کیا تم برداشت کر سکو گے کہ تمہاری محبت یوں عاملوں کی مار پیٹ سہہ سہہ کر مر جائے۔یہ ہے تمہاری اس کے لیے محبت؟ محبت تو قربانی مانگتی ہے۔تم کہتے ہو کہ تمہاری محبت اس کے لیے پاکیزہ ہے تو پھر تم اسے غائبانہ طور پر اور دور سے دیکھ لیا کرنا ،مگر اس طرح تو اسے اپنا پابند کر کے اس کی زندگی کو تباہ نہ کرو ، اس سے نہ تمہارا کوئی فائدہ ہو گا نہ ہی اس کا۔''

عامل جی کی باتیں سن کر رستم ایک لمحے کے لیے خاموش سا ہو گیا اور پھر ایک گہری سانس لے کر بولا ''ٹھیک ہے عامل جی! اگر اسی میں نوری کی بھلائی ہے تو میں ہمیشہ کے لیے اس کا پیچھا چھوڑ دوں گا مگر آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔'' بابا جی نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے!'' رستم نے کہا تھا۔

''مگر ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ تم جا چکے ہو؟'' عامل جی نے چہرے پر ایک مسکراہٹ سجا کر کہا۔

''آپ لوگ سامنے دیوار پر خالی ہانڈی رکھ دیں۔میں جاتے ہوئے اسے گرا دوں گا۔دوسرے گاؤں کے چوراہے پر سوا پانچ کلو گوشت' سوا پانچ کلو گندم اور ایک جوڑا کپڑوں کا رکھ دیں، اچھا اب میں جا رہا ہوں۔میری نوری کا خیال رکھیے گا۔یہ دنیا انسانوں کی ہے البتہ اگلی دنیا میں اللہ سے اسے اپنے لیے مانگ لوں گا کہ میں ایک مسلمان جن ہوں۔ میرے آبا و اجداد کا تعلق ان جنات سے ہے جنہوں نے حضرت محمد ﷺ کے مبارک ہاتھوں پر اسلام قبول کیا تھا۔

یہ کہہ کر رستم خاموش ہو گیا۔دوسرے لمحے نوری اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی لمحے دیوار پر رکھی خالی ہانڈی ایک زوردار آواز سے گر کر ٹوٹ گئی۔

نوری نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہانڈی کو گرتے دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔اس کا رستم اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا تھا۔☆

آڈری ہیپ برن

شفاعت علی

ایک تھی شہزادی، جس کا شہزادہ اسے ملا اور پھر کھو گیا



آڈری ہیپرن اور گریگری پیک فلم رومن ہالیڈے کا ایک منظر

جان ڈائٹن اور ڈیلٹن ٹرمبو نے ایک شہزادی کی کہانی لکھی تھی۔ یہ کہانی ایک ایسی شہزادی کے متعلق تھی جو دنیا بھر کے ممالک کے سفر پر نکلی تھی۔ وہ اپنے اردگرد ہمیشہ پہرے داروں کو دیکھتے دیکھتے تنگ آ چکی تھی لیکن شہزادی ہونے کے باوجود اسے ان سے چھٹکارا نہیں تھا۔ اٹلی میں پہنچ کر اس کا قافلہ روم میں پڑاؤ ڈالتا ہے جہاں کی وہ سیر کرنا چاہتی ہے لیکن سخت سیکورٹی کی وجہ سے ذہنی طور پر تھکاوٹ کا شکار ہے۔ اس کا ڈاکٹر اسے آرام وسکون سے سونے کے لیے ایسی دوائی دیتا ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے نیند کی آغوش میں پہنچا سکتی ہے۔ دوائی استعمال کرنے کے بعد وہ اپنے ملک کے سفارت خانے کی گیلری سے روم کا نظارہ کرتی ہے تو اسے سب کچھ قریب سے دیکھنے کا شوق ہوتا ہے اور وہ چپکے سے سب کی نظریں بچا کر وہاں سے باہر نکل جاتی ہے۔ یہیں سے اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ روم کی سڑکوں پر مٹر گشت کرتے ہوئے وہ کافی محظوظ ہوتی ہے لیکن اس دوران نشہ آور دوائی اثر دکھانا شروع کر دیتی ہے اور وہ ایک پارک کی بنچ پر نیند کی آغوش میں چلی جاتی ہے جہاں اسے ایک امریکن شہری جو بریڈ لے ملتا ہے جو روم میں ڈیلی امریکن کے لیے اخباری رپورٹر کا کام کر رہا ہے۔ یہ رپورٹر شہزادی کو نہیں پہچانتا اور اسے کچھ پیسے دینا چاہتا ہے تاکہ یہ ٹیکسی لے کر اپنے گھر پہنچ جائے۔ شہزادی کے ذہن پر اس وقت بھی نیند کا خمار چھایا ہوا ہے لیکن وہ اس رپورٹر کو اپنی اصلیت نہیں بتاتی بلکہ ایک من گھڑت نام اینیا اسمتھ بتاتی ہے۔ اینیا اس سے پیسے لینے سے انکار کر دیتی ہے جس پر رپورٹر اسے اپنے اپارٹمنٹ لے جاتا ہے تاکہ رات اسے غنڈے پریشان نہ کریں۔ شہزادی اس کے اپارٹمنٹ میں ایک بار پھر نیند کی دنیا میں غرق ہو جاتی ہے۔ جو کو اپنے شہر میں

آئی شہزادی این سے انٹرویو کرنا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ صبح سویرے اپنے آفس کے لیے روانہ ہو جاتا ہے جبکہ شہزادی اس کے اپارٹمنٹ میں سوئی رہتی ہے۔ جب وہ اپنے دفتر پہنچتا ہے تو اس کا ایڈیٹر اسے لیٹ آنے پر جھاڑتا ہے۔ وہ شہزادی سے انٹرویو کے لیے تیاری کرتا ہے لیکن ایڈیٹر اسے بتاتا ہے کہ شہزادی کی اچانک بیماری کی وجہ سے یہ پریس کانفرنس ملتوی کر دی گئی ہے۔ وہ جو کو شہزادی کی ایک تصویر بھی دکھاتا ہے، جو تصویر دیکھتے ہی سمجھ جاتا ہے کہ اس کے اپارٹمنٹ میں آرام کرنے والی شہزادی این ہی ہے۔ وہ اپنے ایڈیٹر سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر وہ اسے پانچ ہزار ڈالر دینے کا وعدہ کرے تو وہ شہزادی سے ایک بھرپور انٹرویو کر سکتا ہے۔ ایڈیٹر انجانے میں اسے یہ رقم دینے کی ہامی بھر لیتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دیتا ہے کہ اگر وہ اس انٹرویو میں ناکام رہا تو اسے پانچ ہزار ڈالر جرمانہ ادا کرنا ہوگا جو سیدھا گھر پہنچتا ہے جہاں شہزادی موجود ہوتی ہے۔ وہ اس پر ظاہر نہیں کرتا کہ وہ اس کی اصلیت سے واقف ہو گیا ہے بلکہ اسے روم گھمانے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اپنے فوٹو گرافر دوست ارونگ ریڈووچ کو بھی بلا لیتا ہے جو سامنے آئے بغیر شہزادی کی تصاویر بنا سکے۔ شہزادی اس پیش کش کو ٹھکرا دیتی ہے اور اپنی وقتی آزادی سے لطف اندوز ہونے کے لیے نکل پڑتی ہے۔ شہزادی اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے لیے باربر شاپ سے اپنے بال بھی چھوٹے کرا لیتی ہے جہاں سے نکلتے ہوئے اسپینش اسٹیپس کے قریب اس کی ایک بار پھر جو سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے جو حقیقت میں اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ وہ اس اپنے ساتھ گھومنے کے لیے راضی کر لیتا ہے۔ روم کے نظارے کرتے ہوئے وہ سچ کی یادگار (Mouth of Truth) پر پہنچتے ہیں۔ یہ ایک سنگی مجسمہ ہے جس

کے متعلق مشہور ہے کہ اگر کوئی جھوٹا آدمی اس کے منہ میں ہاتھ ڈال دے تو وہ اسے کاٹ لیتا ہے، جو اپنا ہاتھ اس کے منہ میں ڈالتا ہے اور جب باہر نکالتا ہے تو وہ کٹ چکا ہوتا ہے جسے دیکھ کر شہزادی چیخ پڑتی ہے، جو ہنستے ہوئے کوٹ کی مڑی ہوئی آستین میں سے اپنا پورا ہاتھ نکالتا ہے تو شہزادی کی تسلی ہوتی ہے دونوں شہر بھر میں گھومتے پھرتے ہیں جہاں شہزادی اپنی آزادی سے بھرپور لطف اٹھارہی ہے۔ رات میں ایک بوٹ پر ڈانس پارٹی میں سرکاری نمائندے شہزادی کو تلاش کر لیتے ہیں اور اپنے ساتھ واپس لے جانا چاہتے ہیں لیکن ایک بھگدڑ کے نتیجے میں جو اور اینیا بچ نکلتے ہیں۔ اس ساتھ کے نتیجے میں دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں لیکن اینیا سمجھتی ہے کہ دونوں کا عمر بھر کا ساتھ ناممکن ہے کیونکہ وہ مختلف ماحول کے پروردہ ہیں۔ وہ دل کی بات ٹھکرا کر دماغ کی بات مان لیتی ہے اور واپس اپنے سفارت خانے چلی جاتی ہے۔ امریکن نیوز کے ایڈیٹر کو پتہ چلتا ہے کہ شہزادی بیمار نہیں غائب ہے جس پر اسے شبہ ہوتا ہے کہ جو اس کے بارے میں جانتا ہے لیکن پوچھنے پر وہ صاف انکار کر دیتا ہے جو شہزادی کے متعلق اسٹوری لکھنے اور ارونگ کی تصاویر شائع کرنے کی سوچتے ہیں لیکن پھر شہزادی سے دوستی کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کر دیتے ہیں۔ دوسرے دن جب شہزادی پریس کانفرنس کے لیے آتی ہے تو اسے پریس رپورٹر جو اور ارونگ بھی نظر آتے ہیں۔ ارونگ ایک بار پھر جیبی لائٹر کیمرے سے اس کی تصویر بناتا ہے جو اس نے شہزادی کی سیر و تفریح کے دوران استعمال کیا تھا۔ ارونگ اس کی تصاویر کی البم چپکے سے اس کے حوالے کر دیتا ہے جبکہ جو بھی اشاروں کنایوں میں اسے آگاہ کر دیتا ہے کہ اس کی گمشدگی کا راز انہی کے پاس محفوظ ہے جس پر وہ پریس کانفرنس میں ڈھکے چھپے لفظوں میں دونوں کا شکریہ ادا کرتی ہے اور تینوں جدا ہو جاتے ہیں اور یہیں شہزادی کی کہانی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

یہی کہانی نرگس اور راج کپور کی فلم چوری چوری کی بھی ہے لیکن حقیقت میں یہ ولیم وائلر (William Wyler) کی فلم رومن ہالی ڈے کی کہانی ہے جسے سب سے پہلے راج کپور نے چرایا تھا۔ رومن ہالیڈے کی طرح فلم کی ہیروئن نرگس ایک امیر کبیر باپ کی بیٹی تھی جو اپنے عاشق کے پاس جانے کے لیے گھر سے نکلتی ہے اور اخباری رپورٹر راج کپور سے جا ملتی ہے جبکہ عامر خان اور پوجا بھٹ کی 'دل ہے کہ مانتا نہیں' بھی اسی فلم کا چربہ تھی۔

رومن ہالیڈے کی شہزادی اپنی حقیقی زندگی میں بھی ایک ایسی لڑکی تھی جس کے رشتے یورپین شاہی خاندانوں سے ملتے تھے۔ یہ حقیقی شہزادی آڈری ہیپ برن (Ardery Kathleen Hapburn) تھی جبکہ ہیرو جو بریڈلے ہالی وڈ کا نامور اداکار گریگری پیک (Gregory Peck) تھا جو اس دور میں فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ ان دونوں سے پاکستانی سنیما بین پوری طرح واقف ہیں، ہیپ برن نام کی آڈری ہیپ برن سے پہلے بھی ایک ایکٹریس تھی جس کا پورا نام کیتھرین ہیپ برن تھا۔ لیکن اس کی ہماری شہزادی سے کوئی رشتے داری نہیں تھی کیونکہ وہ 12 مئی 1907ء کو امریکہ میں پیدا ہوئی تھی۔

ہالی وڈ کی فلموں میں آڈری ہیپ برن کے نام سے شہرت حاصل کرنے والی اس حسین ساحرہ نے 4 مئی 1929 کو آڈری کیتھلین رسٹن (Audery Kathleen Ruston) کے نام سے بلجیم کے دارالحکومت برسلز کے ایک قصبے میں جوزف وکٹر انتھونی رسٹن اور ایلا وان ہیمسٹرا اینا

رسٹن کے گھر میں جنم لیا۔ باپ کا تعلق برطانیہ اور ماں کا آسٹرین نسل سے تھا۔ دونوں کی رگوں میں شاہی خون گردش کررہا تھا۔ بلجیم میں پیدا ہونے کے باوجود آڈری ہیپ برن کی وجہ سے برطانوی شہریت رکھتی تھی۔ باپ کے بڑے سرکاری عہدوں کی وجہ سے اس کا بچپن بلجیم، ہالینڈ اور انگلینڈ میں گزرا وہ انگریزی، ڈچ، اسپنش، فرینچ اور اطالوی زبان پر عبور رکھتی تھی۔

آڈری نے بچپن ہی میں اپنے کیریر کے آغاز کی جانب اشارہ کردیا تھا جب اس نے پانچ برس کی عمر میں بیلے ڈانس کی تربیت حاصل کرنی شروع کی۔ 1944 تک وہ ایک بہترین بیلے ڈانسر بن چکی تھی۔ جنگ عظیم دوئم کے دوران اپنی خفیہ ڈانس پارٹیوں سے اس نے ڈچ مزاحمتی گروپس کے لیے چندے جمع کیے۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ ایسی پارٹیز ہوتی تھیں جہاں ڈانس کے خاتمے پر کوئی تالیاں بجا کر داد نہیں دیتا تھا۔ وہ اس وقت بھی ضرورت مندوں کی امداد میں پیش پیش رہتی تھی۔ یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن کے ادارے یونیسیف کے لیے جب اسے موقع دیا گیا تو اس نے دنیا بھر میں خوراک کی فراہمی کو یقینی بنانے کی کوشش کی کیونکہ وہ یہ عذاب اپنے بچپن میں جھیل چکی تھی جس کی وجہ سے اس کی جسمانی نشوونما پر بھی اثر پڑا تھا۔ وہ پانچ فٹ سات انچ کی تھی لیکن خوراک کی کمی کا شکار ہونے کی وجہ سے اپنے دبلے پتلے بدن کے ساتھ اور زیادہ لمبی نظر آتی تھی۔

1945ء میں جنگ عظیم ختم ہوچکی تھی جس کے بعد آڈری اپنی ماں ساتھ ایمسٹرڈم منتقل ہوگئی۔ اس کی ماں گھر کے گزارے کے لیے کام کرنے پر مجبور تھی۔ آڈری نے ہالینڈ کی سب سے بہترین بیلے ڈانسر گیسکل کی شاگردی اختیار کی وہ تین سال میں ایک بہترین بیلے ڈانسر بن چکی تھی۔ اور اس کی شہرت پھیلتی جارہی تھی۔ 1948 میں اسے ایک فلم Dutch In Seven Lessons میں ایک اسٹیوارڈیز کا رول ملا جس کے بعد وہ انگلینڈ منتقل ہوگئی اور وقت گزاری کے لیے ماڈلنگ بھی شروع کردی۔ اس نے اپنے استاد بیلے ریمبرٹ سے اپنے کیریر کے متعلق صلاح مشورہ کیا۔ جس نے اسے ایکٹنگ جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ آڈری اس پر اعتماد کرتی تھی جس کی بنا پر وہ ایکٹنگ کو ترجیح دیتی تھی۔ جب وہ ایک مشہور اسٹار بن گئی تو لیمبرٹ نے یاد کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک بہترین شاگرد تھی اور اگر چاہتی تو بہترین بیلرینا (بیلے ڈانسر) بن سکتی تھی وہ اس وقت تک تھیٹر میں جانی پہچانی جانے لگی تھی جس کی وجہ سے لندن ہپوڈروم کے میوزیکل تھیٹر میں 1948 میں High Button Shoes اور 1949 میں Sauce Tartare اور 1950 میں Sauce Piquabte جبکہ ویسٹ اینڈ کیمبرج تھیٹر میں بھی کام کیا۔ اس نے فلم والوں سے بھی رابطہ کیا جس پر اسے کچھ فلموں میں چھوٹے موٹے رولز ملے جن میں 'One Wild Oates اور Laughter in Paradise The Lavender Hill Mob شامل تھیں اس کے بعد اسے پہلا مرکزی کردار تھورولڈ ڈکنسن کی فلم The Secret People میں ملا جو ایک بیلے ڈانسر کا تھا۔ اس فلم میں تمام بیلے ڈانس اس نے پیش کیے۔ اسے Monte Carlo Baby میں بھی ایک چھوٹا سا کردار دیا گیا جو بیک وقت انگریزی اور فرنچ میں بنائی جارہی تھی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران فرنچ ناول نگار کولیٹ بھی وہاں موجود تھا جس کی نظر آڈری پر پڑی، وہ براڈوے میں اپنے تھیٹر کے لیے ایک اچھی اداکارہ کی تلاش میں تھا جو

Gigi میں کام کر سکے۔ اس نے ہیپ برن کو اس مرکزی کردار کے لیے آفر دی۔ ہیپ برن نے تھیٹر کے اس رول سے پورا انصاف کیا اور جب 24 نومبر 1951ء کو یہ کھیل فلٹن تھیٹر میں پیش کیا گیا تو اس کا نام نمایاں الفاظ میں دیا گیا۔ یہ کھیل 31 مئی 1952 تک مسلسل دکھایا جاتا رہا اور ہیپ برن کو اپنے پہلے براڈوے تھیٹر میں ورلڈ ایوارڈ دیا گیا۔ اس تھیٹریکل ڈرامے کے لیے پوری ٹیم امریکہ گئی جہاں اس نے کلیولینڈ، شکاگو، ڈیٹرائٹ، واشنگٹن، لاس اینجلز اور سان فرانسسکو میں عوام کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

براڈوے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے اداکاروں کی نرسری ہے۔ یہاں سے ہر اداکار کندن بن کر نکلتا ہے۔ اس اسٹیج پر اداکاری کسی معمولی اداکار کے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔ ہیپ برن نے اس اسٹیج پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ کتنی بڑی آرٹسٹ ہے۔ تھیٹر میں اداکاری یوں بھی آسان کام نہیں ہے کیونکہ اس میں موقع پر ہی داد یا بیداد مل جاتی ہے۔ آغا حشر کاشمیری اور سہراب مودی انڈیا میں کسی ایسے ویسے اداکار کو تھیٹر میں قدم بھی نہیں رکھنے دیتے تھے۔

آڈری ہیپ برن اس وقت تک ایک شوخ حسینہ کا روپ دھار چکی تھی۔ ہیپ برن ایسی ہی شوخ و چنچل تھی جسے ڈائریکٹر ولیم وائلر نے دیکھتے ہی رومن ہالیڈے کی ہیروئن چن لیا حالانکہ یہ کردار خاص طور سے الزبتھ ٹیلر کو ذہن میں رکھتے ہوئے لکھوایا گیا تھا۔ ہیرو کے رول کے لیے بھی کیری گرانٹ کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن وائلر نے ہیپ برن کی کم عمری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے زیادہ جوان گریگری پیک کا انتخاب کیا اور دونوں کی جوڑی فلم میں چاند سورج کو شرماتی نظر آتی۔ پیک اس دور میں کافی مشہور تھا جس کی وجہ سے ٹائٹل پر اس کا نام نمایاں تھا لیکن اس نے وائلر کو مشورہ دیا کہ وہ ہیپ برن کا نام اس کے برابر رکھے کیونکہ وہ ایک دن بہت بڑی اسٹار ہوگی۔ پیک کے مشورے کو مان کر وائلر نے اس کی ایڈورٹائزمنٹ بھی اسی انداز سے کی۔

1953 میں ریلیز ہونے والی اس فلم نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ناقدین اور مبصرین اسے دنیا کی بہترین اداکارہ کا درجہ دے رہے تھے اس فلم نے پہلے آسکر ایوارڈ کا حق دار بنا دیا۔ آڈری ہیپ برن اس فلم کے ساتھ ساتویں آسمان پر پہنچ چکی تھی۔ پیراماؤنٹ پکچرز نے اس سے سات فلموں کے لیے کنٹریکٹ سائن کرلیا۔ ولیم وائلڈر کی رومانٹک کامیڈی Sabrina میں اپنے دور کے مشہور اداکاروں ہمفری بوگارٹ اور ولیم ہولڈن کے مقابل پیش ہوئی اس کا کردار ایک شوفر کی معصوم لڑکی کا تھا جس کا دل جیتنے کے لیے دونوں بھائی ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس فلم میں بھی اس کی اداکاری جاندار تھی جسے بوگارٹ اور ہولڈن نے زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ اس فلم کو بھی اکیڈمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا جبکہ Bafta ایوارڈ سے نوازا گیا۔ نیویارک ٹائمز کے بوسلے کراؤتھر کے مطابق رومن ہالیڈے کے بعد ہیپ برن رکی نہیں تھی بلکہ اس کی رفتار میں مزید تیزی آ گئی تھی اور اس نے ایک معصومانہ کردار میں لاجواب اداکاری کی تھی۔ اس نے لکھا کہ رومن ہالیڈے کی پرنسز این سے بھی زیادہ ایک غریب شوفر کی لڑکی کے رول میں شہزادی نظر آتی تھی اور اس سے زیادہ اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔

ہیپ برن اسی سال براڈوے کے ایک اور کھیل میں میل فیرر کے ساتھ Ondine میں پیش ہوئی جو پیار کھونے اور پانے پر مبنی ایک ڈرامہ تھا اس میں بھی اس نے لاجواب اداکاری سے لوگوں کی

آنکھوں کو نم کر دیا۔ اس کی اداکاری پر تبصرہ کرتے ہوئے نیویارک ٹائمز نے لکھا کہ وہ اداکاری نہیں کرتی بلکہ وہی کیریکٹر بن جاتی ہے جو پبلک کے سامنے پلے کر رہی ہوتی ہے۔ وہ زیادہ ڈرامائی انداز اختیار نہیں کرتی بلکہ قدرتی انداز میں اپنے خیالات عوام تک پہنچاتی ہے۔ میل فیرر اور ہیپ برن اسٹیج پر کام کرتے ہوئے ایک دوسرے کے کافی قریب آ گئے تھے اور دونوں نے 25 ستمبر 1954 کو شادی کے بندھن میں بندھ جانا بہتر سمجھا۔ یہ شادی 14 سال بعد 5 دسمبر 1968 کو ختم ہوئی اس شادی سے اس کا ایک بیٹا سین ہیپ برن فیرر پیدا ہوا۔ اس کھیل میں کام کرنے پر اسے 1954 کا (Tony Award For Best Performance By A leading Actress In A play) ایوارڈ دیا گیا جو اس کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ اس سال رومن ہالیڈے کے لیے بھی بہترین ایکٹریس کا ایوارڈ اپنے نام کر کے وہ ان تین اداکاراؤں میں شامل ہوگئی جو ایک سال میں تین ایوارڈ جیت چکی تھیں۔ دوسری دو اداکارائیں شرلے بوتھ اور ایلن برنسٹین تھیں۔ اسے 1955ء میں بھی ورلڈ فلم فیورٹ فیمیل کا گولڈن گلوب ایوارڈ دیا گیا۔ اسے این فرینک کی سوانح عمری پر فلم اور براڈوے میں کام کرنے کی پیش کش ہوئی جسے اس نے قبول نہیں کیا۔ بعد میں ان کرداروں کو اسٹیج پر سزان اسٹراسبرگ اور فلم میں ملی پرکنز نے نبھایا۔

آڈری ہیپ برن اب ایک مشہور نام بن چکی تھی اور اس کی فلمیں باکس آفس پر دھوم مچا رہی تھیں اس نے 1957 میں اپنے شوہر میل فیرر اور ہنری فونڈا کے ساتھ لیو ٹالسٹائی کے ناول ''وار اینڈ پیس'' میں ایک بار پھر شہزادی نتاشا روستووا کا رول بڑی کامیابی سے ادا کیا جس کے بعد اسی سال ایک میوزیکل کامیڈی فنی فیس (Funny Face) میں اپنے ڈانس کی مہارت کا نمونہ پیش کیا۔ اس فلم میں اس کے مقابل فریڈ اسٹائرے تھا جو ایک فیشن فوٹوگرافر کا رول نبھا رہا تھا جسے ایک ایسی بک اسٹور کی کلرک لڑکی ملتی ہے جو اس کے جھانسے میں آ کر اس کے ساتھ پیرس گھومنے چلی جاتی ہے لیکن وہاں خوبصورت ماڈل بن جاتی ہے۔ اس نے (Love In The Aftermoon) میں بھی گیری کوپر اور مورس شیووالیئر کے ساتھ ایسا کامیڈی رول نبھایا۔ آڈری ہیپ برن نے 1959 میں (The Nun`s Story) میں سسٹر لیوک کا کردار نبھایا جس میں اس کے مقابل پیٹر فنچ تھا۔ اس میں ایک نن کی جدوجہد کی کہانی بیان کی گئی تھی جس میں کافی جذباتی لمحات آتے ہیں ان مناظر میں ہیپ برن نے حقیقت کا رنگ بھر دیا تھا جس پر اسے ایک بار پھر اکیڈمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا اور اس نے دوسرا BAFTA ایوارڈ اپنے نام کیا۔ Veriety کے ایک ریویو میں اس رول کے متعلق لکھا گیا کہ یہ رول ہیپ برن کی زندگی کا مشکل ترین رول تھا۔ جس کے ساتھ اس نے انصاف کیا اور زندگی کی بہترین پرفارمنس دی۔ Films in Review میں تبصرہ نگار نے سسٹر لیوک کی پرفارمنس کو لاجواب قرار دیتے ہوئے تحریر کیا کہ ہیپ برن نے یہ رول ادا کر کے اپنے ان نقادوں کو کرارا جواب دیا ہے جو اسے ایک اداکارہ کے بجائے ایک رکھ رکھاؤ والی لڑکی یا عورت سمجھتے ہیں۔ نن اسٹوری کی پرفارمنس کو اسکرین پر پیش کی جانے والی بہترین اداکاری میں سے ایک قرار دیا گیا۔ ہیپ برن نے خود ایک انٹرویو میں انکشاف کیا کہ اس کردار کو ادا کرنے کے لیے اس نے خاصی محنت کی تھی اور چرچ میں ننوں کے

ساتھ کئی ماہ گزارے تھے تاکہ اس کردار سے انصاف کر سکے۔ اس نے اسی سال انتھونی پرکنس کے ساتھ ایک رومانٹک فلم گرین مینشنز (Green Mansions) میں کام کیا اور ایک ایسی لڑکی ریما کا رول نبھایا جو دیہاتی ہوتے ہوئے وینزویلا کے ایک مسافر کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ 1960 میں برٹ لنکاسٹر اور لیلین گش کے ساتھ (The Unforgiven) میں اداکاری کی جو اس کی واحد ویسٹرن فلم تھی۔ وہ کرخت چہروں اور بات بات پر پستول نکالنے والوں کے درمیان واحد جدید تہذیب وتمدن کی نمائندہ لگتی تھی۔ یہ ایک ایسی کہانی تھی جس میں مقامی ریڈ انڈینز اور یورپ کے تارکین وطن کے درمیان تعصب کی کشمکش دکھائی گئی تھی۔ اس فلم کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ اس ماحول کو وہ زندگی بھر بھلا نہیں سکے گی کیونکہ یہ اس کی فطرت کے بالکل برعکس تھا۔ آڈری ہیپ برن نے 1960 میں اپنے بیٹے سین کی پیدائش کے تین ماہ بعد دوبارہ شوٹنگ میں حصہ لینا شروع کیا۔ 1961 میں بلیک ایڈورڈز کی فلم (Breakfast At Tiffany`s Truman Caote Novella) سے مستعار لی گئی تھی لیکن اس میں اتنی تبدیلیاں کی گئی تھیں کہ وہ چوں چوں کا مربہ بن کر رہ گئی تھی، ہیپ برن کے لیے بھی ٹفانی کا کردار موزوں نہیں تھا کیونکہ وہ میریلن منرو کو سامنے رکھ کر لکھوایا گیا تھا اور فلم میں مختصر سیاہ لباس زیب تن کرنے کو اس نے اپنی فلمی زندگی کا مشکل ترین لمحہ قرار دیا۔ ہیپ برن نے فلم کے پروڈیوسر مارٹی جیورو کے سامنے تسلیم کیا کہ وہ شوخ وشنگ حسینہ کا کردار تو ادا کر سکتی ہے لیکن کسی کال گرل کا کردار اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس فلم کو بھی اکیڈمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ اس نے 1961ء میں شرلے میکلن اور

جیمز گارنر کے ساتھ وائلر کی فلم (The Childern`s Hour) میں کام کیا لیکن موضوع کے اعتبار سے یہ فلم سوسائٹی میں پسند نہیں کی گئی اور اس کی ناکام فلموں میں سمجھی جاتی ہے۔ رومن ہالیڈے اور سبرینا میں ولیم وائلر ن ہیپ برن کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے کیری گرانٹ کو ہیرو بنانے سے معذوری ظاہر کی تھی لیکن 1963ء میں دونوں (Charade) میں نمودار ہوئے۔ اس وقت گرانٹ کی عمر 59 ویں سال میں تھا جبکہ ہیپ برن 34 برس کی ہو چکی تھی۔ فلم میں ہیپ برن نے ریجینا لیمپرٹ کا رول نبھایا جو ایک ایسی بیوہ خاتون کا تھا جس کا شوہر ایک بڑی رقم چرا کر قتل کیا جا چکا ہے اور اس رقم کے لیے اس کے پیچھے کئی لوگ پڑے ہوئے ہیں کہ وہ انہیں اس تک پہنچا دے۔ ہیپ برن نے اس رول میں بھی بہترین اداکاری کی اور تیسرا BAFTA ایوارڈ حاصل کیا۔ گرانٹ نے فلم کی تکمیل پر اس کے ساتھ ایک اور فلم میں کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

ہیپ برن نے 1964 میں اپنے دوسرے ہیرو ولیم ہولڈن کے ساتھ (Paris When It Sizzles) میں کام کیا لیکن یہ فلم بھی زیادہ تماشائیوں کی توجہ حاصل نہ کر سکی۔ مائی فیئر لیڈی میں بھی اس کا رول زیادہ بڑا نہیں تھا جس کے لیے اسے بہت تیاری کرنی پڑی تھی۔ ایلیزا ڈولٹل کا رول اس نے اچھے انداز میں نبھایا جس پر کافی ستائش ملی یہ ایک میوزیکل فلم تھی جس میں اس کے تمام گانے دوسروں کی آواز میں ڈب کیے گئے۔ 1966 میں اس کی فلم (How To Steal A Million) آئی جس میں اس کا ہیرو پیٹر اٹول تھا۔ اس فلم میں وہ ایک ایسے باپ کی بیٹی تھی جو خود کو ارب پتی آرٹ کلیکٹر ظاہر کرتا تھا لیکن اس کا تمام ذخیرہ جعلی نمونوں

پر مشتمل تھا۔ نکول اپنے باپ کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کے لیے پیٹر کے ساتھ مل کر ایک اصلی مورتی چرانے کا ڈرامہ کرتی ہے جس کی مالیت ایک ملین تھی۔ دو سال بعد اس کی فلم (Two For The Road) ریلیز ہوئی جس میں اسے ایک بار پھر گولڈن گلوب ایوارڈ، اکیڈمی ایوارڈ اور موشن پکچر میوزیکل، کامیڈی میں بہترین ایکٹریس کے لیے نامزد کیا گیا۔ فلم میں اس کے کردار اور اداکاری کو پسند کیا گیا۔

1967ء تک ہیپ برن اور میل فیرر کی شادی طلاق کے موڑ پر پہنچ چکی تھی جب اس نے Wait Until Dark میں کام کیا۔ یہ فلم میل فیرر بنا رہا تھا جس سے اس کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے اور سیٹس پر اپنا وقت ساتھی اداکارہ رچرڈ کرینا اور ڈائریکٹر ٹیرنیس ینگ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گزارتی تھی۔ فلم میں اس نے ایک اندھی خاتون سوزی ہینڈرکس کا کردار ادا کیا تھا جس کا شوہر غلطی سے کسی دوسرے کا سوٹ کیس لے آیا تھا جس میں جرائم پیشہ افراد کی دولت چھپی ہوئی ہے بدمعاش اس کا پتہ کرتے ہوئے اس کے گھر کے باہر وی میں آجاتے ہیں اور ان میں سے ایک ایک کر کے اس سے اس دولت کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے متعلق اسے کچھ علم نہیں تھا۔ یہ جرائم پیشہ افراد اسے بعد میں دھمکاتے ہیں اور جان سے مارنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ اپنی چالاکی سے انہیں ناکام بنا دیتی ہے اس فلم میں اس نے اندھی خوفزدہ عورت کا کردار نہایت خوبی سے ادا کیا تھا۔ وہ حقیقت میں نابینا لگتی تھی اور اس کے چہرے پر خوف جما ہوا دکھائی دیتا تھا جس پر اسے ایک بار پھر اکیڈمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا اس فلم میں بھی ناقدین اور مبصرین نے اسے بہترین کردار نگاری پر داد و تحسین پیش کی تھی۔ بوسلے کراؤتھر کے مطابق اس کی اداکاری میں کوئی جھول نہیں تھا،، وہ جس تیزی سے چہرے کے تاثرات تبدیل کرتی تھی اسے لاجواب ہی کہا جا سکتا ہے، ہیپ برن میل فیرر سے شادی ختم ہونے پر نہایت غمزدہ تھی۔ اس دوران اس کا وزن بھی پندرہ پاؤنڈ کم ہو گیا تھا وہ کچھ عرصے تک فلموں سے دور بھی رہی۔ اس نے اپنی فیملی کو زیادہ وقت دینے کی وجہ سے فلمی مصروفیات تقریباً ختم کر دی تھیں۔ 1976 میں جیمز بانڈ کے کردار کے لیے مشہور سین کونری کے ساتھ رابن اینڈ میرین میں جلوہ گر ہوئی ء جو باکس آفس پر کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی۔ 1979 میں ویٹ انٹل ڈارک کے ڈائریکٹر ٹیرنیس ینگ کے ساتھ انٹرنیشنل پروڈکشن بلڈ لائن میں کام کیا جس میں ایلن ارکن، بین گزارا، جیمز میسن اور رومی شنائیڈر شامل تھے۔ یہ فلم سڈنی شیلڈن کے ناول پر بنائی گئی تھی جس میں اس کا کردار ایک میچور خاتون کا تھا۔ فلم بین الاقوامی طور پر زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اس کی سولو ہیروئن کے طور پر 1981ء کی آخری فلم بین گزارا کے ساتھ (They All Laughed) تھی جسے پیٹر بوگڈانوچ نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ بوگڈانووچ کی گرل فرینڈ ڈورتھی اسٹریٹین کے قتل کی وجہ سے فلم کی ریلیز میں کافی تاخیر ہوئی تھی۔ 1987 میں رابرٹ ویگنر کے ساتھ لوامنگ تھیوز (Love Among Thieves) میں کام کیا جس میں اس کی گزشتہ فلموں شراڈ اور ہاؤ ٹو اسٹیل اے ملین کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی تھیں۔ 1988ء میں اسٹیو اسپیل برگ کی فلم Always میں ایک فرشتے کا چھوٹا سا رول ادا کیا۔

ہیپ برن نے اس کے بعد دو اور کمرشل فلموں میں اداکاری کی جن میں سے ایک

(Gardens of the World with Audrey Hepburn) پی بی ایس کی ڈاکومنٹری تھی جب کہ دوسری ایک گھنٹے کی ٹی وی سیریل (Audery Hepburn`s Enchanted Tales) تھی جو اس کی موت کے بعد ٹیلی کاسٹ کی گئی۔ اس سیریز کے لیے بھی اسے 1993 کا EMMY ایوارڈ دیا گیا جبکہ (Best Spoken Word Album For Childerns) کے لیے اسے Grammy ایوارڈ کا حق دار جانا گیا وہ اپنی موت کے بعد دو ایوارڈ کی حق دار قرار پائی جانے والی پہلی ایکٹریس قرار پائی۔

آڈری ہیپ برن حقوق انسانی کی بہت بڑی داعی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں دوسری جنگ عظیم کا پر آشوب دور دیکھا تھا جسے وہ کبھی بھلا نہ پائی تھی۔ اس کے دو سوتیلے بھائی نازی جرمنوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے تھے ایک کو نازی بیگار کیمپ میں بھیج دیا گیا تھا جبکہ دوسرا زیر زمین چلا گیا تھا۔ اس کے ایک چچا کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ وہ خود بھی غذائی قلت کا شکار ہوئی تھی جسے وہ ہمیشہ یاد کرتی تھی۔ ایک انٹرویو کے دوران اس نے بتایا کہ ایک اسٹیشن پر اس نے یہودیوں کو گاڑی میں ٹھونس کر بیگار کیمپ جاتے دیکھا جو بڑا دل دہلا دینے والا منظر تھا۔ اس نے ایک ہم عمر لڑکے کو دیکھا جو اپنے قد سے بڑا اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا، نازیوں نے اس بچے کو بھی بے دردی سے ٹرین میں دھکیل دیا۔ آڈری کے مطابق وہ ایک بچی تھی اور ایک اپنے ہی جیسے بچے پر ظلم ہوتے دیکھ رہی تھی، یہ بچہ اس کے ذہن پر چپک کر رہ گیا تھا اور وہ اکثر اسے یاد کرتی تھی۔ وہ اپنے مصروف ترین دور 1950 اور 1954 میں بھی انسانی فلاح و بہبود کے کاموں کے لیے وقت نکال لیتی تھی لیکن فلموں سے علیحدگی کے بعد اس نے خود کو انہی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ اسے یو این او کے ادارے یونیسیف کا اعزازی سفیر بنایا گیا اور امریکی صدر جارج بش نے بہترین فلاحی کاموں کے لیے صدارتی میڈل فار فریڈم دیا۔ اس کے ساتھ رہنے والے لوگ اچھی طرح واقف تھے کہ وہ ایک دردمند دل رکھتی ہے اور دنیا کے بچوں کو بھوکا پیاسا دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ اس نے دوسری جنگ عظیم میں تذلیل انسانیت کے جو روح سوز مناظر دیکھتے تھے انہیں وہ کبھی بھول نہ پائی تھی اور یہ اس کی دکھی انسانیت سے قربت کا بہترین ذریعہ تھے۔ اس نے ایتھوپیا، ترکی وینزویلا، ایکواڈور، ہونڈراس، گوئٹے مالا، سوڈان ویت نام، بنگلہ دیش اور صومالیہ وغیرہ میں لوگوں کی بہت مدد کی۔ لوگ اسے یونیسیف کے نام سے پہچاننے لگے تھے۔ سوڈان میں ایک واٹر پمپ کو لوگوں نے یونسیف کے نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا جسے انسانی خدمت کی معراج ہی کہا جا سکتا ہے۔ آڈری ہیپ برن نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اس کے ماں باپ میں اس وقت علیحدگی ہو گئی تھی جب وہ اسکول گرل تھی۔ اس کی ماں نے جنگ عظیم کے آفت زدہ دور میں خاندان کو بکھرنے سے بچانے کے لیے معمولی ملازمت سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس کا باپ رسٹن انہیں چھوڑ کر کہیں گم ہو گیا تھا جسے اس نے بڑی مشکل سے ڈھونڈ نکالا اور اس کی موت تک خدمت کی۔ 1952 میں اس کی جیمز ہینسن سے شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور شادی کا لباس تک تیار ہو چکا تھا لیکن اس نے یہ سوچ کر انکار کر دیا کہ دونوں مصروفیت کی وجہ سے گھر داری کے لیے وقت نہیں نکال پائیں گے۔ اس اپنے ہیئر اسٹائلسٹ مائیکل بٹلر سے بھی معاشقہ چلا اور رومن ہالیڈے کی شوٹنگ کے دوران گریگری پیک بھی اس کا محبوب رہا لیکن دونوں اس سے انکاری



رہے ۔ اس بارے میں اس کا کہنا تھا کہ ہیرو اور ہیروئن کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا لازمی ہے کیونکہ وہ اس کے بغیر کردار میں جان نہیں ڈال سکتے۔اس نے میل فیرر سے شادی کی جو چودہ سال تک قائم رہی۔اس شادی کے ٹوٹنے کا اسے بڑا غم تھا اس کی ماہر نفسیات اینڈری ڈوٹی سے ملاقات ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ۔ 18 جنوری 1969 کو دونوں رشتہ ازواج میں منسلک ہوگئے ۔8 فروری 1970 کو ان کا بیٹا لیو پیدا ہوا، اس کی یہ شادی تیرہ سال قائم رہی جس کے بعد اس نے شادی نہیں کی لیکن ڈچ اداکار رابرٹ وولڈر کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے زندگی گزارتی رہی۔ دونوں نے شادی نہیں کی۔ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ وہ اور وولڈرز شادی کر چکے تھے لیکن اسے رجسٹر نہیں کرایا۔ ہیپ برن نے فلموں میں آنے سے پہلے دوران اور بعد میں بھی فیشن کی دنیا میں انقلاب برپا کیے رکھا۔اس کے ہیر اسٹائلسٹ اور ڈریس ڈیزائنر نے اسے دنیا کی مقبول ترین ماڈل بنا دیا تھا۔اس کی موت کے بعد بھی اس کے بناؤ سنگھار کی باتیں ہوتی رہیں۔ شرلے میکلین ایک اچھی اداکارہ اور ماڈل تھی لیکن اس کا کہنا تھا کہ وہ ہیپ برن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور اس کے سامنے ایک دیہاتن نظر آتی تھی۔ ہیپ برن کو فلاح و بہبود کے کاموں کے لیے بہت زیادہ مصروف رہنا پڑتا تھا ۔ستمبر 1992 میں صومالیہ سے واپسی پر اسے پیٹ میں درد کی شکایت ہوئی جو کینسر کی ابتدائی علامت تھی اس کے متعدد آپریشن ہوئے لیکن مرض بڑھتا گیا۔ اور آخر کار 20 جنوری 1993 کو 4 مئی 1929ء کو شروع ہونے والا شہزادی کی کہانی انجام کو پہنچ گئی ۔ اس کی موت کا دنیا بھر میں غم منایا گیا۔اس کی قبر کے سرہانے گریگری پیک نے رابندر ناتھ ٹیگور کی نظم Unending Love پڑھی جو اسے بہت پسند تھی ۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے اس کے جنازے میں شرکت کی جن میں شہزادہ صدرالدین آغا خان بھی شامل تھے جبکہ ہالینڈ کے شاہی خاندان نے اس کے لیے پھول بھیجے۔ دنیا میں اداکار آتے جاتے رہیں گے لیکن ہیپ برن جیسی دلکش شخصیت معصوم چہرے اور خوبصورت مسکراہٹ والی اداکارہ کی کمی کوئی پوری نہ کر سکے گا۔

☆☆☆

طویل بدیسی کہانی

بارش

ترجمہ: **نجیب عمر**

نامور ادیب سمرسٹ ماہم کی ایک یادگار تحریر



مسلسل سمندری سفر کے بعد ساحل کا منظر بڑا دلکش ہوتا ہے۔ دراصل انسان یکسانیت سے جلد اُکتا جاتا ہے اور یہی ڈاکٹر میکفیل کے ساتھ بھی تھا۔ سونے سے قبل اس نے اپنا پائپ سلگایا اور عرشے کی ریلنگ پر جھک کر متوقع ساحل پر ستاروں کے اس جھرمٹ کو تلاش کرنے لگا جسے جنوبی کہکشاں (Southren Cross) کہا جاتا ہے۔ وہ دو سال جنگی محاذ پر گزار کر ایک زخم لے کر لوٹا تھا جس کے مندمل ہونے میں معمول سے زیادہ وقت صرف ہوا۔ اب وہ بارہ مہینے سے ''آپیا'' Apia میں سکونت پذیر تھا اور نئے سفر کے لیے خود کو تیار پا رہا تھا۔ آئندہ کل کچھ مسافر ''پاگو پاگو'' میں اترنے والے تھے لہٰذا الوداعی پارٹی کے طور پر لوگ ڈانس کی ایک چھوٹی محفل سجائے ہوئے تھے۔ میکانیکل پیانو کی بھدی آواز اس کے کانوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ ایک وقفے کے بعد عرشے پر سکوت ہو ہی گیا۔ اس نے اپنی بیگم کو آرام کرسی پر لیٹے ڈیوڈسن جوڑے سے بات کرتے دیکھا اور چہل قدمی کرتا ان کے قریب چلا گیا۔

روشنی کے نیچے بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا ہیٹ اتار لیا۔ اس کے بال نہایت سرخ درمیان میں گنج کا چاند بھورے دھبوں سے پُرنمایاں تھا۔ وہ چالیس سال کا دبلا پتلا، سکڑا ہوا چہرہ، کافی حد تک ناصحانہ، دھیمے دھیمے اسکاٹ لہجے میں گفتگو کرنے والا شخص تھا۔

میکفیل جوڑے اور ڈیوڈسن جو مشنری تھے۔ ان کے درمیان تعلقات کی بنا جہاز کا ہم سفر ہونا تھا۔ یہ رشتہ کسی خاص معاشرتی مذاق کی بنا پر نہیں تھا۔ ان کے درمیان قدرِ مشترک ان لوگوں کی مخالفت تھی جو سارا دن اور ساری رات اسموکنگ روم میں پوکر یا برج کھیلتے یا شراب پیتے۔ بیگم میکفیل اس بات کو ہرگز وجۂ افتخار نہیں سمجھتی تھی کہ ڈیوڈسن جوڑا تمام مسافروں میں صرف اس سے اور اس کے ڈاکٹر شوہر سے ملنا پسند کرتے تھے جو شرمیلا تو یقیناً تھا لیکن احمق نہیں۔ وہ اس ستائش کو کسی حد تک قبول کر لیتا تھا۔ ساتھ ہی جرح کرنے والا ذہن بھی رکھتا تھا لہٰذا وہ خود کو رات کیبن میں شکایت کی اجازت دیتا۔

بیگم میکفیل اپنے شوہر کو بتا رہی تھی کہ بیگم ڈیوڈسن تنہائی کا شکار ہے۔ جہاز کے کسی مسافر سے ان کے تعلقات نہیں ماسوائے ہمارے...... اور وہ فکرمند ہے کہ یہ سفر کیوں کر مکمل ہوگا۔

ڈاکٹر نے بیگم کو سمجھایا کہ مشنریوں کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔ بیگم نے فوراً کہا ''بات اہمیت کی نہیں۔ وہ کس طرح اسموکنگ روم کے اوباش لوگوں سے ملیں جلیں''۔

ڈاکٹر نے ہنس کر کہا ''ان کے مذہب کا بانی ایسا گھمنڈی نہیں تھا۔''

بیگم بھڑک اٹھی۔ ''ایلک! میں نے تمہیں بار بار مذہب کا مذاق اڑانے سے منع کیا ہے۔ میرا مزاج تم سے مختلف ہے۔ تمہیں کسی میں اچھائی نظر نہیں آتی۔''

اس نے بیگم کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا لیکن خاموش رہا۔ شادی شدہ زندگی کے طویل تجربے نے اسے سکھا دیا تھا کہ ازدواجی سکون کے لیے خاموشی سب سے بہترین نسخہ ہے۔ وہ جلد کپڑے بدل کر اوپر والی برتھ پر دراز ہو گیا۔

صبح جب وہ عرشے پر آیا تو ساحل قریب تھا۔ چاندی کی طرح چمکتا کنارہ جہاں سبزے سے لدی پہاڑیاں اُبھرتی جا رہی تھیں۔ گھنے اور سبز

ناریل کے درخت جو ساحل کے چھور تک اُگے ہوئے تھے اور اس کے درمیان ساموان Samoan کے گھاس پھوس کے مکان اور جگہ جگہ دھندلے سفیدی کا لبادہ اوڑھے چھوٹے چھوٹے چرچ۔ بیگم ڈیوڈسن اس کے برابر آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے سیاہ لباس زیب تن کیا ہوا۔ گلے میں طلائی چین پڑا ہوا جس کے ساتھ ایک چھوٹی سی صلیب جھول رہی تھی۔ وہ ایک پستہ قد خاتون تھی۔ بھورے چمک سے عاری بالوں کو عمدگی سے ترتیب دیا ہوا تھا۔ ناک میں پھنسنے والے چھوٹے سے چشمے کے پیچھے اس کی نیلی آنکھیں نمایاں تھیں۔ اس کا چہرہ لمبوترا لیکن اس سے ہرگز حماقت نہیں بلکہ انتہائی چابکدستی سی جھلکتی تھی جیسے پرندے کا پھرتیلا پن۔ اس کی شخصیت کا قابلِ ذکر پہلو گھلاوٹ کے بغیر اس کی پاٹ دار آواز۔ کانوں پر کسی خود کار ڈرل کی بے رحم آواز کی طرح جو اعصاب کو جھنجوڑ دے۔

ڈاکٹر میکفیل نے اپنی باریک پیچیدہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔ ''یہ آپ کو یقیناً اپنے گھر کی طرح محسوس ہو رہا ہوگا۔''

آپ جانتے ہیں ہمارے جزیرے ان کورال کی طرح بلند نہیں۔ یہ آتش فشانی ہیں۔ ہمیں اپنے جزیرے تک پہنچنے میں مزید دس دن لگیں گے۔

میکفیل نے تمسخر کے ساتھ کہا ''یہ فاصلے ایسے ہیں جیسے گھر کی ساتھ والی گلی۔''

''یہ تو انتہا پسندی ہوئی مگر آپ کا کہنا اس حد تک درست ہے کہ ساؤتھ سیز کے لوگ فاصلوں کو ذرا مختلف نظر سے دیکھتے ہیں۔'' بیگم ڈیوڈسن نے قدرے ناگواری سے کہا۔

ڈاکٹر نے خاموشی سے ایک آہ بھری۔

وہ بولتی گئی ''میں خوش ہوں کہ یہاں قیام نہیں کرنا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ کام کرنے کے لیے یہ خوفناک حد تک مشکل علاقہ ہے۔ جہازوں کا آنا جانا یہاں کے باشندوں کو پریشان کرتا ہے۔

پھر یہاں نیول اسٹیشن ہے جو مقامی لوگوں کے لیے بہت ہی برا ہے۔ ہمیں اپنے علاقے میں ایسی مشکلیں برداشت نہیں کرنا پڑتیں۔ وہاں ایک دو تاجر ہوتے ہیں جنھیں ہم قابو رکھتے ہیں ورنہ ماحول کو اتنا گرم کر دیتے ہیں کہ وہ علاقہ چھوڑنے ہی میں عافیت جانتے ہیں۔''

ناک پر مختصر چشمہ جماتے ہوئے اس نے سرسبز جزیرے کو بے رحم نگاہوں سے دیکھا۔

''یہاں مشنریوں کے لیے کام کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ خدا کا ہزار بار شکر کہ ہم یہاں تعینات نہیں ہیں۔''

ڈیوڈسن کا علاقہ ساموان Samoan کے جزیروں پر مشتمل ہے وہ بہت دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے چھوٹی کشتی لے کر متواتر ان کے درمیان آنا جانا پڑتا ہے ایسے موقعوں پر اس کی بیگم ہیڈ کوارٹر میں رہ کر مشن مہارت سے چلاتی ہے۔ ڈاکٹر کا یہ سوچ کر دل ڈوبنے لگا کہ بیگم ڈیوڈسن کس مہارت سے مشن چلاتی ہوگی۔

اس خاتون نے مقامی لوگوں کی بے راہ روی کے متعلق کچھ اس طرح کہا جس سے ظاہر تو کچھ نہیں ہوا لیکن اسے چھپانے کا خوف پوری طرح شامل تھا جو یقیناً تجسس کو ابھارتا تھا۔ نزاکتِ احساس اس میں ذرا کم تھی لہٰذا وہ پھر گویا ہوئی۔

''آپ کو بتاؤں جب ہم پہلی مرتبہ ان علاقوں میں گئے تو ان کی شادی کے رسم و رواج

ہمارے لیے نہایت تعجب خیز تھے۔ شاید میں آپ کے سامنے بیان نہ کرسکوں آپ کی بیگم کو بتا دوں گی ان سے سن لیجیے گا۔''

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے اپنی بیگم اور بیگم ڈیوڈسن کو عرشے پر کرسیاں قریب کیے بیٹھے دیکھا۔ ان کی گفتگو کوئی دو گھنٹے تک جاری رہی۔ ورزش کرتے ہوئے وہ ان کے قریب سے آتا جاتا رہا۔ وہ بیگم ڈیوڈسن کو احتجاجی کانا پھوسی کرتے دیکھتا رہا۔ جیسے دور سے آتی کوہستانی طوفان کا شور۔ اپنی بیگم کے زرد چہرے اور کھلے ہوئے منہ سے اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ اس چونکا دینے والے تجربے سے محظوظ ہو رہی ہے۔ رات اس نے کیبن میں اپنے شوہر کے سامنے چڑھتی سانسوں کے ساتھ وہ سب کچھ دہرایا جو اس نے بیگم ڈیوڈسن سے سنا تھا۔

صبح بیگم ڈیوڈسن پرجوش طریقے سے چلائی

''ڈاکٹر میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ تم نے اس سے زیادہ وحشت ناک بات کبھی سنی تھی۔ تمہیں حیرت نہیں ہو رہی کہ تم ایک ڈاکٹر ہو۔ اس کے باوجود بھی میں تمہیں وہ سب بتانے کی ہمت نہیں کرسکی۔''

بیگم ڈیوڈسن نے ڈاکٹر کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اس میں یہ دیکھنے کا ایک ڈرامائی شوق تھا کہ اس نے حسب منشا تاثر قائم کرلیا ہے۔

کیا تم یقین کرو گے۔ جب ہم وہاں گئے تو ہمارے دل جیسے بیٹھ گئے۔ ہمیں یہ جان کر حیرت ہوئی وہاں کسی بھی گاؤں میں ایک ''اچھی'' لڑکی تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے لفظ ''اچھی'' بڑے پُرمعنی انداز میں ادا کیا تھا۔

میں نے اور ڈیوڈسن نے اس پر کافی غور کیا۔ ہم نے اپنا ذہن بنالیا کہ پہلی چیز جس پر عمل کیا جائے وہ ان کے ڈانسنگ کو روکنا ہے۔ مقامی لوگ اس کے بڑے دیوانے تھے۔

میں بھی جوانی کے دنوں میں اس کا مخالف نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے ڈانس کی حمایت میں اتنا کہہ ڈالا۔

میں نے اندازہ لگالیا تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ تم نے اپنی بیگم سے ڈانس کی ایک باری کی درخواست کی تھی۔ کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ ڈانس کرے تو مضائقہ نہیں۔ اور مجھے اطمینان ہوا کہ اس نے یہ بھی قبول نہیں کیا۔ میرے خیال میں ان حالات میں خود کو اپنے تئیں رکھنا ہی مناسب ہے۔

''کن حالات میں؟'' ڈاکٹر نے سوال کیا۔

اس نے اپنے ناک پر ٹکے چشمے سے ڈاکٹر پر ایک نظر ڈالی لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

''لیکن سفید فام لوگوں کے درمیان ایسا نہیں ہے''۔ اس نے مزید کہا۔ ''میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں اپنے شوہر ڈیوڈسن سے متفق ہوں جو یہ کہتا ہے کہ ایک شخص کس طرح اپنی بیوی کو دوسرے کی بانہوں میں جھولتے دیکھ سکتا ہے۔ اس کی سمجھ سے باہر ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے شادی کے بعد میں نے کبھی ڈانس کا ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔ لیکن مقامی رقص تو ایک اور ہی معاملہ ہے۔ نہ صرف بذات خود اخلاق سوز ہے بلکہ یہ بد اخلاقی کی طرف لے جاتا ہے۔ بہر حال میں خدا کی شکر گزار ہوں کہ اپنے علاقے میں ہم نے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں بھی

عار نہیں کہ ہمارے علاقے میں آٹھ سال سے کسی نے ڈانس نہیں کیا۔

اب ان کا جہاز بندرگاہ کے دہانے سے آ لگا تھا اور بیگم میکفیل بھی ان میں شامل ہو گئی۔ جہاز تیزی سے موڑ کاٹنے کے بعد آہستہ آہستہ داخل ہونے لگا۔ یہ خشکی سے گھری ہوئی بڑی بندرگاہ تھی۔ اتنی بڑی کہ ایک جنگی بحری بیڑے کو آسانی سے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ سرسبز، بلند اور نوکیلی پہاڑیاں چاروں طرف سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ مدخل کے اندر ایسی ہوا تھی جیسے سمندر سے آ رہی ہو۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ایک باغ میں گورنر ہاؤس تھا جہاں خوشگوار سمندری ہوا پہنچ رہی تھی اور جہاں امریکی پرچم اسٹار اینڈ اسٹرائپس ایک کھمبے پر لٹک رہا تھا اور ہوا تیز نہ ہونے کی وجہ سے ہلکے ہلکے ہل رہا تھا۔ اب وہ دو اور تین منزلہ بنگلوں اور ایک ٹینس کورٹ سے گزرتے ہوئے گوداموں تک آ گئے کہ ڈیوڈسن نے کچھ دور لنگر انداز اس اسکونر کی طرف اشارہ کیا جو انہیں آپیا لے جانے والا تھا۔ شور مچاتے خوش مزاج مقامی لوگوں کی ایک بھیڑ اکٹھی ہو گئی تھی جو جزیرے کے تمام علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ کچھ تجسس کی بنا پر اور کچھ سڈنی جانے والے مسافروں سے سودا کرنے۔ ان کے ہاتھوں میں اناناس، کیلوں کے گچھے، شراب کی بوتلوں پر لپیٹنے والے کپڑے۔ سیپیوں اور شارک کے دانتوں کی مالا، کاوا کے پیالے، جنگی کشتیوں کے نمونے، ان کے درمیان صاف ستھرے، پھرتیلے' کلین شیو اور کھلے چہروں والے امریکی بحریہ کے سپاہی' راہ بناتے ہوئے کارندوں کا ایک گروپ بھی ان کے درمیان۔ جب ان کا سامان اتارا جا رہا تھا۔

میکفیل جوڑا اور بیگم ڈیوڈسن مجمع کا جائزہ لیتے رہے۔ ڈاکٹر میکفیل نے بیشتر بچوں اور لڑکوں کو جلدی بیماریوں میں مبتلا پایا۔ اذیت سے مرجھائے ہوئے جیسے السر نے بے جان کر دیا ہو۔ اس کی پیشہ ورانہ نگاہیں چمک اٹھیں جب اس نے پہلی مرتبہ فیل پا کے ایسے مریض دیکھے جو اپنے پھولے ہوئے ہاتھ اور پیر کو مشکل سے گھسیٹ پا رہے تھے۔ خواتین اور مرد لاوا لاوا (لنگی) باندھے ہوئے تھے۔

بیگم ڈیوڈسن نے کہا "یہ ایک بے ہودہ لباس ہے۔ میرے شوہر اس لباس پر قانوناً پابندی لگوانا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں سے با اخلاق ہونے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں جب وہ سرخ کاٹن کی پٹی کے علاوہ کسی اور چیز سے اپنی شرم گاہوں کو نہ چھپائیں۔

ڈاکٹر نے اپنے سر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا کہ یہ لباس موسم کے لحاظ سے انتہائی مناسب ہے۔

ابھی جب وہ لوگ یہاں اترے تھے، اگرچہ صبح کا آغاز تھا لیکن گرمی نے انہیں بے حال کر دیا تھا۔ پہاڑیوں سے گھرا ہوا علاقہ۔ ہوا کی ایک لہر تک پاگو پاگو میں نہیں آ رہی تھی۔

بیگم ڈیوڈسن اپنی پاٹ دار آواز میں بولتی گئی "ہمارے علاقہ میں ہم نے لاوا لاوا (Lava lava) کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ کچھ بوڑھے لوگ ہی اب اسے استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ اب تمام خواتین ڈھیلا ڈھالا جمپر استعمال کرتی ہیں اور مرد حضرات پتلون یا ڈانگری استعمال کرتے ہیں۔ شروع ہی میں ڈیوڈسن نے اپنی رپورٹ میں

بتا دیا تھا کہ دس سال سے بڑے لڑکے جب تک پتلون نہ پہنیں گے انہیں کبھی پوری طرح عیسائی نہیں بنایا جا سکتا۔

بیگم ڈیوڈسن نے گہرے چھائے بادلوں پر طائرانہ نگاہیں ڈالیں جو بندرگاہ کے مدخل کی جانب اڑتے چلے آ رہے تھے اور چند قطرے گرنے بھی لگے۔ اس نے کہا ''ہمیں شیڈ کے نیچے چلا جانا چاہیے''۔

وہ مجمع کے ساتھ راستہ بناتے سائبان میں آ گئے جو بل کھائے لوہے کی چادروں سے بنا تھا۔ ساتھ ہی طوفانی بارش کا آغاز ہو گیا۔ وہ کچھ دیر کھڑے رہے حتیٰ کہ ڈیوڈسن بھی ان میں شامل ہو گیا۔ وہ میکفیل کے ساتھ پورے سفر کے دوران میں نرم گوئی اختیار کیے رہا لیکن اسے اپنی بیگم کی خوش دلی حاصل نہ تھی لہٰذا وہ زیادہ وقت مطالعہ میں گزارتا۔ وہ ایک خاموش طبع اور الگ تھلگ رہنے والا شخص تھا۔ صاف محسوس ہوتا کہ عیسائی ہونے کی بنا پر اس نے اپنے اوپر شائستگی تھوپ رکھی ہے۔ وہ فطرتاً کم آمیز اور روکھا تھا۔ اس کا ظاہر تنہا تنہا سا تھا۔ وہ بہت لمبا اور دبلا پتلا تھا۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں اس کے دھڑ سے ڈھیلے ڈھالے لٹکتے نظر آتے۔ پچکے ہوئے گال اس پر ابھری ہوئی ہڈیاں جو اس کے تجسس کے غماز تھے۔ اس کے ظاہرہ پر مردنی چھائی رہتی لیکن اس کے مضبوط اور زندگی سے بھرپور ہونٹ...... آپ کو حیرت میں ڈال دیں گے۔ اس کے بال لمبے اور آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ لیکن بڑی غم آلود تھیں۔ لمبی انگلیوں کے ساتھ اس کے ہاتھوں کو جیسے احتیاط سے تراشا گیا ہو۔ اس سے اس کی طاقت کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن اس کی شخصیت کی سب سے چونکا دینے والی چیز ایک دبی ہوئی آگ کا تاثر ہے۔ جو آپ اسے دیکھتے ہی محسوس کر لیتے ہوں۔ ایک جانب متاثر کن تو دوسری جانب تکلیف دہ حد تک مبہم تھی۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا جس کے ساتھ آسانی سے تعلقات استوار کیے جا سکتے۔

وہ ایک ناخوشگوار خبر ساتھ لایا۔ جزیرے میں Kanakas کے درمیان چیچک کا متعدی مرض پھیل گیا ہے۔ جو خطرناک اور مہلک بھی ہے۔ چھوٹے جہاز کے عملے میں ایک شخص اس مرض میں مبتلا ہو گیا ہے جو انہیں آگے سفر میں لے کر جانے والا تھا۔ مریض کو ساحل پر لا کر نگہداشت کے مرکز میں رکھا گیا ہے۔ آپیا سے برقی پیغام آیا ہے کہ جہاز کو اس وقت تک سفر شروع کرنے کی اجازت نہ دی جائے جب تک یہ یقین نہ کر لیا جائے کہ عملے کا ایک بھی شخص اس مرض سے متاثر نہیں ہے۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں کم از کم دس روز مزید یہاں رکنا پڑے گا''۔ ڈاکٹر میکفیل نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا ''میرا فوری آپیا پہنچنا نہایت ضروری ہے''۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا، اگر جہاز پر مزید کوئی شخص اس مرض میں مبتلا نہیں پایا گیا تو جہاز کو صرف گورے مسافروں کے ساتھ روانگی کی اجازت مل سکتی ہے۔ جب کہ مقامی لوگ تین ماہ تک سفر نہیں کر سکیں گے۔

بیگم میکفیل نے دریافت کیا کہ کیا یہاں کوئی ہوٹل ہے۔

ڈیوڈسن نے ہنس کر کہا ''نہیں''۔

پھر ہم کیا کریں گے؟

''میں نے گورنر سے بات کی ہے۔ یہاں

ایک تاجر ہے جس کے پاس کمرے ہیں اور وہ انہیں کرائے پر دیتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ جیسے ہی بارش رکے ہمیں جا کر دیکھنا چاہئے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آرام کی توقع مت کریں۔ اگر سونے کے لیے بستر اور سروں پر چھت مل جائے تو ہمیں شکر گزار ہونا چاہئے۔''

لیکن بارش کے رکنے کا کوئی امکان نہیں تھا لہٰذا کچھ دیر بعد وہ چھتریوں اور برساتیوں میں نکل پڑے۔ یہ کوئی شہر نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے سرکاری عمارتوں کا ایک جھنڈ۔ ایک یا دو اسٹور، پشت پر ناریل کے درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان چند مقامی لوگوں کی رہائش۔ ان کے لیے جو مکان تجویز کیا گیا وہ ساحل سے پانچ منٹ کی مسافت پر تھا۔ یہ ایک دو منزلہ فریم کا مکان تھا۔ دونوں منزلوں پر کشادہ برآمدہ اور بل کھائے لوہے کی چادروں کی چھت۔ مالک دوغلی نسل کا تھا جس کا نام ھارن تھا۔ اس کی ایک مقامی بیوی رنگ دار بچوں میں گھری ہوئی تھی۔ سطحی منزل پر ایک اسٹور تھا جہاں ڈبوں میں بند اشیاء اور کاٹن فروخت ہوتا تھا۔ جو کمرہ اس نے انہیں دکھایا وہ فرنیچر سے تقریباً عاری تھا۔ میکفیل کے کمرے میں سوائے ایک خستہ استعمال شدہ بستر اور پھٹی ہوئی مچھر دانی، ٹوٹی پھوٹی کرسی اور اسٹینڈ پر رکھا ہاتھ دھونے کا پیالہ۔ انھوں نے مایوسی سے چاروں طرف دیکھا۔ بارش بلا رکے برس رہی تھی۔

بیگم میکفیل نے کہا ''میں انتہائی ضروری چیزوں کے علاوہ سامان میں سے کچھ نہیں کھولتی۔''

بیگم ڈیوڈسن اس کے کمرے میں آئی جب وہ ایک بڑا سفری تھیلا کھول رہی تھی۔ اس آزردہ ماحول کے باوجود وہ بہت زیادہ چاق و چوبند تھی۔

اگر تم میرا مشورہ مانو تو تم ایک سوئی اور دھاگا لے کر فوراً مچھر دانی کی مرمت شروع کر دو ورنہ تم آج رات نیند کی ایک جھپک نہیں لے سکو گی۔

ڈاکٹر میکفیل نے دریافت کیا'' کیا یہ اتنے خبیث ہوتے ہیں''؟

''یہ ان کا موسم ہے۔ جب تم آپیا کے گورنر ہاؤس کی پارٹی میں شریک ہو گے تم دیکھنا خواتین کو ہاتھوں اور پیروں کو ڈھانپنے کے لیے غلاف دیا جائے گا۔''

''میں چاہتی ہوں بارش تھوڑی دیر کو رک جائے''۔ بیگم میکفیل نے کہا۔

''اگر سورج نکلا ہوا ہو تو میں اس جگہ کو آرام دہ بنانے میں زیادہ دل جمعی سے کوشش کر سکوں گی''۔

''اگر تم ایسا چاہتی ہو تو تمہیں طویل انتظار کرنا ہوگا۔ پاگو پاگو بحرالکاہل کا سب سے زیادہ بارش آور علاقہ ہے۔ یہ خلیج اور یہ سرسبز پہاڑیاں پانی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ سال کے ان دنوں یہاں مسلسل بارش کی توقع کی جاتی ہے''۔

اس نے اپنی نظریں میکفیل سے ہٹا کر اس کی بیوی پر ڈالی۔ جو کمرے کے مختلف حصوں پر جا کر رک رک جاتی۔ اس کی وحشت صاف ظاہر تھی۔ ایک آوارہ روح کی طرح اس نے اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ اس نے چاہا کہ سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ کمزور اور مدد کے طالب لوگوں نے اسے جذباتی کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کھجلی ہوتی کہ وہ ہر چیز کو ترتیب دے دے۔ یہ اس کی فطرت کا تقاضا تھا۔

''تم مجھے سوئی اور دھاگا دے دو میں تمہاری مچھر دانی کی مرمت کر دیتی ہوں اور تم جا کر دوسری چیزیں کھول لو۔ کھانا ایک بجے ہے۔ ڈاکٹر تم گودی میں جا کر اپنے سامان کو دیکھ آؤ کہ انہیں کسی خشک جگہ پر رکھا گیا ہے یا نہیں۔ تم ان مقامی لوگوں کو نہیں جانتے یہ لاپروا لوگ ہیں یہ سامان ایسی جگہ رکھ دیں گے جہاں وہ مستقل بارش میں بھیگتے رہیں''۔

ڈاکٹر نے اپنی برساتی دوبارہ پہن لی اور سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ دروازے پر ہارن کوارٹر ماسٹر کے ساتھ بات چیت کرتے کھڑے تھے۔ جو ابھی ابھی اندر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک سیکنڈ کلاس کا مسافر بھی تھا' جسے ڈاکٹر نے جہاز پر کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ کوارٹر ماسٹر ایک چھوٹا سا ٹھٹھرا ہوا شخص تھا۔ انتہائی گندہ، اسے دیکھ کر سر ہلایا اور بولا۔

''ڈاکٹر...... چیچک ایک موذی مرض ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ نے اوپر جگہ لے رکھی ہے''۔

ڈاکٹر نے سوچا غالباً وہ کافی مشہور ہے لیکن وہ ایک بزدل بھی ہے لہٰذا آسانی سے حملہ نہیں کرتا۔

''جی ہاں ہم نے اوپر ایک کمرہ حاصل کر لیا ہے''۔

''مس تھامپسن آپ لوگوں کے ساتھ آپیا تک سفر کر رہی ہیں لہٰذا میں انھیں بھی یہاں لے آیا ہوں'' وہ ۲۷، سال کے لگ بھگ تھی۔ گداز جسم کی مالک۔ سستے فیشن کے باوجود کافی جاذب نظر تھی۔ اس کی بھری بھری پنڈلیاں سفید بوٹ کے اوپر سفید موزے کے اندر سے بھی چمک رہی تھیں۔ بوٹ پر پَر مزّین تھے۔ اس نے ڈاکٹر کی جانب ایک خوشامدانہ مسکراہٹ اُچھال دی۔

''یہ ظالم مجھے ایک حقیر سے چھوٹے کمرے کے لیے ڈیڑھ ڈالر یومیہ کے خرچ میں ڈبو دینا چاہتے ہیں۔'' اس نے گلوگرفتہ آواز میں کہا۔

''جو میں تمہیں بتائے دیتا ہوں'' کوارٹر ماسٹر نے کہا ''وہ ایک ڈالر سے زیادہ ادا نہیں کر سکتی۔ تم لازماً اسے قبول کر لو''۔

تاجر، موٹا، چاپلوس، خاموشی سے مسکراتا رہا۔

''اچھا مسٹر سوان، تمہاری خاطر میں غور کرتا ہوں اس مد میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں اپنی بیگم سے بھی مشورہ کروں گا، اگر ہم رعایت کر سکے تو ضرور تعاون کریں گے''۔

''اس معاملے کو طول دینے کی کوشش مت کرو'' مس تھامپسن بولی ''ہم ابھی طے کر لیتے ہیں۔ آپ کو فی ڈالر یومیہ سے زیادہ ایک دھیلا بھی نہیں ملے گا''۔

ڈاکٹر مسکرایا۔ اس نے مس کی جرات رندانہ کی ستائش کی جس طرح اس نے دوٹوک بات کی یعنی ایک مار دو ٹکڑے۔ جب کہ وہ خود اس مزاج کا آدمی تھا کہ اس نے ہمیشہ وہ ادا کیا جو طلب کیا گیا۔ بحث مباحثے کی نسبت زیادہ ادا کرنے میں عافیت جانتا۔ تاجر آہ بھر کر رہ گیا اور بولا۔

''اچھا مسٹر سوان کی خاطر میں قبول کیے لیتا ہوں''۔

''یہ مناسب ہے'' مس تھامپسن نے کہا ''سیدھے اندر آجائیں اور ایک ایک پیگ لے لیں۔ میرے پاس عمدہ ''رائی'' (وسکی کی ایک

قسم) اس جار میں ہے جو رسی کے جال میں جکڑا ہوا ہے۔ اسے ساتھ لیتے آئیں مسٹر سوان اور ڈاکٹر آپ بھی ساتھ چلے آئیں"۔

"میں نہیں سمجھتا کہ میں ساتھ دے سکوں گا، آپ کا شکریہ" اس نے جواب دیا مجھے نیچے جا کر اپنا سامان دیکھنا ہے کہ وہاں سب ٹھیک ہے۔"

وہ بارش میں باہر نکل آیا۔ وہ بندرگاہ کے دروازے سے اندر چلا آیا۔ سائبان میں اور مخالف کنارہ سب دھندلا ہو رہا تھا۔ اس نے دو تین مقامی لوگوں کو دیکھا۔ جن کے جسم پر لاوا لاوا کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ البتہ سر پر بڑی چھتری ضرور تھی۔ وہ خراماں خراماں نفاست سے چلتے گئے اور گزرتے ہوئے اجنبی زبان میں سلام کیا۔

کھانے کا وقت ہو گیا تھا جب وہ واپس آیا۔ ان کے لیے کھانا تاجر کے پارلر میں لگایا گیا۔ یہ ایک کمرہ رہائش کی بجائے مہمانوں کی عزت افزائی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں ناخوشگوار بو اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ بوسیدہ مخمل کے فرنیچر کو چاروں طرف دیوار کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ چھت کے بیچ ایک طلائی فانوس لٹک رہا تھا جسے زرد ٹشو پیپر لگا کر محفوظ کیا گیا تھا۔ ڈیوڈسن ابھی تک نہیں آیا تھا۔

بیگم ڈیوڈسن نے بتایا "میرے علم میں ہے کہ وہ گورنر سے ملنے گیا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ گورنر نے کھانے کے لیے اسے روک لیا ہوگا۔"

ایک چھوٹی مقامی لڑکی ان کے لیے ہیمبر گر اسٹیک کی ایک ڈش لے آئی۔ کچھ دیر بعد تاجر آ گیا یہ دیکھنے کے لیے کہ ضرورت کی ساری چیزیں مہیا کر دی گئی ہیں۔

"مسٹر ھارن' میں نے ایک ساتھی مسافر کو دیکھا ہے" ڈاکٹر میکفیل نے کہا۔ تاجر نے جواب دیا۔ "اس نے ایک کمرہ لیا اور بس۔ باقی سارے انتظامات اس کے اپنے ہیں۔" اس نے دونوں خواتین پر بھرپور توجہ کی نگاہ ڈالی۔

"میں نے اسے نچلی منزل میں جگہ دی ہے تاکہ آپ لوگوں کا سامنا نہ ہو۔ وہ آپ لوگوں کے لیے کسی پریشانی کا سبب نہیں بنے گی"۔

بیگم میکفیل نے دریافت کیا" کیا وہ ان میں سے ہے جو جہاز پر تھی"۔

"جی مادام! وہ دوسرے کیبن میں قیام پذیر تھی۔ وہ آپیا جا رہی تھی جہاں کیشیئر کی ملازمت اس کی منتظر ہے۔"

تاجر کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے کہا "اوہ......"

"میں نہیں سمجھتا کہ اس کا اپنے کمرے میں کھانا کھانا کسی طرح خوشگوار ہو سکتا ہے"۔

"اگر وہ دوسرے کیبن میں تھی تو غالباً میں اندازہ لگا سکتی ہوں"۔

بیگم ڈیوڈسن نے کہا" میں یقین سے نہیں جانتی کہ وہ کون ہو سکتی ہے"۔

"میں وہاں موجود تھا جب کوارٹر ماسٹر اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کا نام تھامپسن ہے"۔

بیگم ڈیوڈسن نے کہا" کیا یہ وہی خاتون تو نہیں جو گذشتہ شب کوارٹر ماسٹر کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی"۔

"یہ یقیناً وہی تھی"۔ بیگم میکفیل نے تبصرہ کیا۔ "مجھے اس وقت حیرت ہوئی کہ وہ کیا تھی۔ وہ مجھے قدرے تیز نظر آئی تھی"۔

بیگم ڈیوڈسن نے کہا۔" یہ کسی بھی طرح

مناسب نہیں''۔

پھر وہاں دوسرے موضوعات چھڑ گئے۔

کھانے کے بعد وہ سب تھکن محسوس کرنے لگے کہ وہ صبح کے جاگے ہوئے تھے۔ وہ وہاں سے الگ ہوئے اور جا کر سو گئے۔ جب وہ جاگے بارش تھمی ہوئی تھی۔ لیکن آسمان گھرا ہوا تھا اور بادل فضا میں جھول رہے تھے۔ وہ ایک بڑی سڑک پر چہل قدمی کے لیے نکل گئے جسے امریکیوں نے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ تعمیر کیا تھا۔

واپسی پر انھوں نے دیکھا کہ ڈیوڈسن ابھی ابھی آیا تھا۔

''ہمیں دو ہفتے کے لیے رکنا پڑ سکتا ہے''

اس نے بیزاری سے کہا''میں نے گورنر سے بحث کی لیکن وہ کہتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔''

''ڈیوڈسن اپنے کام پر واپس پہنچنے کے لیے سخت بے چین ہیں'' اس کی بیگم نے اس پر ایک پریشان کن نگاہ ڈالتے ہوئے بتایا۔

ڈیوڈسن برآمدے میں آگے پیچھے ہوتے ہوئے کہا''ہم ایک سال سے نکلے ہوئے ہیں۔ مشن مقامی مشنریوں کے ہاتھ میں ہے اور میں تشویش میں مبتلا ہوں کہ ان سے چیزیں چھوٹ جائیں گی۔ وہ بھلے لوگ ہیں میں ان کے خلاف ایک لفظ نہیں کہہ سکتا۔ خدا خوفی رکھنے والے مخلص اور سچے کرسچین ہیں یہ لوگ۔ ان کی عیسائیت گھر بیٹھے نام نہاد کرسچین کی عیسائیت کو شرمادے لیکن ان کے اندر قابلِ رحم حد تک انرجی کی کمی ہوتی ہے۔ وہ ایک موقف اختیار کرتے ہیں پھر اس میں تبدیلی کر لیتے ہیں۔ وہ مستقل ایک موقف پر قائم نہیں رہتے۔ اگر آپ مشن کسی مقامی مشنری کے حوالے کرتے ہیں تو خواہ وہ کتنا ہی قابلِ اعتماد نظر آتا ہو لیکن ایک عرصے کے بعد ان میں برائیاں در آنے لگتی ہیں۔

ڈیوڈسن اپنی بلند قامتی کے ساتھ ساکت کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے زرد چہرے کے برعکس تیز چمک بکھیر رہی تھیں۔ وہ ایک متاثر کن شخصیت کا مالک تھا اس کے جسمانی حرکات اور گہری گونجتی ہوئی آواز سے اخلاص ٹپکتا تھا۔ مشنری نے مزید کہا۔

''میں توقع کرتا ہوں کہ مجھے میرا کام کرنے دیا جائے گا۔ میں عمل کروں گا اور برملا کروں گا۔ اگر درخت سڑ جائے تو اسے کاٹ کر شعلوں میں بدل دینا چاہیے''

شام ہائی ٹی کے بعد جو ان کا آخری کھانا تھا۔ وہ سب اس خستہ پارلر میں بیٹھے تھے۔ خواتین اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ ڈاکٹر میکفیل اپنے پائپ سے شغل فرما رہے تھے۔ مشنری انھیں جزیرے میں اپنے کام کی نوعیت سمجھا رہا تھا۔

جب ہم وہاں گئے تو انھیں گناہ کی کوئی سمجھ نہیں تھی' اس نے بتایا'' وہ ایک کے بعد دوسرے مذہبی احکامات توڑتے جاتے تھے اور وہ یہ کبھی نہ جان پائے کہ انھوں نے کوئی غلطی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے کام کا سب سے مشکل مرحلہ یہ تھا کہ میں مقامی لوگوں میں گناہ کا احساس جگاؤں۔''

میکفیل جوڑے کو پہلے سے علم تھا کہ ڈیوڈ سن نے پانچ سال تک سولومن میں کام کیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی ہونے والی بیوی سے ملا۔ وہ چین میں ایک مشنری تھی ان کے تعلقات بوسٹن میں مستحکم ہوئے جہاں دونوں اپنی تعطیل کے ایک

حصے میں وہ ایک مشنری کانگریس میں شریک ہوئے۔ شادی کے بعد جزیرے کے لیے انہیں مقرر کیا گیا جب سے وہ وہاں محنت کر رہے ہیں۔

ڈیوڈسن کے ساتھ ان کی گفتگو سے ایک چیز صاف عیاں ہوگئی کہ اس شخص میں بے پناہ ہمت اور شجاعت تھی وہ ایک طبی مشنری تھا۔ اسے کسی بھی وقت گروپ کے کسی بھی جزیرے میں بلوایا جاسکتا تھا۔ حتیٰ کہ بارش کے موسم میں، طوفانی بحرالکاہل میں وھیل بوٹ کوئی محفوظ ذریعہ آمد ورفت نہیں ہوتی اکثر اسے چھوٹی کشتی Canoe میں بھیجا جاتا جو اور بھی خطرناک ہوتی۔ حادثے اور بیماری کے پیش نظر وہ کبھی متذبذب نہیں ہوا۔ درجنوں مرتبہ وہ ساری رات اپنی زندگی کی بازی لڑتا رہا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ اس کی بیوی اس کی امید کھو چکی تھی۔

بعض اوقات میں اسے روکتی۔ اس نے کہا ”کم از کم اس وقت تک انتظار کرلو کہ موسم قدرے موافق ہوجائے۔ لیکن اس نے کبھی نہیں سنا۔ وہ ارادے کا پکا ہے۔ ایک مرتبہ تہیہ کرلے تو پھر کوئی چیز اسے روک نہیں سکتی۔“

”میں کس طرح مقامی لوگوں کو خدا پر بھروسا کرنے پہ آمادہ کروں جب میں خود مشکلوں سے ڈرنے لگوں۔ ڈیوڈسن چلا پڑا۔ میں ایسا نہیں ہوں، میں ایسا نہیں ہوں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر انھوں نے اپنی مشکلات میں مجھے پکارا ہے تو میں ضرور جاؤں گا اگر انسان کے بس میں ہوا تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خدا مجھے چھوڑ دے گا جب میں اس کام کے لیے نکلوں۔ ہوائیں اس کے حکم سے چلتی ہیں اور پانی کی لہریں اس کے حکم پر متشدد ہوجاتی ہیں۔“

ڈاکٹر ایک کم ہمت شخص تھا... خندقوں میں وہ کبھی گھونگوں تک کو نقصان نہیں پہنچا پایا۔ کبھی وہ محاذ کے اگلے مورچوں پر آپریشن کر رہا ہوتا تو اس کی بھنوؤں سے پسینہ ٹپکنے لگتا۔ اپنے ہاتھوں کو قابو کرنے میں اس کا چشمہ دھندلا جاتا۔ اس نے مشنری کو دیکھ کر ایک جھرجھری سی لی۔

کاش میں کہہ سکتا کہ میں کبھی خوفزدہ نہیں ہوا، اس نے کہا ”دوسروں کے جواب میں کاش میں کہتا کہ میں خدا پر یقین رکھتا ہوں۔“

”بعض اوقات میں اور میری بیگم ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوتے اور آنسو ہمارے گالوں پر پھسل رہے ہوتے۔ ہم بنار کے دن رات کام کیے جاتے اور ہمیں کوئی کامیابی نہیں ہوتی میں نہیں جانتا کہ اس کے بغیر میرا کیا بنتا۔ جب مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوتا اور مایوسی کے بہت قریب ہوتا تو وہ امید دلاتی اور میری ہمت بندھاتی۔“

بیگم ڈیوڈسن اپنا کام کیے جارہی تھی اس کے پچکے گالوں پر سرخی نمایاں ہوتی اس کے ہاتھ قدرے لرزے لیکن وہ کچھ بول نہیں پائی۔

”ہماری مدد کے لیے کوئی نہیں تھا ہم اپنے لوگوں سے ہزاروں میل دور اندھیروں میں گھرے تنہا تھے۔ جب میں ٹوٹ جاتا اور حد درجہ پریشان ہوجاتا وہ اپنا کام چھوڑ کر مجھے بائیبل سناتی جب تک مجھ پر سکون طاری نہ ہوجاتا۔ جیسے نیند بچے کی پلکوں پر بسیرا کرلیتی اور بائیبل بند کرکے کہتی ہم ان کے تعاون اور حمایت کے بغیر بھی ان کی حفاظت کا فریضہ نبھاتے جائیں گے۔ خدا پر میرا یقین اور مضبوط ہوجاتا۔ میں جواب دیتا کہ ہم خداوندا کی مدد کے ساتھ ان کی حفاظت

کریں گے اور ضرور کریں گے۔"

وہ میز کے سامنے آ کر اسی طرح کھڑا ہو گیا جیسے وہ ڈائس ہو یا روسٹرم۔ آپ دیکھیں وہ فطرتاً اس قدر گمراہ ہو چکے تھے کہ انھیں اپنی شیطانیت کا احساس تک نہ تھا ہمیں بتانا تھا کہ جسے وہ فطری عمل سمجھتے وہ گناہ ہے' ہمیں زنا' جھوٹ اور چوری ہی کو گناہ نہیں جتانا تھا بلکہ عریاں ہونا' ڈانس کرنا اور چرچ سے دور رہنے کو بھی گناہ باور کرانا تھا۔ ایک لڑکی کو یہ سمجھانا تھا کہ اپنی چھاتی دوسروں کو دکھانا اور مرد کا پتلون نہ پہننا بھی گناہ ہے۔

بغیر کسی تحیر کا اظہار کیے ڈاکٹر میکفیل نے دریافت کیا" کیسے"

میں نے جرمانے کا نظام وضع کیا۔ ظاہر ہے لوگوں کو احساس دلانے کے لیے یہ عمل گناہ ہے اور ارتکاب کرنے والے کو سزا بھگتنا پڑے گی اگر وہ چرچ سے غائب رہے تو جرمانہ کیا۔ ڈانس کریں تو جرمانہ' غیر معیاری لباس پہنیں تو جرمانہ۔ میرے پاس گناہ کے مطابق جرمانے کی تفصیل تھی۔ ہر گناہ کے عوض جرمانہ' یا رقم کی صورت یا کام کی شکل ادا کرنا ہوتا آخر کار میں نے انہیں آمادہ کر ہی لیا۔" کیا انھوں نے کبھی ادائیگی سے انکار کیا۔"

مشنری نے جواب دیا" وہ کیوں کر انکار کر سکتے تھے۔"

اس کی بیوی نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا" وہ کوئی بہت ہی دل والا ہوتا جو ڈیوڈسن کے خلاف جانے کی کوشش کرتا۔"

آپ کو یاد رکھنے چاہیے کہ میں آخری حربے کے طور پر انہیں چرچ کی رکنیت سے خارج کر سکتا تھا۔"

"تو کیا انہیں اس کی فکر تھی؟"

ڈیوڈسن قدرے مسکرایا اور اپنی ہتھیلیوں کو مسلتے ہوئے بولا۔

"وہ اپنا کھوپرا فروخت نہیں کر سکتے' مچھلی کے شکار میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا یہ ان کے لیے فاقے کے مترادف ہوتا جس کی انہیں بڑی فکر ہوتی۔"

بیگم ڈیوڈسن نے کہا انہیں فریڈ اولسن کے متعلق بتاؤ۔

مشنری نے اپنی شعلہ بار آنکھیں ڈاکٹر پر مرکوز کر دیں۔

'فریڈ اولسن ایک ڈینش تاجر تھا جو وہاں کئی سالوں سے مقیم تھا۔ وہ اچھا خاصا متمول تھا جیسا کہ تاجر عموماً ہوتے ہیں لیکن وہ ہماری آمد پر زیادہ خوش نہیں تھا چونکہ وہ معاملات کو اپنے طور پر چلانے کا عادی تھا مقامی لوگوں کو کھوپرے کی من مانی قیمت ادا کرتا۔ وہ دیگر اشیاء اور وہسکی میں ادائیگی کرتا۔ اس کی ایک مقامی بیوی تھی جس کے ساتھ وہ اعلانیہ بے وفائی کا مرتکب ہوتا تھا۔ وہ بلانوش تھا میں نے اسے ایک موقع دیا کہ اپنی اصلاح کر لے لیکن اسے پروا نہیں تھی الٹا مجھ پر ہنستا رہتا۔"

اس کی آواز دھیمی لیکن کاٹ دار ہو گئی جب اس نے آخری الفاظ ادا کیے۔

اس نے قدرے خاموشی اختیار کی۔ اس کی خاموشی کسی طوفان کا پتہ دیتی تھی۔

دو سالوں میں وہ تباہ و برباد ہو گیا۔ ربع صدی کا اس کا آموختہ ختم ہو چکا تھا۔ میں اسے توڑ چکا تھا بالآخر وہ ایک بھکاری کی صورت میرے پاس آیا اور گڑگڑا کر درخواست کی کہ اسے سڈنی

بھجوادوں۔"

"میں تمنا کرتی ہوں کہ کاش آپ لوگ اسے دیکھ سکتے جب وہ ڈیوڈسن کے پاس آیا تھا "مشنری کی بیگم نے بتایا وہ ایک صحت مند شخص ہوا کرتا تھا اس پر چربی چڑھی ہوئی تھی اس کی آواز بھاری اور گرجدار تھی لیکن وہ اس وقت تقریباً آدھا ہو چکا تھا۔ مسلسل کپکپا رہا تھا۔ ایک دم بوڑھا۔"

اچانک شور بلند ہوا۔ ڈیوڈسن مڑا اور بیگم کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھا یہ گراموفون کی' عام موسیقی سے ہٹ کر تیز اور تکلیف دہ آواز تھی۔

اس نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

بیگم ڈیوڈسن نے اپنا چشمہ ناک پر اچھی طرح جماتے ہوئے کہا "دوسرے درجے کے مسافروں میں سے ایک نے نیچے کمرہ لیا ہے۔ میرا قیاس ہے کہ یہ آواز وہیں سے آرہی ہے"

انھوں نے خاموشی سے سنا۔ اب انہیں ڈانس کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ پھر موسیقی تھم گئی۔ پرجوش گفتگو کے درمیان کارک اڑنے کی آواز آتی گئی۔

"میں سمجھتا ہوں وہ جہاز کے اپنے ساتھیوں کو الوداعی پارٹی دے رہی ہے۔" ڈاکٹر میکفیل نے کہا "کیا جہاز نے بارہ بجے روانہ نہیں ہونا۔"

ڈیوڈسن نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور گھڑی دیکھنے لگا۔

اس نے اپنی بیگم سے پوچھا..... "کیا تم تیار ہو؟"

وہ کھڑی ہوگئی اور اپنا کام سمیٹنے لگی۔

اس نے جواب دیا "ہاں میں تقریباً تیار ہوں۔"

ڈاکٹر نے حیرت سے کہا "کیا ابھی سونے کا وقت دور نہیں۔"

بیگم ڈیوڈسن نے وضاحت کی "ہمیں ابھی بہت کچھ پڑھنا ہے ہم جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں رات سونے سے قبل بائبل کا ایک سبق ضرور پڑھتے ہیں اور اس پر تبصرہ کرتے ہیں آپ سمجھتے ہوں گے ہم تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ یہ ذہنی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔"

دونوں جوڑوں نے ایک دوسرے کو شب بخیر کہا۔ ڈاکٹر اور اس کی بیگم اکیلے رہ گئے۔ دو تین منٹ تک وہ کچھ نہیں بولے۔

آخر ڈاکٹر نے کہا "میں جا کر تاش لے آتا ہوں۔"

اس کی بیگم نے شوہر کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ڈیوڈسن جوڑے کے ساتھ اس کی گفتگو نے اس قدر بے چین کر دیا تھا وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی کہ انہیں تاش نہیں کھیلنا چاہیے جبکہ ڈیوڈسن کسی بھی وقت کمرے میں آسکتا تھا۔

ڈاکٹر تاش لے آیا لیکن وہ ایک غیر واضح احساس جرم کے ساتھ اس پر نظریں جمائی رہی جبکہ ڈاکٹر کے صبر کا پیمانہ چھلکنے کو تھا اور نیچے خوش آئند آوازیں جاری تھیں۔

دوسرے روز موسم کافی بہتر تھا۔ میکفیل جوڑے نے پاگو پاگو میں دو ہفتے بغیر کسی مصروفیت کے گزارنے کی مدت کو انھوں نے کچھ کرنے کا ارادہ کیا وہ گودی میں جا کر اپنے صندوق سے چند کتابیں نکال لائے۔ ڈاکٹر نے سول اسپتال کے سرجن کو بلایا اور اس کے ہمراہ مریضوں کے

معائنے کو گیا وہ تاش گورنر کے پاس چھوڑ آئے تھے۔ وہ سڑک پر مس تھامپسن کے قریب سے گزرے۔ ڈاکٹر نے ہیٹ اٹھا کر اسے تعظیم دی۔

اس نے جواباً مسرور اور بلند آواز سے ''صبح بخیر ڈاکٹر'' کہا۔ اس نے ایک روز قبل کی طرح کا لباس زیب تن کیا تھا۔ سفید فراک اونچی ایڑی والے سفید چمکدار بوٹ۔ اس کی گداز ٹانگیں اس پر لشکارے مار رہی تھیں۔ اس دور دیس میں یہ ایک خوش کن منظر تھا۔

''میں نہیں سمجھتی کہ اس نے کوئی مناسب لباس زیب تن کیا ہے'' ڈاکٹر کی بیگم نے کہا ''وہ مجھے انتہائی عام سی خاتون دکھائی دیتی ہے۔''

جب وہ لوگ واپس لوٹے تو وہ برآمدے میں تاجر کے سیاہ بچے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

''اس سے کوئی بات کرو'' ڈاکٹر نے اپنی بیگم سے سرگوشی کی ''وہ یہاں بالکل تنہا ہے اور اس طرح اس سے گریز کرنا بے رحمی ہے۔''

اس کی بیگم شرمیلی تھی لیکن وہ اپنے شوہر کی انتہائی فرماں بردار بھی تھی ''ہم سب یہاں وقتی پڑاؤ ڈالنے والے ساتھی ہیں۔'' اس نے قدرے احمقانہ طریقے سے کہا۔

''یہ وحشت ناک نہیں کہ ایک اصطبل جتنے شہر میں ہمیں ٹھونس دیا گیا۔''

مس تھامپسن نے جواب دیا ''وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ خوش قسمت ہوں کہ ایک کمرہ حاصل کر لیا ہے۔ میں کسی مقامی گھر میں رہنے کا تصور نہیں کر سکتی کسی کو کچھ کرنا چاہیے میں نہیں سمجھتی کہ یہاں ہوٹل کیوں نہیں ہے۔''

انہوں نے کچھ اور جملوں کا تبادلہ کیا مس تھامپسن بلند آہنگ اور باتونی تھی وہ گپ لگانے کے موڈ میں تھی لیکن بیگم میکفیل کے پاس ایسی باتوں کا کوئی ذخیرہ نہیں تھا لہٰذا اس نے خوش دلی سے کہا اب مجھے اوپر جانا ہے۔

شام جب وہ کھانے کے لیے اکٹھے ہوئے تو ڈیوڈسن نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا ''میں نیچے اس خاتون کے پاس دو ملاحوں کو بیٹھا دیکھا مجھے حیرت ہے کہ اس نے ان سے کیسے راہ و رسم بنا لی۔''

بیگم ڈیوڈسن نے کہا ''وہ اتنی خاص نہیں ہے۔''

وہ سارے ایک بیکار دن گزار کر بالکل تھک چکے تھے۔

ڈاکٹر میکفیل نے کہا ''اگر اسی طرح ہمیں دو ہفتے گزارنے پڑے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔''

ایک کام کرنے کا ہے کہ ہم مختلف مشغولیت کے لیے وقت تقسیم کر لیں'' مشنری نے جواب دیا'' میں کچھ وقت مطالعے کے لیے مختص کر لوں گا اور کچھ وقت ورزش کے لیے خواہ بارش ہو یا موسم صاف ہو جب روز بارش ہو تو اس کا حسن ماند پڑ جاتا ہے اور کچھ وقت تفریح کے لیے''

ڈاکٹر میکفیل نے اپنی ساتھی کی جانب مشکوک نگاہ ڈالی۔

ڈیوڈسن کے پروگرام نے اسے بوجھل کر دیا تھا وہ دوبارہ ہیمبرگر اسٹیک کھا رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ باورچی یہی ایک ڈش پکا سکتا تھا نیچے پھر وہی پروگرام شروع ہو گیا۔ ڈیوڈسن کے اعصاب اسے سن کر متاثر ہونے لگے لیکن کچھ کہا نہیں۔ مردوں کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مس تھامپسن کے مہمان ایک مشہور گیت میں شریک ہو رہے تھے انہوں نے مس کی

بلند اور بھدی آواز بھی سنی۔ چیخ وپکار اور قہقہوں کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ وہ چار لوگ اوپر کی منزل میں گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیچے سے گفتگو کی بجائے گلاسوں کے ٹکرانے اور کرسیاں گھسیٹنے کی آواز زیادہ بلند تھی۔ مزید لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے مس تھامپسن کی پارٹی زور وشور سے جاری تھی۔

پراگندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے خیالات ادھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ ڈیوڈسن کے چہرے کا تناؤ اس کا ثبوت تھا۔ اگرچہ وہ سائنسی موضوعات پر بات کر رہا تھا لیکن اس کے خیالات کسی اور جانب بھی محو پرواز تھی جب ڈاکٹر فلانڈر کے محاذ کے اپنے چند تجربے بتا رہا تھا کہ وہ چیختے ہوئے یقین و اعتماد کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔

بیگم ڈیوڈسن نے پوچھا ''الفریڈ کیا بات ہے۔''

''بے شک میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا وہ آئیویلی سے باہر آ گئی وہ نہیں آ سکتی تھی لیکن۔''

''ہونولولو سے جہاز پر سوار ہوئی ظاہر ہے اپنے کاروبار کے لیے وہ یہاں آئی ہے۔''

اس نے آخری الفاظ ''یہاں'' کو چبا کر ناانصافی کے خلاف جذبے کے ساتھ ادا کیا۔

بیگم میکفیل نے دریافت کیا ''آئیویلی کیا ہے''

اس نے اپنی بے نُور آنکھیں اس پر مرکوز کر دیں۔ اس کی آواز دہشت اور خوف سے کانپ رہی تھی۔

......☆......

گناہ اور بدی کا مرکز، ہونولولو، قحبہ خانہ اور قمار خانہ، ہماری تہذیب و تمدن پر بدنما داغ۔

آئیویلی شہر کے آخری کنارے پر تھا۔ آپ بندرگاہ کے ساتھ ساتھ سڑکوں پر چلتے جائیں اندھیرے میں ایک خستہ حال پُل پر سے گزریں گے، آپ پھر ایک ویران شارع، دھنسی ہوئی جگہ جگہ سوراخ پر نکل آئیں گے۔ پھر اچانک آپ روشنی میں نہا جائیں گے۔ سڑک کے دونوں جانب پارکنگ کی جگہ۔ وہاں سیلون ہوں گے، روشن مگر اوسط درجے کے لیکن ہر ایک میکانیکل پیانو سے گونجتا ہوا، حجام کی دکانیں، تمباکو فروش، وہاں کی فضا متوقع دھوم دھڑکے سے معمور ہوگی۔ آپ دائیں یا بائیں تنگ گلی میں داخل ہو جائیں۔ وہ صرف آئیویلی کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اب آپ اس خاص علاقے میں موجود ہیں وہاں آپ کو چھوٹے چھوٹے بنگلوں کی قطاریں نظر آئیں گی سبز رنگوں میں خوبصورتی سے تراشا ہوا، ان کے درمیان چلنے کے راستے صاف ستھرے اور چوڑے ہوں گے جیسے کوئی باغوں کا شہر بسایا گیا ہو۔ اس کی ترتیب اور ستھرائی میں ایک خوف چھایا ہوگا۔ چاہت اور الفت کی تلاش کبھی اتنا منظم اور مرتب نہیں رہی ہوگی۔ راہداریاں ملگجے اندھیرے میں ڈوبی ہوئیں۔ روشنی صرف بنگلوں کی کھلی کھڑکیوں سے باہر آ رہی ہوتی۔ انہی کھڑکیوں پر موجود خواتین کچھ سی رہی ہوتیں یا کچھ پڑھ رہی ہوتیں، مٹر گشت کرتے راہگیر مردوں سے بے نیاز بیٹھی ہوئیں۔ ان راہ گیروں میں ایئر مین، بندرگاہ پر لنگر انداز جہاز کے ملاح...... نشے میں اداس گن بوٹ کے سپاہی، رجمنٹ کے جوان جس میں گورے اور نیگرو شامل ہوتے جو جزیرے میں کیمپ کیے ہوتے۔ ان میں جاپانی دو دو تین تین کی ٹولیوں میں۔ ہوائی کے باشندے اور چینی لمبے ایپرن پہنے ہوئے ہوتے۔

لمبوترے ہیٹ پہنے فلپینی' سب خاموش جیسے بے جا پابندیوں کے اسیر۔خواہشیں سب کی غم آلود۔

''یہ بحرالکاہل کے علاقے کا جیتا جاگتا اسکینڈل تھا۔'' ڈیوڈسن شدت سے چیختے ہوئے لہجے میں بولا''مشنریاں سالوں سے اس کے خلاف احتجاج کررہی تھیں بالآخر مقامی پریس بھی اس احتجاج میں شامل ہوگیا۔پولیس اس معاملے کو ہاتھ میں لینے سے کتراتی تھی ان کی کج بحثی یہ تھی کہ اس کے نتائج تو یقیناً برے ہیں لیکن بہتر ہے کہ اسے محدود کرتے ہوئے قابو پایا جائے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ پولیس والے اس علاقے کی آمدنی میں شریک ہوتے تھے۔سیلون والے پولیس کو ادائیگی کرتے ۔ دلال رقم پہنچاتے حتیٰ کہ عورتیں خود پولیس کو حصہ دیتیں۔ آخر کار انہیں طاقت کے ذریعے وہاں سے ہٹایا گیا۔''

ڈاکٹر نے بتایا جہاز پر ملنے والے اخبار میں اس نے اس کے متعلق پڑھا تھا۔آئیویلی کے اس گناہ اور ننگ کے باعث اسی دن ختم کردیا گیا جب مشنریاں وہاں پہنچیں۔پوری آبادی کو انصاف کے کٹہرے میں لاگیا گیا میں نہیں جانتا کہ کیوں میں اس خاتون کو فوراً نہیں سمجھ سکا وہ کیا چیز تھی۔

''اب تم اس کے بارے میں بتارہے ہو۔ ''بیگم میکفیل نے اضافہ کیا''مجھے یاد ہے میں نے اپنے جہاز کی روانگی سے چندمنٹ پہلے دیکھا تھا۔مجھے یاد ہے میں سوچ رہی تھی کہ وہ ایک تیز وطرار شخصیت ہے۔''

''اسے یہاں آنے کی ہمت کیوں کر ہوئی۔'' ڈیوڈسن غصے سے چیخا''میں اسے اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

وہ دروازے کی طرف لپکا۔

''تم کیا کرنے جارہے ہو۔'' ڈاکٹر نے پوچھا

''تم مجھ سے کیا توقع کرتے ہو۔میں نے اسے روکنا ہے۔میں اس گھر کو ایک......ایک...... میں نہیں بدلنے دوں گا۔''

وہ ایک مناسب لفظ تلاش کررہا تھا جو خواتین کی سماعت کے لیے قابل قبول ہو۔اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں ۔ جذباتی ہونے کے باوجود اس کا چہرہ زرد ہورہا تھا۔

''ایسا لگتا ہے نیچے تین چار مرد حضرات ہیں۔''ڈاکٹر نے کہا''کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس وقت وہاں جانا جلد بازی کے مترادف ہے۔''

مشنری نے اس پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالی اور بغیر ایک لفظ کہے دروازے کی سمت بھاگا۔

''آپ ڈیوڈسن کے متعلق بہت تھوڑا جانتے ہیں۔اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ذاتی خطرات اسے فرض کی ادائیگی سے باز رکھ سکتے ہیں۔''اس کی بیوی نے تنبیہ کی۔وہ بے چینی سے اپنی ہتھیلیوں کو آپس میں جوڑے بیٹھی تھی ۔اس کے گالوں کی ابھری ہڈیوں پر ایک رنگ ظاہر ہورہا تھا۔یہ سننے کے لیے کہ نیچے کیا ہورہا ہے ان سبھوں نے لکڑی کی سیڑھیوں پر اترتے قدموں کی اور زور سے دروازہ کھولنے کی آواز سنی۔گانے کی آواز اچانک بند ہوگئی ایسے گانوں کی بیہودہ آواز ابھی تک سماعت کے لیے آزار بنی ہوئی تھی انہوں نے ڈیوڈسن کی آواز سنی اور پھر کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز۔موسیقی تھم گئی۔اس نے گراموفون کو فرش پر گرادیا تھا۔انہوں نے دوبارہ ڈیوڈسن کی آواز سنی لیکن وہ سمجھ نہیں سکے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔مس تھامپسن کی بلند اور پاٹ دار آواز اور اس کے بعد

ایسا لگا جیسے بہت سارے لوگ گلا پھاڑ کر ایک ساتھ چیخ رہے ہیں۔ بیگم ڈیوڈسن نے زور سے سانس لیا اور اپنے ہاتھوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ ڈاکٹر میکفیل نے بے یقینی سے اس کے چہرے سے اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ نیچے جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اسے حیرت ہوتی اگر وہ لوگ اس کی توقع کرتے پھر ایسا محسوس ہوا جیسے دھینگا مشتی ہو رہی ہو۔ اب آواز زیادہ واضح ہو گئی تھی اور ایسا لگا کہ ڈیوڈسن کو کمرے سے باہر پھینک دیا گیا ہو۔ اس کے بعد دروازے کو زور سے بند کیا گیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے سنا کہ ڈیوڈسن سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بیگم ڈیوڈسن نے کہا کہ مجھے اس کی طرف جانا ہے، وہ اٹھی اور چلی گئی۔

''اگر آپ کو ضرورت ہو تو مجھے پکار لیجیے گا۔'' بیگم میکفیل نے کہا ''ہمیں امید کرنا چاہیے کہ وہ زخمی نہ ہوئے ہوں۔''

ڈاکٹر نے کہا ''وہ کیوں اپنے کام سے کام نہیں رکھتا۔''

وہ ایک منٹ تک خاموش رہے، اور پھر شروع ہو گئے۔ گراموفون دوبارہ قوت سے بجنے لگا۔ اس بیہودہ گانے کے الفاظ نئے ڈھنگ سے دہرائے جانے لگے۔

دوسرے روز بیگم ڈیوڈسن تھکی ہوئی اور مرجھائی ہوئی تھی۔ اس نے سر درد کی شکایت کی۔ یہ اب مزید بوڑھی اور ٹھٹھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بیگم میکفیل کو بتایا کہ اس کا شوہر ساری رات سو نہیں سکا۔ اس نے رات وحشتناک بے بسی میں گزاری۔ پانچ بجے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اس پر بئیر کا ایک گلاس پھینکا گیا تھا۔ اس کے کپڑے داغدار اور بدبودار ہو گئے تھے لیکن ایک مدھم آگ بیگم ڈیوڈسن کی آنکھوں میں دیکھی جا سکتی تھی۔ جب وہ بیگم میکفیل سے بات کر رہی تھی۔

''اس نے ڈیوڈسن کی تضحیک کر کے ماحول کو آلودہ کر دیا ہے۔'' اس نے کہا

ڈیوڈسن ایک ہمدرد دل رکھنے والا شخص ہے 'کوئی مصیبت میں گرفتار شخص اس کے پاس جائے تو لازمی آسانیاں لیے لوٹتا ہے لیکن گناہگاروں کے لیے اس کے پاس کوئی رحم نہیں، جب بدی کی مخالفت میں اس کا غصہ بڑھتا ہے تو پھر وہ نہایت خوفناک ہو جاتا ہے۔

''کیوں، اب وہ کیا کریں گے'' بیگم میکفیل نے دریافت کیا۔

مجھے نہیں معلوم لیکن اس جیسی خاتون سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

بیگم میکفیل کانپ گئی۔ اس چھوٹی سی خاتون کے انداز میں یقینی فتح کی مثبت گھنٹی بج رہی تھی۔ اسی صبح کو وہ دونوں ایک ساتھ باہر نکلے۔ وہ سیڑھیوں سے ساتھ ساتھ اتریں۔ مس تھامپسن کا دروازہ کھلا تھا۔ انہوں نے اسے شکن آلود ڈریسنگ گون میں کچھ پکاتے دیکھا۔

''صبح بخیر'' اس نے پکارا ''کیا مسٹر ڈیوڈسن آج بہتر ہیں۔''

وہ خاموشی سے گزر گئیں جیسے وہ وہاں تھے ہی نہیں۔ لیکن ان کے کان کھڑے تھے جب اس نے تضحیک آمیز قہقہہ لگایا تو ان کے چہرے سرخ ہو گئے۔ بیگم ڈیوڈسن اچانک اس کی طرف مڑی۔

''تم مجھ سے بات کرنے کی ہمت مت کرو'' وہ چلائی۔ اگر تم میری بے عزتی کرو گی تو

میں تمہیں یہاں سے نکال باہر کروں گی۔"

"تم بتاؤ! کیا میں نے ڈیوڈسن سے کہا تھا کہ میرے پاس آئیں۔"

بیگم میکفیل نے سرگوشی کی "اسے جواب مت دو"

"یہ کمینی ہے' کمینی ہے۔" بیگم ڈیوڈسن پھٹ پڑی۔ غصے نے اس کے حلق کو جکڑ لیا تھا اور وہ کچھ بول نہیں سکی۔"

گھر واپس لوٹتے انہوں نے اسے گودی کے سمت خراماں خراماں جاتے دیکھا۔ وہ پوری سجی سجائی تھی۔ اس کا بڑا سفید ہیٹ بے ہودہ پھولوں سے مزین وہ گزرتے ہوئے انہیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ دو امریکی ملاح کھڑے مسکرا رہے تھے۔ خواتین چہرے پر سرد مہری سمیٹے گزر گئیں۔ وہ بارش شروع ہونے سے قبل واپس لوٹ آئیں۔

میں سمجھتی ہوں اس نے اتنے اچھے کپڑے ضائع کئے۔" بیگم ڈیوڈسن نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

ڈیوڈسن اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ وہ لوگ تقریباً آدھا کھانا کھا چکے تھے۔ وہ آیا' اس کے کپڑے بھیگ چکے تھے لیکن اس نے تبدیل نہیں کیے۔ وہ خاموش اور مغموم بیٹھا تھا۔ اس نے ایک دو لقمے کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ ترچھی برستی بارش پر نظریں جمائے رہا۔ جب بیگم ڈیوڈسن نے دو مرتبہ مس تھامپسن سے مڈبھیڑ کا احوال سنایا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا تاہم اس کی پیشانی کے بل اور گہرے ہو گئے۔

"کیا تم نہیں سمجھتے کہ ہم مسٹر ھارن کے سامنے مطالبہ رکھیں گے کہ وہ اسے نکال باہر کریں" بیگم ڈیوڈسن نے کہا "ہم سے اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہماری بے عزتی کرے۔"

میکفیل نے کہا' یہاں رہنے کی کوئی دوسری جگہ نہیں ہے اس طرح کے موسم میں مقامی جھونپڑی میں رہنا ہرگز آرامدہ نہیں ہوگا۔"

مشنری نے کہا" میں ایک ایسی جھونپڑی میں سال بھر رہ چکا ہوں۔"

ایک چھوٹی سی لڑکی بھنے ہوئے کیلے لے کر آئی۔ یہی وہ واحد میٹھا تھا جو کھایا جاتا تھا۔

ڈیوڈسن اس کی جانب مڑا "مس تھامپسن سے پوچھو کہ میں کس وقت اس سے مل سکتا ہوں۔"

لڑکی نے شرماتے ہوئے سر ہلایا اور باہر چلی گئی۔

اس کی بیوی نے دریافت کیا "الفریڈ تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"اس سے ملنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ میں اس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا جب تک اسے موقع نہ دے دوں۔"

"تم نہیں جانتے وہ کیا چیز ہے' وہ تمہارا مذاق اڑائے گی۔"

"کرنے دو میری بے عزتی' خواہ وہ میرے منہ پر تھوک دے' وہ ایک لافانی روح ہے میں اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

بیگم ڈیوڈسن کے کانوں میں اس قحبہ گر کا حقارت آمیز قہقہہ ابھی تک گونج رہا تھا۔

"وہ بہت دور جا چکی ہے۔"

خداوندا کی رحمت سے بہت دور' اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی آواز میں گداز اور نرمی پیدا ہو چکی تھی۔ اگر گناہگار اپنے گناہوں میں تحت الثریٰ تک کیوں نہ چلا جائے لیکن یسوع مسیح کی محبت وہاں تک ضرور پہنچتی ہے۔

''میں نیاز مند اور خائف بھی ہوں۔ گناہوں پر احساس ندامت بہت ہی خوبصورت ہے۔ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ اس کے دامن کے کناروں کو ہاتھ لگا سکوں۔''

''کیا اب تم اسے سان فرانسسکو بھیجنے کی ہمت رکھتے ہو''ڈاکٹر نے دریافت کیا۔''مجھے اب باور کر لینا چاہیے کہ تم نے اسے وہاں سے بچالیا ہے۔''

''ہائے! لیکن تم یہ بھی تو جانو کہ یہ ضروری ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا دل اس کے لیے خون کے آنسو نہیں روتا۔ میں اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنا اپنی بیوی اور بہن سے۔ جب تک وہ قید خانے میں ہوگی۔ جس کرب و اذیت سے وہ گزرے گی میں بھی برابر اس کا شکار رہوں گا۔''

''واہیات''ڈاکٹر بے صبری سے چلایا۔

''تم سمجھ نہیں سکتے۔ تم وہ سب...... دیکھ نہیں سکتے۔ اس نے گناہ کیا ہے تو سزا بھی بھگتنی ہوگی۔ میں جانتا ہوں وہ یہ سب جھیل سکتی ہے۔ اسے بھوکا رکھا جائے گا، اذیت دی جائے گی۔ اس کی تضحیک ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ یہ سب خدا کی راہ میں قربانی کے لیے قبول کرے اور ہنسی خوشی قبول کرے۔ اسے ایک ایسا موقع مل رہا ہے جو ہم میں سے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ خداوندا رحم دل اور مہربان ہے۔''

ڈیوڈ کی آواز جذبات سے کانپ رہی تھی۔ وہ اپنے ہونٹوں پر آنے والے الفاظ کو بڑی مشکل سے ادا کر پا رہا تھا۔

''میں سارا دن اس کے ساتھ دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ اور جب میں اسے چھوڑ آتا ہوں تو پھر بھی اس کے لیے دعا کرتا ہوں۔ میں اپنی پوری قوت اور استقامت کے ساتھ دعا کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے دل میں سزا قبول کرنے کا داعیہ خود جاگے تا کہ اگر ہم اسے آزاد بھی کرنا چاہیں تو وہ انکار کر دے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ وہ قید کے اس تلخ سزا کو شکر گزاری کے بطور خداوندا کے قدموں میں رکھے۔ اس خدائے بزرگ و برتر کے لیے جس نے اسے زندگی عطا کی۔''

دن آہستہ روی سے گزر رہے تھے۔ ہر شخص نیچے رہنے والی اس آزردہ اور اذیت میں مبتلا عورت کے دکھ کا مظہر تھا۔ جو ایک غیر فطری وفورِ جذبات کے ساتھ رہ رہی تھی۔ وہ ایک ایسا شکار تھی جسے دیوتا کے قدموں میں دہشت ناک طریقے سے قربان کیا جا رہا تھا۔ خوف نے اسے تقریباً گونگا کر دیا تھا۔ وہ ڈیوڈسن کا اپنی نظروں سے اوجھل ہونا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہوتی تو اس میں قدرے ہمت ہوتی۔ وہ اس پر ایک غلام کے طریقے سے تکیہ کیے ہوئے تھی۔ وہ بہت روئی تھی۔ بائبل پڑھتی اور دعائیں کرتی تھی۔ بعض اوقات وہ نڈھال اور بے رغبت ہو جاتی۔ وہ یقیناً اس آزمائش کا سوچتی ہوگی جس کا اسے سامنا کرنا تھا۔ اسے لگتا جس اضطراب اور الجھن کا اس وقت اسے سامنا ہے یہ آزمائش اسے ایک بلاواسطہ اور ٹھوس فرار تو دے سکتا ہے۔ اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی زیبائش بھی ایک طرف اٹھا رکھی تھی۔ وہ اپنے بکھرے اور غیر آراستہ کمرے میں ایک بوسیدہ سا شکن آلود گاؤن پہنے قید ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے چار راتوں سے اپنا شب خوابی کا لباس تک تبدیل نہیں کیا تھا اور نہ ہی موزے چڑھائے تھے۔ اس کا کمرہ غیر مرتب اور گندہ ہو رہا تھا۔ اسی دوران ظالمانہ تسلسل کے ساتھ بارش جاری تھی۔ آپ کو لگا ہوگا کہ آسمان

پانی سے خالی ہو جائے گا لیکن پانی اب بھی لوہے کی چادر پر سید ھے اور تیز برس رہا تھا۔ پاگل کرنے کی حد تک تسلسل کے ساتھ۔ ہر چیز مرعوب تھی اور چپ چپار ہی تھی۔ دیواروں، جوتوں اور فرش پر پھپھوند ظاہر ہونے لگا تھا۔ بے خواب راتیں، مچھروں کی بے رحم موسیقی ان کے حملوں کے ساتھ۔

''اگر ایک دن کے لیے بارش رک جائے تو کوئی خرابی تو نہ ہوگی'' ڈاکٹر نے اظہار خیال کیا۔

اب سب کی نگاہیں آئندہ منگل پر جمی ہوئی تھیں جب سان فرانسسکو جانے والی کشتی نے آنا تھا۔ ذہنی دباؤ بہت شدید تھا۔ جہاں تک ڈاکٹر کا تعلق تھا اس کی ہمدردی اور ناراضگی کو اس خواہش نے ایک ساتھ بجھایا تھا کہ اس کشمکش سے اس بدنصیب عورت کی جان چھوٹ جائے گی۔ جو نا گزیر ہوا سے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ کشتی کی روانگی کے بعد وہ زیادہ اطمینان سے سانس لے سکے گا۔ گورنر آفس کا ایک کلرک سیڈی تھامپسن کو لے کر جائے گا۔ اس شخص نے پیر کے روز آ کر مس تھامپسن کو بتا دیا کہ آئندہ صبح اسے گیارہ بجے تیار رہنا ہے۔ ڈیوڈسن کو بھی ان کے ساتھ ہونا تھا۔

''میں دیکھوں گا کہ ہر چیز تیار ہے۔ میرا مطلب ہے کشتی پر جا کر خود یہ کام کروں گا'' مشنری نے بتایا۔

مس تھامپسن کچھ نہیں بول رہی تھی۔

جب ڈاکٹر میکفیل نے موم بتی بجھا دی اور احتیاط سے مچھر دانی کے اندر داخل ہوا تو اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

''چلو خدا کا شکر ہے کل اس وقت وہ جا چکی ہوگی۔''

''بیگم ڈیوڈسن بھی خوش ہوگی۔ وہ بتاتی ہے کہ ڈیوڈسن ایک سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوگا'' بیگم میکفیل نے کہا۔ ''وہ ایک مختلف عورت ہے۔''

''میرے ذہن کے کسی گوشے میں بھی نہیں تھا کہ سیڈی کو بھیجا جا سکے گا۔ اس طرح وہ نیچے جا گرے گی۔''

ڈاکٹر میکفیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ فوراً سو گیا۔ وہ تھک چکا تھا۔ معمول کے خلاف گہری نیند سو گیا۔

صبح اس کے بازو کو جھنجوڑ کر اسے اٹھایا گیا۔ اس نے اپنے بستر کے ساتھ ہارن کو دیکھا۔ اس نے اپنی انگلیاں ڈاکٹر کے ہونٹوں پر رکھ کر اسے کچھ بولنے سے روک دیا۔ اور اسے آنے کا اشارہ کیا۔ عموماً وہ ملاحوں والا چوغا پہنے رہتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ ننگے پاؤں اور صرف لاوا لاوا زیب تن کیے ہوئے تھا۔ وہ وحشت زدہ نظر آیا۔ ڈاکٹر بستر سے اچھل کر باہر آیا۔ اس نے دیکھا کہ ہارن کے جسم پر بے شمار گودنے کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ اس نے ڈاکٹر کو برآمدے میں آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کمرے سے نکل کر ہارن کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

اس نے سرگوشی کی ''آواز نہ نکالیں۔ آپ کی ضرورت ہے۔ جلدی سے جوتے اور کوٹ پہن کر آ جائیں''۔

ڈاکٹر نے سوچا مس تھامپسن کو کچھ ہو گیا ہے۔

''معاملہ کیا ہے؟ کیا میں اپنے آلہ جات لے آؤں؟''

''جلدی کریں جلدی''۔

ڈاکٹر خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا۔

یہ ڈاکٹر کے لیے کوئی زیادہ خوشی کی بات نہیں تھی۔ لہذا اس نے بالواسطہ کاروائی کا فیصلہ کیا اس نے اپنی بیگم کو بتایا کہ مس تھامپسن کیا چاہتی ہے کہ وہ بیگم ڈیوڈسن سے بات کرے۔ ان مشنریوں کا رویہ قطعی آمرانہ لگتا ہے۔ اگر اس لڑکی کو مزید دو ہفتے پاگو پاگو میں رہنے کی اجازت دی جائے تو کوئی قباحت نہیں۔ لیکن وہ زیادہ پرامید نہیں تھا کہ اس کی ڈپلومیسی کا کوئی بہتر نتیجہ برآمد ہوگا لیکن مشنری بلاواسطہ ڈاکٹر کے پاس آیا۔

''بیگم نے مجھے بتایا کہ مس تھامپسن آپ سے التجا کرتی رہی۔''

اب ڈاکٹر نے معاملے پر براہ راست بات کی۔ اس کی ناراضگی اسے بہر حال کھلے میدان میں لے آئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا ہے اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے۔

''اگر وہ سان فرانسسکو کی بجائے سڈنی چلی جائے تو کیا مضائقہ ہے جبکہ وہ یہاں شرافت سے رہنے کا وعدہ بھی کر رہی ہے اس طرح اسے مجبور کرنا زیادتی ہے۔''

مشنری نے اپنی تیز نظریں اس پر گاڑ دیں۔

''وہ سان فرانسسکو جانے سے کیوں انکار کر رہی ہے۔''

''میں نے یہ معلوم نہیں کیا'' ڈاکٹر نے قدرے سختی سے جواب دیا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ کسی کے لیے صرف اپنے معاملے سے تعلق رکھنا بہتر ہوتا ہے اس کی یہاں موجودگی خطرناک ہے۔''

دونوں خواتین نے ڈاکٹر کی جانب متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن انہیں کم از کم کسی جھگڑے کا اندیشہ نہیں تھا پھر مشنری مسکرا پڑا۔

''مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ مجھے سبب سمجھتے ہو' ڈاکٹر میکفیل آپ یقین کریں اس بدقسمت عورت کے لیے میرا دل خون ہوتا ہے۔ لیکن میں صرف اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔''

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

بارش رکی ہوئی تھی خلیج کے اطراف درختوں اور مقامی لوگوں کی جھونپڑیوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے پرندے اڑتے دیکھے جا سکتے تھے۔

''میں بارش کے تھمنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اظہار خیال کیا۔

مجھے الزام نہ دینا میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ڈیوڈسن نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں' بیمار جان کر معاف کر دیجیے گا۔''

''مجھے کوئی شک نہیں کہ میری پیش کش پر آپ اپنے تئیں صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

ڈیوڈسن ہنسا۔

ڈاکٹر میکفیل نے اس کی قدرے خوشامد کی۔ چونکہ اس کے ساتھ ترشروئی کا کوئی فائدہ نہیں وہ سیڑھیوں سے نیچے اترے۔ مس تھامپسن نیم وا دروازے کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''بہت خوب۔'' اس نے پوچھا ''کیا آپ نے اس سے گفتگو کی؟''

''ہاں مجھے افسوس ہے وہ کچھ نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے جواب دیا۔ اپنی خفت میں وہ آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔

پھر اس نے جلد اس کی جانب دیکھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس نے دیکھا کہ خوف

سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر کو اپنی لاچاری کا شدید دکھ ہوا اور اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔

''لیکن آپ امید نہ ہاریں' ویسے یہ شرم کی بات ہے وہ لوگ جس طرح آپ کے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔ اب میں خود گورنر سے ملنے والا ہوں۔''

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''یہ آپ کا واقعی مجھ پر کرم ہوگا۔ اگر آپ سفارش کر دیں تو وہ مجھے رکنے کی اجازت ضرور دیں گے۔ اب میں کچھ نہیں کروں گی۔ میں ہر وقت یہاں دستیاب ہوں گی۔''

ڈاکٹر مشکل سے جان سکا کہ اس نے گورنر سے بات کرنے کی حامی کیوں بھری۔ وہ مس تھامپسن کے لیے نہایت غیر متعلق تھا لیکن مشنری نے اسے مجبور کیا۔ اس کے رویے نے اسے اندر سے دکھی کیا۔ اس نے گورنر کو اس کی رہائش گاہ پر جالیا۔ وہ ایک طویل قامت خوش شکل جہاز راں بھوری مونچھوں کے ساتھ' اس نے بے داغ سفید ڈرل کا لباس پہنا ہوا تھا۔

''میں اس خاتون کے لیے آپ سے ملنے آیا ہوں۔ وہ اسی عمارت میں ٹھہری ہوئی ہے جہاں ہم رہتے ہیں۔'' اس نے کہا ''اس کا نام تھامپسن ہے۔''

''میرا اندازہ ہے ڈاکٹر میکفیل کہ میں اس کے متعلق کافی سن چکا ہوں۔'' گورنر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے آئندہ منگل کو جزیرہ چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔''

''میں آپ سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ صرف ایک نکتے سے بندھے نہ رہیں تو اسے سان فرانسسکو سے آنے والے جہاز تک رکنے کی اجازت دے دیں تاکہ وہ سڈنی چلی جائے' دوسری جانب میں اس کے بہتر رویے کی گارنٹی دے سکتا ہوں۔''

گورنر مسکراتا رہا لیکن اس کی آنکھیں بھنچ گئیں جس سے ارتکاز جھلکتا تھا۔

''میرے لیے آپ کی بات ماننا باعث خوشی ہے۔ ڈاکٹر میکفیل لیکن میں حکم صادر کر چکا ہوں۔ اب اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔''

ڈاکٹر نے ممکن حد تک کیس کو مناسب طریقے سے پیش کیا جتنا وہ کر سکتا تھا لیکن اب گورنر کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی تھی وہ اداسی سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے سنتا رہا۔ میکفیل نے دیکھا اب وہ کوئی تاثر نہیں دے رہا تھا۔

کسی خاتون کے لیے پریشانی ہو مجھے اس کا دکھ ہے لیکن اسے منگل کو روانہ ہونا ہے۔ اب یہ طے ہو چکا ہے۔''

''لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''ڈاکٹر مجھے معاف کیجیے' میں سمجھتا ہوں کہ اپنے دفتری احکامات کے لیے کسی کو جواب دہ نہیں ہوں سوائے اپنے سرکاری ذمہ داروں کے۔''

میکفیل نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ اسے یاد تھا کہ ڈیوڈسن نے دھمکی دینے کا اشارہ دیا تھا اور وہ گورنر کے رویے میں ایک بیزاری دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے غصے سے کہا ''ڈیوڈسن ہر جگہ اپنی ٹانگ اڑا دیتا ہے۔''

''ڈاکٹر میکفیل یہ آپس کی بات ہے' میں یہ

نہیں کہتا کہ میں نے ڈیوڈسن کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم کی لیکن میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ مس تھامپسن جیسے کردار کی موجودگی کے خطرات سے آگاہ کرنے میں یقیناً وہ اپنے دائرہ اختیار میں ہے کہ ایسی جگہ جہاں مقامی لوگوں کے ساتھ مخدوش لوگوں کی بھی ایک تعداد ہے۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ڈاکٹر میکفیل کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے کہا۔

''میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔ میری کچھ مصروفیت ہے۔ بیگم میکفیل تک میرے آداب پہنچادیں۔''

ڈاکٹر اسے مضطرب چھوڑ آیا۔ وہ جانتا تھا کہ مس تھامپسن اس کا انتظار کررہی ہوگی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ خوداسے بتائے کہ وہ ناکام ہوا ہے۔ وہ پچھلے دروازے سے داخل ہوا۔ وہ دبے پاؤں سیڑھی چڑھا جیسے کچھ چھپانا چاہتا ہو۔

● رات کے کھانے میں وہ خاموش اور دبکا بیٹھا رہا لیکن مشنری چہک رہا تھا۔ ڈاکٹر میکفیل کو محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھیں فتح مندی اور شوخی سے بھری ہوئی ہیں۔ اسے اچانک لگا کہ ڈیوڈسن گورنر سے اس کی ملاقات کے بابت اور اس کی ناکامی کا حال جانتا ہے لیکن اسے کیوں کر معلوم ہوا؟ وہ اس کی شیطانی قوت کا قائل ہوگیا۔ کھانے کے بعد اس نے ھارن کو برآمدے میں دیکھا۔ وہ اس سے رسمی گفتگو کے لیے باہر نکل آیا۔

تاجر نے سرگوشی میں دریافت کیا کہ وہ جاننا چاہتی ہے کہ کیا آپ گورنر سے مل آئے؟''

''ہاں، وہ کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ مجھے انتہائی دکھ ہے۔ میں اس کے لیے مزید کچھ نہیں کرسکتا۔''

''میں جانتا تھا کہ وہ نہیں کرپائے گا۔ وہ مشنریوں کی مخالفت کی ہمت نہیں کرسکتے۔''

''تم لوگ کیا باتیں کررہے ہو؟'' ڈیوڈسن باہر آکر ان میں شامل ہوتے ہوئے سوال کیا

ھارن نے لاپروائی سے کہا'' میں تو کہہ رہا تھا کہ مزید ایک ہفتہ تک آپ لوگوں کا آپیا جانا ممکن نہیں۔''

وہ رخصت ہوا اور پارلر میں وہ دونوں رہ گئے۔

ڈیوڈسن ہر کھانے کے بعد ایک گھنٹہ آرام طلبی کے لیے مختص رکھتا تھا۔

دروازے پر ایک ہلکی سی دستک سنی گئی۔

بیگم ڈیوڈسن نے اپنی تیز آواز میں کہا'' اندر آجائیں۔''

دروازہ نہیں کھلا۔ وہ اٹھی اور دروازہ کھولا۔

مس تھامپسن درمیان میں کھڑی تھی لیکن اس کی ہیئت میں غیر معمولی تبدیلی آچکی تھی۔ اب وہ شوخ و چنچل نہیں تھی جو انہیں راہ چلتے پکار اٹھتی تھی۔ اب وہ شکست خوردہ اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ اس کے بال جو نمایاں طریقے سے سنورے ہوتے تھے' اب بے ترتیبی سے اس کی گردن پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ خواب گاہ کی چپل پہنے اور اسکرٹ بلاؤز میں تھی جو بوسیدہ اور شکن آلود تھے۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ آنسو اس کا چہرہ تر کررہے تھے۔ وہ اندر آنے کی ہمت نہیں کرپارہی تھی۔

''تم کیا چاہتی ہو؟'' بیگم ڈیوڈسن نے رکھائی سے پوچھا۔

''کیا میں ڈیوڈسن سے بات کرسکتی ہوں؟'' اس نے پھنسی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

مشنری کھڑا ہوا اور اس کی طرف بڑھا۔

''اندر آجائیں۔ مس تھامپسن'' اس نے

تکریم کے لہجے میں کہا۔
''میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''
وہ کمرے میں داخل ہوگئی۔
''میں معافی چاہتا ہوں مجھے دکھ ہے کہ اس دن میں نے آپ سے جو کچھ کہا دراصل میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔''
''نہیں یہ کوئی بات نہیں۔ ایسی سخت باتیں برداشت کرنے کا حوصلہ ہے مجھ میں۔'' اس نے کانپتے ہوئے خوفزدہ اندر قدم رکھا۔
''آپ نے مجھے شکست دے دی۔ میں پوری طرح سے آپ کے اختیار میں ہوں لیکن آپ مجھے فرسکو نہیں بھیج سکتے۔''
اس کا ہمدردانہ رویہ غائب ہوگیا۔ اسکی آواز اچانک سخت اور بلند ہوگئی۔
''تم وہاں کیوں نہیں جانا چاہتیں؟''
وہ اس کے سامنے سہمی ہوئی تھی۔
''مجھے اندازہ ہے' میرے لوگ وہاں رہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے اس حال میں دیکھیں۔ میں کہیں اور جہاں آپ کہیں جاسکتی ہوں۔''
''تم سان فرانسسکو کیوں جانا نہیں چاہتیں؟''
''میں بتا چکی ہوں۔''
وہ آگے جھکا۔ اس نے اس پر نظریں گاڑ دیں۔ تیز نگاہ جو اس کی روح کو چھید رہی ہو۔
اس نے سانس روک لیا۔
''جیل خانہ''
وہ چیخی۔ پھر اس نے گر کر اس کے پاؤں تھام لیے۔
''مجھے وہاں واپس نہ بھیجو۔ میں خدا کو گواہ بنا کر قسم کھاتی ہوں۔ اب میں ایک اچھی عورت بن جاؤں گی۔ میں یہ سب چھوڑ دوں گی۔ کنارہ کش ہوجاؤں گی۔''

......☆......

اسے اپنی زبان پر قابو نہیں رہا اور وہ مہمل الفاظ میں گناہوں کو قبول کرتے معافی کی خواستگار ہورہی تھی۔ آنسو اس کے میک اپ زدہ گالوں پر پھسل رہے تھے۔ وہ اس کے پیروں کو تھامے بیٹھی تھی۔
مشنری نے جھک کر اسے اٹھالیا اور قوت سے اس کے چہرے کو اپنی جانب کرلیا۔ ''تو کیا وہ قید خانہ''
''میں فرار ہوجاؤں گی اس سے پہلے کہ وہ مجھ تک پہنچیں۔ اگر وہ مجھے وہاں گھسیٹ لے جائیں تو تین سال کے لیے مجھے اس اذیت خانے میں رہنا ہوگا''۔
مشنری نے اپنی گرفت ڈھیلی کردی اور وہ فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ وہ ہچکیوں سے رورہی تھی۔
ڈاکٹر میکفیل کھڑا ہوگیا۔
''اس طرح سب کچھ بدل جاتا ہے۔'' اس نے کہا۔
''جب تم یہ جانتے ہوا سے زبردستی وہاں نہیں بھیج سکتے تو اسے ایک موقع دو وہ زندگی کا ایک نیا صفحہ الٹنا چاہتی ہے۔''
وہ کچھ اور سمجھتے خوش ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں امید کی کرن جگمگانے لگی۔
''تو آپ مجھے جانے دیں گے۔''
''نہیں تم منگل کو سان فرانسسکو روانہ ہوجاؤ گی۔''
وہ گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ دہشت سے کراہنے

لگی جسے مشکل سے انسانی آواز قرار دیا جا سکتا تھا۔
ڈاکٹر میکفیل اُچھل کر اس تک گیا اور اسے اٹھایا۔

''خود کو سنبھالو، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ تم اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔''

اس نے اسے اس کے پیروں پر کھڑا کر دیا اور قدرے گھسیٹتے اور قدرے چلاتے نیچے لے کر چلا۔ وہ بیگم ڈیوڈسن اور اپنی بیگم پر سخت ناراض تھا کہ وہ اس کی ذرا بھی مدد نہیں کر رہی تھیں۔ دو غلا نیچے ہی کھڑا تھا۔ اس کی مدد سے اسے بستر تک لے جانے میں کامیاب ہوا۔ وہ ابھی تک رو رہی تھی اور ماتم کناں تھی۔ وہ تقریباً ہوش کھو چکی تھی۔ اس نے اسے ایک انجکشن دیا۔ جب وہ اوپر لوٹا تو پسینہ پسینہ اور نڈھال ہو چکا تھا۔

''میں نے اسے لٹا دیا''۔

دونوں خواتین اور ڈیوڈسن ابھی تک اسی حالت میں بیٹھے تھے۔ جیسا وہ انھیں چھوڑ گیا تھا۔ نہ انہوں نے کوئی حرکت کی اور نہ ہی کچھ بولے جب سے وہ گیا تھا۔

''میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔'' ڈیوڈسن دور سے آتی عجیب سی آواز میں بولا۔ ''میں آپ سب سے چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ ہماری اس گناہگار بہن کے لیے دعا کریں۔''

اس نے شیلف سے بائبل اٹھالیا۔ وہ میز کے ساتھ بیٹھ گیا جس پر سبھوں نے کھانا کھایا تھا۔ میز ابھی صاف نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے چائے کے برتن کھسکائے۔ بلند، کھنکتی اور گہری آواز میں اس نے وہ حصہ پڑھا جہاں یسوع مسیح کا ایک خاتون سے ملاقات کا بیان ہے۔ جو زنا کی مرتکب پائی گئی تھی۔

''آئیں، میرے ساتھ گھٹنے کے بل کھڑے ہو کر ہماری عزیز بہن سیڈی تھامپسن کی روح کے لیے دعا کریں۔''

وہ گڑگڑا کر ایک گناہگار خاتون کے لیے لارڈ سے رحم کی اپیل کیے جا رہا تھا۔ بیگم میکفیل اور بیگم ڈیوڈسن بند آنکھوں کے ساتھ گھٹنے کے بل کھڑی تھیں۔ ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ وہ حیرت میں ڈوبا خود کو عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ مشنری وحشیانہ حد تک بلاغت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کا انداز غیر معمولی تھا۔ آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک رہے تھے۔ باہر بے رحم بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ مسلسل بارش خوفناک شیطانیت کا لبادہ اوڑھے۔

''اب ہم لارڈ کے آگے اپنی دعا دہرائیں گے۔''

انہوں نے دہرایا پھر اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہو گئے۔ بیگم ڈیوڈسن کا چہرہ زرد لیکن مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ اسے جیسے آرام اور سکون مل گیا تھا۔ لیکن میکفیل جوڑے نے اچانک تنہائی کی ضرورت محسوس کی۔

''میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں وہ کیسی ہے۔'' ڈاکٹر میکفیل بولا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ھارن نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

مس تھامپسن ایک اونچی کرسی پر بیٹھی تھی۔ گھٹی گھٹی سانس لے رہی تھی۔

''تم وہاں بیٹھ کر کیا کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں لیٹ جانے کو کہا تھا۔''

''میں لیٹنا نہیں چاہتی۔ میں ڈیوڈسن سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''تم کیا سمجھتی ہو اس کا کوئی فائدہ ہوگا۔ تم اسے اپنی بات سے پھرا نہیں سکتی۔''

''اس نے کہا تھا کہ اگر میں بلاؤں تو وہ ضرور آئے گا۔''

میکفیل تاجر کی جانب مڑا اور کہا۔'' جاؤ اسے پکڑ لاؤ۔''

وہ اس کے ساتھ خاموشی سے انتظار کرتا رہا۔ تاجر اسے اوپر سے لے آیا۔ ڈیوڈسن اندر داخل ہوا۔

''مجھے معاف کریں کہ میں نے آپ کو یہاں بلوایا۔'' وہ غمگین نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے بولی۔

''میں توقع کر رہا تھا کہ آپ مجھے ضرور بلائیں گی۔ میں جانتا ہوں کہ لارڈ میری دعا ضرور سنے گا۔''

دونوں نے لمحے بھر کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر اس نے اپنی نگاہیں پھیر لیں اور اس سے گفتگو کرتے وہ نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

''میں ایک بری عورت رہی ہوں۔ میں توبہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''خداوندا کا احسان کہ بالآخر اس نے ہماری دعائیں سن لیں، وہ دونوں...... کی جانب مڑا'' مجھے اس کے پاس اکیلا چھوڑ دو اور میری بیگم کو اطلاع کر دو۔ ہماری دعاؤں کا آخر کار جواب آ ہی گیا۔''

میکفیل جوڑے نے باہر نکلتے دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا۔

تاجر نے عجیب سی آواز بلند کی۔

اس رات ڈاکٹر میکفیل کافی دیر تک سو نہیں سکا۔ جب اس نے مشنری کو اوپر آتے سنا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ لیکن وہ پھر بھی بستر کو فوراً نہیں گیا۔ لکڑی کے پارٹیشن کے اس پار بلند آواز سے دعائیں جاری ہوگئیں تا وقتیکہ وہ تھک کر سو نہیں گیا۔

جب اس نے اسے صبح دیکھا۔ اس کی بدلی ہوئی ہیئت پر اسے حیرت ہوئی۔ وہ ہمیشہ سے زیادہ زرد دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں غیر انسانی چمک تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مسرت اور خوشی سے سرشار ہو۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ جا کر سیڈی کو دیکھ لیں'' اس نے کہا مجھے امید ہے کہ اس کا جسم بہتر نہیں لیکن اس کی روح بدل چکی ہے۔''

ڈاکٹر خود کو نروس اور بے ہمت محسوس کر رہا تھا۔

''آپ رات کافی دیر اس کے پاس ٹھہرے۔'' وہ بولا۔

''ہاں وہ دوبارہ تنہا ہونے سے خوف کھا رہی تھی۔''

''آپ بہت خوش نظر آرہے ہیں''۔ اس نے طنز کیا۔

ڈیوڈسن کی آنکھوں میں معنی خیز چمک لہرائی۔

''گزشتہ رات ایک بہت بڑی رحمت نے مجھے ڈھانک لیا۔ ایک بھٹکی ہوئی روح کو یسوع مسیح کے دکھ سمیٹنے والے بازوؤں تک لانے کی سعادت حاصل ہوئی۔''

مس تھامپسن دوبارہ اونچی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بستر شکن آلود تھا اور کمرہ بے ترتیب۔ اس نے خود بھی لباس بدلنے کی تکلیف نہیں کی تھی بلکہ ایک گندہ سا گاؤن پہنی ہوئی تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے ایک گانٹھ میں تھے۔ اگرچہ اس نے ایک گیلا تولیہ چہرے پر پھیر لیا تھا لیکن وہ ابھی تک متورم اور مسلسل رونے کی وجہ سے کھنچا ہوا تھا۔ وہ

آزردہ دکھائی دیتی تھی۔

''جناب ڈیوڈسن کہاں ہیں''۔ اس نے دریافت کیا۔

''اگر تم اسے بلانا چاہو تو وہ فوراً آ جائے گا۔

،،میکفیل نے چبھتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''میں صرف یہ دیکھنے آیا تھا کہ آپ کیسی ہیں۔''

''میں سمجھتی ہوں اب میں ٹھیک ہوں۔ آپ میرے خاطر پریشان نہ ہوں۔''

''آپ کے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟''

''ھارن میرے لیے کافی لایا تھا۔''

اس نے بے چینی سے دروازے کی جانب دیکھا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ جلد میرے پاس آئیں گے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ میرے پاس ہوں تو میری وحشت کچھ کم ہو جاتی ہے۔''

''کیا اب بھی منگل کو آپ کی روانگی طے ہے؟''

''ہاں وہ یہی کہتا ہے کہ مجھے جانا ہے۔ اسے بتائیں کہ وہ فوراً میرے پاس آ جائے۔ آپ میرا کچھ بھلا نہیں کر سکتے۔ صرف وہی ہے جو اس حال میں میری مدد کر سکتا ہے۔''

''بہت اچھا''۔ ڈاکٹر میکفیل بولا۔

آئندہ تین دنوں تک مشنری نے اپنا زیادہ وقت سیڈی کے ساتھ گزارا۔ وہ دوسروں سے صرف کھانے پر ملتا تھا۔ ڈاکٹر میکفیل نے غور کیا کہ وہ بڑی مشکل سے کچھ کھا لیتا تھا۔

بیگم ڈیوڈسن نے ترس کھاتے ہوئے کہا۔''اسے لباس تک کا ہوش نہیں۔ اگر اس نے اپنا خیال نہیں رکھا تو بریک ڈاؤن ہو سکتا ہے۔ اسے اپنا قطعی ہوش نہیں ہے۔''

وہ خود بھی بے رنگ اور زرد ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے بیگم میکفیل کو بتایا کہ اس کی نیند بھی پوری نہیں ہو رہی۔ جب مشنری مس تھامپسن کے پاس سے لوٹتا ہے تو دعا میں مشغول ہو جاتا ہے تاوقتیکہ تھک کر چور ہو جائے۔ اس کے باوجود وہ طویل نیند نہیں لے رہا۔ ایک یا دو گھنٹے کے بعد وہ اٹھ جاتا ہے۔ وہ کپڑے بدل کر ساحل پر چہل قدمی کو چلا جاتا ہے۔ اسے عجیب عجیب خواب آتے ہیں۔

بیگم ڈیوڈسن نے بتایا۔''آج صبح اس نے بتایا کہ وہ براسکا کے پہاڑوں کو خواب میں دیکھا ہے۔

اسے یاد تھا جب وہ امریکہ سے گزر رہا تھا۔ اس نے ریل کی کھڑکیوں سے یہ منظر دیکھ رکھا تھا۔ وہ بڑے بڑے نصف کرّہ شکل کے گول گول پہاڑ جو سطح زمین پر بے ترتیبی سے اُگے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر میکفیل کو یاد تھا کہ ان پہاڑوں کی شکل عورت کے پستان سے کتنی ملتی جلتی تھی۔

ڈیوڈسن کی بے چینی اب اس کے لیے بھی ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن قابل رشک ہمت سے وہ سب کچھ جھیل رہا تھا۔

وہ اس بے چاری خاتون کے دل کے نہاں خانوں سے گناہ کے دھبوں کو کھرچ کھرچ کر جڑ سے نکال رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بائبل پڑھتا اور دعا کرتا تھا۔

''کیسی عجیب بات ہے''ایک شام کھانے پر اس نے بتایا۔''یہ اس کا حقیقی نیا جنم ہے۔ اس کی روح رات کے اندھیروں کی طرح سیاہ ہو چکی تھی۔ اب آسمانوں سے گرنے والی نئی برف کی طرح سفید ہو چکی ہے۔''

وہ لڑکی یہ پیغام لائی۔

"مس تھامپسن نے ستائش کی۔ جہاں تک محترم ڈیوڈسن کا تعلق ہے۔ وہ میرے دھندے کے وقت نہ آئیں۔ اس کے علاوہ ان سے ملنا میرے لیے خوشی کا باعث ہوگا۔"

تمام لوگوں نے اس پیغام کو سخت قسم کی خاموشی میں سُنا۔ ڈاکٹر نے اپنے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ کو جلدی سے قابو کرلیا۔ ڈاکٹر جانتا تھا کہ اگر وہ مس تھامپسن کی جرأت کی ذرا بھی تعریف کرے تو اس کی بیوی ضرور بل کھائے گی۔

انہوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ دونوں خواتین نے اپنے کام سنبھال لئے۔ میکفیل نے بیشمار کمبلوں کی طرح جو اس نے جنگ کے ابتدائی زمانے سے بنانا شروع کیا تھا ایک اور بنا ڈالا۔ ڈاکٹر نے اپنا پائپ سلگالیا۔ لیکن ڈیوڈسن ابھی تک اپنی کرسی میں دھنسا ہوا تھا اور خالی نظروں سے میز کو تکے جا رہا تھا۔ آخر وہ اُٹھا اور ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ انہوں نے اس کے نیچے اترتے، مس تھامپسن کو بلند آہنگ تشریف لائیے سُنا جب اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اس کے پاس ایک گھنٹہ تک رُکا رہا۔ ڈاکٹر میکفیل بارش دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے اعصاب کو قابو کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بارش ہماری انگلینڈ کی طرح نہیں تھی جو نہایت سبک روئی سے زمین پر آتی تھی۔ یہ بے رحم اور کسی حد تک وحشتناک آپ اُسے فطرت کی طاقت کے بے محابا استعمال کے طور پر محسوس کریں گے۔ یہ برستی نہیں بلکہ بہتی تھی۔ جیسے آسمان سے سیلاب اُبل پڑا ہو۔ بل کھائے لوہے کی چادروں پر شور مچاتی گرتی تھی جو کسی کو پاگل کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس کی اپنی ایک دہشت نظر آتی تھی بعض مرتبہ ایسا محسوس ہوتا کہ اگر یہ رکے تو آپ یقیناً چیخنے لگیں گے لیکن جلد ہی آپ کو اپنی بے بسی کا علم ہو جاتا۔ جیسے آپ کی ہڈیاں اچانک نرم ہوتی جاتی ہیں۔ بس آپ پریشان اور مایوس ہو جاتے ہیں۔

جب مشنری واپس آیا تو دونوں خواتین نے اس پر نظر ڈالی" میں نے اسے تمام مواقع دیئے۔ اسے پشیمان ہونے پر اکسایا۔ لیکن وہ ایک شیطان عورت ہے۔"

وہ رکا۔ ڈاکٹر نے دیکھا اس کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ اس کا زرد چہرہ مزید سخت ہوگیا تھا۔

"اب مجھے وہی کوڑا اُٹھا لینا چاہیے جس سے لارڈ یسوع مسیح نے زانیوں اور سود خوروں کو بڑی عبادت گاہ سے مار بھگایا تھا۔"

وہ کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اس کا منہ سختی سے بھنچا ہوا تھا۔ اور اس کے کالے بھنوؤں پر بل پڑ رہے تھے۔

"اگر وہ دنیا کے کونے تک چلی جائے گی تو میں اس کا پیچھا کروں گا۔" اچانک وہ گھوما اور کمرے سے تیزی سے لمبے ڈگ بھرتے نکلا۔

انہوں نے اسے نیچے جاتے سنا۔

بیگم میکفیل نے پوچھا۔" یہ کیا کرنے والے ہیں۔"

"میں نہیں جانتی۔" وہ ناک سے چشمہ اتار کر صاف کرتے ہوئے بولی۔

"جب وہ خداوندا کے کام پر ہوتے ہیں تو میں سوال نہیں کرتی۔" اس نے آہ بھری۔

"کیا معاملہ ہے؟"

"وہ خود کو تھکا لے گا' کیا وہ خود کو الگ تھلگ نہیں رکھ سکتا؟"

ڈاکٹر میکفیل کو مشنری کی کارگزاری کا علم اس

دو غلے تاجر سے ہوا۔ جس کے مکان میں وہ لوگ قیام پذیر تھے۔ اس نے ڈاکٹر کو اپنے اسٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تو اسے کچھ بتانے کے لئے روک لیا۔ اس کا پر گوشت چہرہ پریشان دکھائی دیتا تھا۔

''محترم ڈیوڈسن میرے پاس آئے تھے کہ مس تھامپسن کو ایک کمرہ دے دیا جائے۔'' اس نے بتایا۔ لیکن اسے کرائے پر کمرہ دیتے ہوئے میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ جب لوگ میرے پاس اس کی سفارش لے کر آئے تو میں صرف یہ جاننے میں دلچسپی رکھتا تھا کہ وہ کرایہ ادا کرسکتی ہے یا نہیں۔ اور اس نے ایک ہفتے کا کرایہ مقدم ادا کر دیا تھا۔''

ڈاکٹر خود کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔

''سب کچھ باہم طے کر کے لوگوں نے یہاں قیام کیا۔ بہر حال یہ آپ کا مکان ہے اور ہم سب شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمیں چھت فراہم کی۔''

ھارن اسے مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ ابھی تک اندازہ کر رہا تھا ڈاکٹر مشنری کی حمایت میں ہے یا نہیں؟''

مشنری ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ داخل ہوئے۔ اس نے جھکتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی تاجر کی حیثیت سے آئے تو میں اپنی دکان بند کر کے یہ جگہ تک چھوڑ سکتا ہوں۔

کیا وہ تم سے چاہتے ہیں کہ اسے نکال دیا جائے۔''

''نہیں جب تک وہ شرافت کا مظاہرہ کرتی ہے انہوں نے اسے نکالنے کا مطالبہ نہیں کیا۔ وہ میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر رہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اب اس کے پاس لوگ نہیں آئیں گے۔ میں نے خود مس تھامپسن کو جا کر بتا دیا ہے۔''

''اس نے کیسا محسوس کیا؟''

''وہ سخت ناراض ہوئی اور مجھے برا بھلا کہا۔''

تاجر نے اپنے سر اور مونڈھوں کو جھکا لیا۔ مس تھامپسن اس کے لئے ایک مشکل گراہک ثابت ہو رہی تھی۔

''میں یہاں تک کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ وہ خود چلی جائے گی۔ اگر اس کے پاس کوئی نہ آئے تو وہ خود یہاں رہنا نہیں چاہے گی۔''

''یہاں اس کے لئے سوائے مقامی جھونپڑی کے اور کوئی جگہ نہیں جہاں وہ جائے اور مقامی اسے قبول نہیں کریں گے چونکہ مشنریوں نے اپنا خنجر مس تھامپسن میں پیوست کر دیا ہے۔''

ڈاکٹر میکفیل باہر گرتی بارش کو دیکھتا رہا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ معاملات کے صاف ہونے تک انتظار کرنے میں کوئی بھلائی ہے۔''

شام جب وہ پارلر میں بیٹھے تھے۔ ڈیوڈسن نے ان سے اپنے کالج کے ابتدائی دنوں کی بات کی اس کے کوئی وسائل نہیں تھے۔ چھٹیوں کے دوران میں الٹے سیدھے کام کر کے وہ گزارا کرتا۔ نیچے خاموشی تھی۔ مس تھامپسن اپنے چھوٹے سے کمرے میں تنہا بیٹھی تھی۔ لیکن اچانک گراموفون بجنے لگا۔ اس نے ایسا چیلنج کے طور پر اپنی تنہائی کو دھوکا دینے کے لئے کیا۔ لیکن وہاں گانے کے لئے کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک مغموم دھن تھی یا مدد کے لئے پکارتی ایک چیخ تھی۔ ڈیوڈسن نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ اپنی کہانی کے درمیانی حصے میں تھا۔ اس کے

ظاہرہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ گراموفون بجتا رہا۔ مس تھامپسن ایک ریل کے بعد دوسرا چڑھاتی رہی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رات کی تنہائی اس کے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ جبس کے مارے سانس تک رک رہی تھی۔ میکفیل تھوڑا سونے کے لئے گیا تو، سو نہیں سکے۔ وہ آنکھیں کھولے ساتھ ساتھ لیٹے رہے مچھر دانی کے باہر، مچھروں کی ظالمانہ سنگیت جاری تھی۔

''یہ کیا ہے'' بیگم میکفیل نے بالآخر آہستہ سے کہا۔

انہوں نے ایک آواز سنی۔ لکڑی کی دیوار کی دوسری جانب سے آتی ہوئی عاجزی سے ایک لے میں پکارتی ہوئی وہ بلند آواز سے دعا کر رہا تھا۔ وہ مس تھامپسن کی روح کے لئے دعا گو تھا۔

دو یا تین دن گزرے ہوں گے۔ سڑک پر ان کا مس تھامپسن سے سامنا ہوا تو اس نے کسی طنزیہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال نہیں کیا۔ وہ کان کھڑے کئے وہاں سے گزر گئے۔ اس کے میک اپ زدہ چہرے پر اداسی تھی اور پیشانی پر بل۔ وہ ایسے گزر گئی جیسے دیکھا نہ ہو تاجر نے اسے بتایا کہ وہ دوسری رہائش کی تلاش میں ہے۔ لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی شام اس نے گراموفون کی کئی ریلیں دوبارہ چلائیں جیسے وہ خوشی ظاہر کرنا چاہتی ہو لیکن موسیقی میں تڑخنے اور دل ٹوٹنے کی کیفیت نمایاں تھی جو مایوسی کی طرف لے جاتی ہے جب اس نے اتوار کو بھی گراموفون بجایا تو ڈیوڈسن نے ہارن کو بھیجا کہ آج کا دن خداوندا کا دن ہے آج نہ بجائے لہٰذا موسیقی کی آواز ختم ہوگئی اور خاموشی چھا گئی سوائے لوہے کی چادر پر پڑنے والی بارش کی آواز کے۔

''میں سمجھتا ہوں جیسے وہ کچھ تیاری کر رہی ہے۔'' دوسرے دن تاجر نے میکفیل کو بتایا اسے پتا نہیں کہ ڈیوڈسن کیا کرنے جا رہا ہے۔ اس لیے وہ قدرے خوفزدہ ہے۔

اس روز میکفیل اس کی ایک جھلک دیکھ سکا اور اسے حیرت ہوئی کہ اس کا جارحانہ رویہ تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ متلاشی تاثر تھا۔ دوغلے نے اس پر ایک ترچھی نگاہ ڈالی۔

''میں سمجھتا ہوں کہ شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ ڈیوڈسن کیا کرنے والے ہیں۔'' اس نے مجھے چونکا دیا۔

''نہیں، میں نہیں جانتا۔''

اسے یقین تھا کہ ہارن اس سے یہ ضرور پوچھے گا اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ مشنری رازدارانہ طریقے سے کچھ کر رہا تھا۔

وہ یہ خیال کر رہا تھا کہ وہ اس عورت کے گرد کوئی جال بن رہا ہے۔ احتیاط سے ترتیب وار۔ جب ہر چیز تیار ہو جائے گی تو وہ رسّی کھینچ لے گا۔

اس نے مجھے اسے خبردار کرنے کے لیے کہا۔ تاجر بولا ''اگر اسے کسی وقت میری ضرورت پڑ جائے کسی کو بھیج دے میں فوراً آجاؤں گا۔''

''تو اس نے کیا کہا جب تم نے یہ پیغام دیا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن میں نے اپنی پیش کش دہرا دی اور پوچھتا رہا مجھے لگا وہ رونے والی ہے۔

''مجھے کوئی شک نہیں کہ تنہائی اس کے اعصاب پر چھاتی جا رہی ہے اور یہ بارش کسی کو بھی بے چین کرنے کے لیے کافی ہے۔ کیا اس قید کے ماحول میں اسے روکا جا سکتا ہے۔''

''یہاں مستقل اسی طرح بارش ہوتی رہتی ہے۔ یہاں سال کے 300انچ بارش ہوتی ہے آپ دیکھیں خلیج کی کیا شکل بنی ہے۔ یہ تمام بحر الکاہل سے کھینچ کر پانی یہاں لاتی ہے۔''

''خدا خلیج کی اس شکل کو تباہ کرے۔'' ڈاکٹر نے بددعا کی۔

اس نے اپنے مچھر کے کاٹے کو کھجایا۔ وہ کافی سریع الغضب ہو رہا تھا۔ جب بارش رکی اور دھوپ نکل آئی۔ گرمی نے اس کے گھر کو تنور بنا دیا تھا۔ جہاں حبس، بے چینی اور تشدد تک موجود تھا اور لوگوں میں ایک عجیب احساس جاگ رہا تھا جو انہیں وحشیانہ رویے کی طرف لے جاتا تھا۔

مقامی لوگ جو بچکانہ رویّے اور خوش مزاجی کی شہرت رکھتے ہیں اس وقت اپنے Tattoo کے نشان اور رنگین بالوں سے اپنے ظاہرہ میں شیطان دکھائی دیتے تھے۔ جب وہ اپنے ننگے سروں سمیت آپ کے ایڑی کے پیچھے پیچھے چلے آرہے ہوں تو آپ پلٹ کر پیچھے ضرور دیکھتے ہیں جیسے آپ کو خطرہ ہو کہ وہ آپ کی پشت پر دونوں مونڈھوں کے درمیان خنجر نہ اتار دیں چونکہ آپ کو قطعی اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کی بڑی سیاہ آنکھوں کے پیچھے کیسے خطرناک خیالات پل رہے ہیں۔ ان کا حلیہ چرچوں کی دیواروں پر بنے پرانے مصریوں جیسا تھا اور ان سے ناقابلِ اندازہ پرانی دہشت کا تاثر قائم تھا۔

مشنری آیا اور لوٹ گیا۔ وہ مصروف دکھائی دیتا تھا لیکن میکفیل کو اندازہ نہیں تھا کہ ڈیوڈسن کیا کر رہا ہے۔ ھارن نے ڈاکٹر کو بتایا کہ وہ روز گورنر سے ملنے جاتا ہے۔ ایک روز مشنری نے بھی اس سے یہی ذکر کیا۔

وہ یقین واعتماد سے پُر دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کہا ''لیکن جب اصل معاملہ سامنے ہوگا تو وہ ٹھہر نہیں سکے گا۔''

''اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ کچھ ایسا نہیں کرے گا جو تم چاہتے ہو'' ڈاکٹر نے خوشدلی سے کہا۔

مشنری مسکرایا ''نہیں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ وہ صحیح قدم اٹھائے۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی کو ترغیب دی جائے۔ لیکن اس میں اختلاف ہوسکتا ہے کہ صحیح کیا ہے۔''

''اگر کسی کے پاؤں میں گینگرین ہو اور کوئی اسے کاٹنے میں جھجک محسوس کرے تو کیا تم یہ برداشت کرلوگے۔''

''گینگرین ایک حقیقت ہے اس کا کوئی علاج نہیں۔''

''اور شیطانیت۔''

جو مجھے ڈیوڈسن نے کہا تھا وہ جلد ظاہر ہوگیا۔ ان چاروں نے ابھی ابھی دوپہر کا کھانا ختم کیا تھا اور قیلولہ کے لیے ابھی تک الگ نہیں ہوئے تھے گرمی کی بنا پر جس کے وہ عادی ہوگئے تھے۔ ڈیوڈسن میں اس کاہلی کے خلاف قدرے برداشت تھی۔ اچانک دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ مس تھامپسن اندر آئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر ڈیوڈسن کی طرف بڑھی۔

''تم بدبودار رینگنے والی مخلوق۔ تم میرے خلاف گورنر کے کان بھرتے رہے۔''

وہ غصے سے بے قابو ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد مشنری نے ایک کرسی اس کے سامنے کردی۔

مس تھامپسن کیا آپ تشریف نہیں رکھیں گی۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ سے ایک مرتبہ اور

''آئندہ منگل کو سان فرانسسکو کی کشتی سڈنی سے آنے والی ہے۔اسے اس پر روانہ ہونا ہے۔''

پانچ دن گزرے تھے۔ ڈاکٹر ایک روز اسپتال سے لوٹ رہا تھا جہاں وہ صبح کا بیشتر وقت گزارتا تھا۔ دوغلے مکان مالک نے اسے اوپر جاتے سیڑھیوں پر روکا۔

''کیا آپ مس تھامپسن کو ایک نظر دیکھ لیں گے وہ بیمار ہے''

ڈاکٹر نے جواب دیا ''یقیناً۔''

ھارن ڈاکٹر کو اس کے کمرے تک لے گیا۔ وہ ایک کرسی پر ساکت بیٹھی تھی۔ نہ وہ پڑھ رہی تھی اور نہ ہی کچھ سی رہی تھی۔ صرف سامنے دیکھے جا رہی تھی ۔ اس نے اپنا سفید لباس پہن رکھا تھا اور پھولوں سے مزین ہیٹ اس کے سر پر تھا۔ میکفیل نے محسوس کیا کہ اس کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔ پاؤڈر کے باوجود دھندلائی ہوئی تھی اور آنکھیں بوجھل تھیں۔

''مجھے یہ جان کر دکھ ہوا کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں حقیقت میں بیمار نہیں بلکہ مجھے فرسکو والی کشتی میں روانہ ہونا ہے۔''

اس نے ڈاکٹر کو دیکھا اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کو سختی سے بھینچ رہی تھی۔ تاجر دروازے پر کھڑا سن رہا تھا۔

''میں اب سمجھا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

اس نے ہچکی لی۔

''میرا خیال ہے کہ میرا فوری فرسکو جانا مناسب نہیں۔ میں گذشتہ دوپہر گورنر سے ملنے گئی تھی لیکن ملاقات نہ ہوسکی۔ سیکریٹری مجھ سے ملا اور بتایا کہ میری روانگی طے کی جا چکی ہے لیکن مجھے گورنر سے ملنا ہی تھا۔ لہٰذا آج صبح میں اس کے گھر کے باہر انتظار کرتی رہی۔ جب وہ باہر آیا۔ میں نے اس سے بات کی۔ وہ مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے اسے خود کو نظر انداز کرنے نہیں دیا۔ بالآخر اس نے کہا سڈنی جانے والی آئندہ کشتی تک اگر میں رکنا چاہوں تو اسے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ ڈیوڈسن اس کے لیے راضی ہو جائیں۔''

وہ رکی اور اس نے مضطرب ہو کر ڈاکٹر کو دیکھا۔

اس نے کہا اسے نہیں معلوم کہ وہ کروا سکتا ہے یا نہیں۔

''میں نے سوچا شاید آپ اسے راضی کر سکیں۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ میں یہاں وہ سب کبھی بھی شروع نہیں کروں گی اگر وہ مجھے یہاں رکنے کی اجازت دے دے۔''

''میں گھر میں مقید رہوں گی' اگر وہ مناسب جانیں۔ یہ دو ہفتے سے زیادہ کی بات نہیں ہے۔''

''میں اس سے ضرور پوچھوں گا۔''

''وہ راضی نہیں ہوگا۔'' ھارن نے کہا۔ ''وہ آپ کو آئندہ منگل کو روانہ کر کے رہے گا لہٰذا آپ ذہنی طور پر جانے کی تیاری کر لیں۔''

''اسے بتائیں مجھے سڈنی جاتے ہی کام مل جائے گا۔ میرا مطلب ہے میں اس سے کچھ زیادہ تو نہیں مانگ رہی۔''

''میں دیکھتا ہوں کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''مجھے فوراً آ کر بتائیے گا۔ کیا آپ اتنی مہربانی کریں گے؟ میں اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتی جب تک معاملہ ادھر یا اُدھر نہ ہو جائے۔''

اس نے پاجامے پر ایک برساتی ڈال لی اور ربر سول کے جوتے۔ وہ تاجر کے ساتھ ہو گیا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ بے آواز سیڑھیاں اترتے گئے۔ سڑک کی سمت والا دروازہ کھلا تھا اور وہاں تقریباً نصف درجن مقامی کھڑے تھے۔

''بات کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے دوبارہ پوچھا۔

ھارن نے کہا ''بس میرے ساتھ آیئے''۔

وہ چلا اور ڈاکٹر اس کے پیچھے۔ مقامی لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ان کے پیچھے۔ وہ سڑک پار کر کے ساحل پر آ گئے۔ ڈاکٹر نے مزید مقامی لوگوں کو پانی کے کنارے کسی چیز کے اطراف گھیرا ڈالے دیکھا۔ اس نے درجن گز بھر کا فاصلہ لپک کر طے کیا۔ مقامی لوگوں نے ڈاکٹر کے لیے راستہ بنا دیا۔ تاجر نے ڈاکٹر کو آگے دھکیلا۔ اس نے دیکھا ڈیوڈسن کا جسم آدھا پانی کے اندر اور آدھا باہر ایک دہشتناک شے کے طور پر۔ ڈاکٹر نیچے جھکا۔ وہ ایمرجنسی میں اپنے حواس کھونے والا شخص نہیں تھا۔ اس نے جسم کو الٹ دیا۔ حلق کان سے کان تک کٹا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ابھی تک استرا تھا۔ جس سے یہ کارنامہ انجام دیا گیا۔

''وہ بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا'' ڈاکٹر نے بتایا ''وہ ایک گھنٹہ پہلے مر چکا تھا۔''

''ایک لڑکے نے کام پر جاتے اسے دیکھا اور مجھے آ کر بتایا۔ کیا آپ سمجھتے ہو کہ اس نے خود سے سب کچھ کیا۔''

''ہاں کسی کو پولیس بلانے کے لیے فوراً جانا چاہیے''۔

ھارن نے مقامی زبان میں کچھ کہا اور دو لڑکے دوڑ پڑے۔

''ہم اسے یہیں رہنے دیں جب تک پولیس نہ آ جائے۔'' ڈاکٹر بولا۔

''نہیں اسے ہرگز میرے گھر نہ لے جایا جائے۔ میں اسے اپنے گھر نہیں رکھوں گا۔''

''تم وہی کرو جو قانون نافذ کرنے والے کہیں''۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''حقیقت میں وہ لوگ اسے مردہ خانے لے جائیں گے''۔

وہ لوگ وہیں کھڑے انتظار کرتے رہے۔ تاجر نے اپنے لاوا لاوا سے ایک سگریٹ نکالا اور ایک ڈاکٹر کو دیا۔ وہ سگریٹ پیتے لاش کو دیکھتے رہے۔ میکفیل کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''اس نے ایسا کیوں کیا''۔ ھارن نے پوچھا۔

''ڈاکٹر نے اپنا کاندھا ہلا دیا۔ تھوڑی دیر میں مقامی پولیس میرین کی کمانڈ میں وہاں ایک اسٹریچر کے ساتھ پہنچ گئی۔ ان کے پیچھے نیوی کے چند افسران اور ایک نیول ڈاکٹر بھی وہاں آ گئے۔ انہوں نے تمام کارروائی پیشہ ورانہ طریقے سے انجام دی۔

''اس کی بیوی کیسی ہے'' نیول افسر میں سے ایک نے دریافت کیا۔

''اب چونکہ آپ لوگ آ گئے ہیں۔ میں واپس مکان میں جا کر دیکھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں یہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ بہتر ہے وہ لاش اس وقت دیکھے جب اسے قدرے صحیح کر دیا جائے''۔

''میرا خیال کہ یہ مناسب ہے۔'' نیول ڈاکٹر بولا۔

جب میکفیل واپس لوٹا۔ اس کی بیوی تقریباً تیار ہو چکی تھی۔

''بیگم ڈیوڈسن اپنے شوہر کے لیے ایک عالم

وحشت میں ہے"۔ بیگم میکفیل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔"وہ ساری رات بستر پر گیا ہی نہیں۔ اس نے اسے مس تھامپسن کے کمرے سے رات دو بجے نکلتے سنا۔ لیکن وہ باہر چلا گیا۔ اگر وہ اس وقت سے چہل قدمی کر رہا تھا تو اب تک وہ قطعی جان سے جا چکا ہوگا۔"

ڈاکٹر نے بیگم کو بتایا کہ ڈیوڈسن کے ساتھ کیا ہوا۔ اب وہ بیگم ڈیوڈسن کو جا کر سب کچھ بتا دے۔

"لیکن اس نے ایسا کیوں کیا۔" اس نے سکتے کی کیفیت میں پوچھا۔

"میں نہیں جانتا"۔

"میں بتا نہیں سکتا۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"تمہیں ضرور بتانا چاہیے۔"

وہ خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھتی چلی گئی۔ اس نے سنا وہ بیگم ڈیوڈسن کے کمرے میں گئی۔ اس نے چند منٹوں میں خود کو سنبھالا اور شیو کرنا شروع کیا۔ جب وہ لباس تبدیل کر چکا۔ پلنگ پر بیٹھ گیا اور اپنی بیگم کا انتظار کرنے لگا۔ آخر وہ لوٹ آئی۔ اس نے بتایا وہ شوہر کی لاش دیکھنا چاہتی ہے۔"بہتر ہے، ہم اسے ساتھ لے جائیں، نہ جانے یہ سب دیکھ کر کیسا برتاؤ کرے۔

"مجھے لگتا ہے اسے سکتہ ہو گیا ہے۔ وہ بالکل نہیں روئی۔ لیکن وہ ایک سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔"ہمیں چاہیے کہ ہم فوراً اس کے پاس چلیں"۔

انہوں نے جب اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیگم ڈیوڈسن باہر آئی۔ وہ قطعی زرد ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ ڈاکٹر اس کے رویے کو غیر فطری بتا رہے ہیں۔ کسی نے کچھ نہیں کہا اور وہ لوگ سڑک پر آ گئے۔ جب وہ مردہ خانے پہنچے۔ بیگم ڈیوڈسن بولی۔

"مجھے اکیلے اندر جانے اور اسے دیکھنے دیں"۔ وہ لوگ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ایک مقامی نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور اس کے پشت پر بند کر دیا۔ وہ بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ ایک دو سفید فام آئے اور ان سے دبی زبان میں بات کی۔ اس اندوہناک واقعے کے متعلق ڈاکٹر جو کچھ جانتا تھا اسے بتایا۔

آخر کار دروازہ دوبارہ کھولا۔ بیگم ڈیوڈسن باہر آئی۔ خاموشی سب پر چھائی ہوئی تھی۔

"میں اب واپس جانا چاہتی ہوں۔" اس نے بتایا۔

اس کی آواز سخت لیکن سنبھلی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر میکفیل اس کی آنکھوں میں کچھ پڑھ نہیں پایا۔ اس کا زرد چہرہ بہت سخت ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ وہاں سے لوٹے۔ ایک لفظ کہے بغیر وہ لوگ اس موڑ تک پہنچ گئے۔ جس کی دوسری طرف ان کا مکان کھڑا تھا۔ بیگم ڈیوڈسن نے زور سے سانس لیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ساکت کھڑی رہی۔ ایک عجیب آواز نے ان کے کانوں پر حملہ کر دیا۔ وہ گراموفون جو عرصے سے بند تھا۔ اب چل پڑا تھا۔ بلند آہنگ، دھما دھم اور اذیت ناک۔

"یہ کیا ہے"۔ بیگم میکفیل دہشت سے چلائی۔ بیگم ڈیوڈسن نے کہا" میں اوپر جانا چاہتی ہوں"۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر آئے اور ہال میں داخل ہوئے۔ مس تھامپسن اپنے دروازے پر ایک ملاح سے خوش گپی کرتی کھڑی تھی۔ اچانک اس میں ایک تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ اب وہ گزشتہ دنوں کی پژمردہ اور بزدل نہیں تھی۔ اب وہ بہترین لباس میں ملبوس۔ اس کا سفید لباس، اونچے چمکتے بوٹ

جس کے اوپر اس کی گداز ٹانگیں سوتی موزے کے اندر سے چھلک رہی تھیں۔ اس کے بال شان سے سنورے ہوئے تھے۔ اس کا شاندار ہیٹ باسی پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ چہرے پر میک اپ بھنوؤں کی سیاہی نمایاں لگ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر سرخی جھلک رہی تھی۔ وہ سیدھی تنی کھڑی تھی۔ وہ ایک لہراتی ہوئی ملکہ تھی جسے ہم نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ جب وہ لوگ اندر آئے تو اس نے بلند آہنگ تضحیک آمیز قہقہہ لگایا۔ اور جب بیگم ڈیوڈسن نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں رکی تو اس نے منہ میں لعاب اکٹھا کر کے تھوک دیا۔ بیگم ڈیوڈسن سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے دونوں گالوں پر دو سرخ نشان چمکے۔ پھر اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے وہ روپڑی اور اوپر بھاگی۔

ڈاکٹر میکفیل کو غصہ آیا اور اس نے خاتون کو کمرے میں دھکیل دیا۔

''یہ تم نے کیا شیطانیت برپا کی ہوئی ہے۔ اس شیطانی مشین کو بند کرو۔'' وہ اندر گیا اور اس کے ریکارڈ کو پھاڑ ڈالا۔ وہ اس کی طرف مڑی۔

''بتاؤ ڈاکٹر کیا تم میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہو۔ تم میرے کمرے میں آخر کیا کر رہے ہو۔''

''تمہارا مطلب کیا ہے''۔ وہ چلایا۔ ''تمہارا مطلب کیا ہے۔''

اس نے اپنے آپ کو مجتمع کیا۔ کوئی اس کے رویّے میں موجود تضحیک اور ہتک کو بیان نہیں کر سکتا جو اس نے اپنے جواب میں شامل کیا۔

''تم مرد لوگ غلیظ گندے سوّر۔ تم سب ایک جیسے ہو۔ تم سب صرف سوّر اور صرف سوّر ہو۔''

ڈاکٹر میکفیل نے حلق تر کیا۔ وہ سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ ☆☆☆

غزل

زیب النساء زیبی

اس کے آنے کا جو امکان نظر آتا ہے
سانس لینا مجھے آسان نظر آتا ہے

جانے کیا مجھ پہ فسوں گر نے کیا ہے جادو
مجھ کو صحرا بھی گلستان نظر آتا ہے

ایک میں ہی نہیں حیران تری بستی میں
مجھ کو ہر شخص ہی حیران نظر آتا ہے

تجھ ہی کو دل میں بسانے کے لیے آئی ہوں
تو ہی دل کا مرے مہمان نظر آتا ہے

ایک وہ شخص مرے ساتھ نہیں ہے تو مجھے
شہر کا شہر ہی ویران نظر آتا ہے

یاد آتی ہے غریب الوطنی اپنی بھی
کوئی جب بے سر و سامان نظر آتا ہے

اپنی نادانی سے واقف ہے، جبھی تو اکثر
وہ خطاؤں پہ پشیمان نظر آتا ہے

تیری بستی میں، اُجالا ہی نہیں چاہت کا
کیا کوئی صاحبِ عرفان نظر آتا ہے

معجزہ اندھی عقیدت کا اِسے کہتے ہیں
اپنا پیارا مجھے بھگوان نظر آتا ہے

زالِ دنیا سے نہ کھیلو، کبھی دنیا والو!
کھیل میں اس کے تو، نقصان نظر آتا ہے

زیبی جس شخص کو آجائے شعورِ ہستی
وہی اک آئینہ سامان نظر آتا ہے

☆☆☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کین منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

عزیز بچو!

اللہ تم سب کو صحت و تندرستی کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے۔ تم لوگ مجھے اپنا بزرگ مان کر اپنی زندگی کے بہت سے ایسے معاملات سامنے رکھتے ہو جن کی پردہ داری ضروری ہے میں اس مان اور بھروسے پر تم سب کا تہہ دل سے مشکور ہوں اور یہی وجہ ہے کہ بہت مختصر جواب دیتا ہوں تاکہ جس کا مسئلہ ہے بات صرف اسی کو سمجھ میں آئے یہ وضاحت اس لیے ضروری تھی کہ کچھ لوگوں کو شکایت ہے کہ میں مختصر جواب دیتا ہوں۔

آنے والا مہینہ ذیقعد کا ہے اور اس کے بعد ذی الحج جس کے دس دن نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور نکالا کرو۔ جس افراتفری کا روزِ محشر ذکر کیا گیا ہے ہم لوگ اپنی زندگیوں میں آئے دن یہی صورت حال دیکھ رہے ہیں دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو۔ سورۃ بقرۃ کو تھوڑا تھوڑا روز ترجمے کے ساتھ پڑھو، جو لوگ اپنی زندگیوں کو قرآن و سنت کے مطابق گزاریں گے وہ کبھی ناکام نہ ہوں گے۔

□ ثناء۔ مقام نامعلوم

○ السلام علیکم! بابا جی میری طرف سے آپ کو ڈھیر ساری دعائیں میں بہت دکھی اور غریب لڑکی ہوں ہمارے مسائل کی طرف توجہ فرمائیں بابا جی میرے دو بڑے بھائی ہیں۔ ہماری شادی کا بہت مسئلہ ہے میرے بھائیوں کی بات تو ہو جاتی ہے پر شادی تک پہنچنے سے پہلے بات ٹوٹ جاتی ہے بابا جی ہم چاہتے ہیں ہم تینوں کی اسی سال شادی ہو جائے میرے لیے اچھے سلجھے ہوئے پڑھے لکھے لڑکے کا رشتہ آجائے اور شادی کے بعد کچھ دنوں بعد میں باہر ملک بھی چلی جاؤں میں سکھی اور پُرسکون زندگی گزار سکوں۔ پلیز ہماری رہنمائی کریں میری جن سے شادی ہو وہ دماغ کے ٹھنڈے ہوں۔ میرے ساتھ پیار محبت سے رہیں۔ اُن کے گھر والے بھی میرے ساتھ اچھے ہوں۔ پلیز ہماری مدد کریں۔ میرے اندر کے سارے عیب چھپ جائیں میرے شوہر اور سسرال والوں سے، پلیز میری مدد کریں اور ہم لوگوں نے 2012ء میں اپنے چچا شہاب الدین سے برابر کا مکان لیا تھا جب سے وہ مکان لیا ہے کام بگڑتے جارہے ہیں۔ اُس گھر میں کسی کے ہونے کا احساس ہوتا ہے سونے میں ڈر لگتا ہے۔ جیسے کوئی چیز ہمارے آس پاس ہو۔ میری والدہ کو بھی خوف محسوس ہوتا ہے آپ دیکھ کر بتائیں کہ اس گھر میں کیا ہے جو کام بگڑتے جارہے ہیں۔ میرے بھائی طارق طاہر کے روزگار کا بھی بہت مسئلہ ہے اُن کو ٹھیک روزگار نہیں مل رہا ہے۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں نقصان ہوتا ہے۔ ہماری والدہ بھی بہت بیمار رہتی ہیں ہر وقت مرنے کی دعائیں کرتیں ہیں۔ چڑچڑی ہوگئی ہیں غصہ کرتی ہیں بات بات پر، آپ سب معاملات دیکھ کر بتائیں ہم اپنا گھر بھی فروخت کرنا چاہتے ہیں جس میں ہم چاہتے ہیں کہ اچھے داموں سے گھر فروخت ہوجائے آپ تعویذ بھی دے دیں۔ ہمارے کام بھی بن جائیں۔ ہمارے مسائل جلد سے جلد حل کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری شادی بھی اسی سال بناء رکاوٹ

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122-35893121-021

وبندش ہنسی خوشی سے ہوجائے ہم بہت پریشان ہیں۔ اس کا جواب جلد سے جلد اور لازمی دیں۔ میری شادی کے لیے تعویذ اور وظائف بھی دیں کہ میں جلد سے جلد اپنے گھر کی ہوجاؤں اور میرے بھائی بھی آپ کے لیے بہت سی دعائیں اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وتندرستی دے۔

☆بیٹی ثناء! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو' سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے تعویذ کے سلسلے میں تفصیل معلوم کرلو۔ تمہاری بھی کچھ معلومات درکار ہوں گی۔ میں خصوصی دعا کا اہتمام رکھوں گا۔ انشاء اللہ مسائل رفتہ رفتہ کم ہوں گے اور پھر ختم......

□ بیٹی۔کراچی

o پیارے بابا جان...... اسلام علیکم! ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں میری بیٹی اپنے سسرال کے ساتھ رہتی ہے۔ گھر میں ساس' سسر کے علاوہ ایک طلاق یافتہ نند اس کی تین بیٹیاں عمریں بالترتیب 18' 16 اور 11 ہے ایک جیٹھ اور جیٹھانی اور میری بیٹی اور داماد...... مسئلہ چوری کا ہے سات آٹھ مہینے پہلے میری بیٹی کی ساس کی سونے کی دو چوڑیاں گھر سے چوری ہوگئیں۔ ساس نے زیادہ شور نہیں کیا اب میری بیٹی کے سسر کی وقفے وقفے سے ٹوٹل دس ہزار کی رقم چوری ہوئی اور ساتھ ساتھ میری بیٹی کی ساس کے پچیس یا تیس ہزار چوری ہوئے۔ بات بڑھتے بڑھتے بہوؤں پر آ گئی ہے۔ پتہ نہیں چل رہا کہ پیسے کس نے چوری کیے۔ بابا میں اپنی بیٹی کے لیے بہت پریشان ہوں ہم شریف لوگ ہیں میری بیٹی تو ایسا کام کر ہی نہیں سکتی۔ بہت پریشان ہوں ہو سکے تو اگست کے شمارے میں ضرور جواب دیں' ہو سکے تو وظیفہ دیں تاکہ پتہ چل جائے پیسے لینے والا کون ہے۔

☆بیٹی! اللہ تمہارا مسئلہ حل فرمائے میں نصیحت کروں گا کہ اس معاملے میں خاموشی رکھو اور یہ جاننے کی کوشش مت کرو کہ کس نے یہ حرکت کی ہے۔ گناہ گار خود سامنے آجائے گا۔ بیٹی سے کہو بکثرت پڑھا کرے۔ 'ان مع العسر یسرا' (سورۃ الم نشرح) حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور دے اللہ ضرور کرم فرمائے گا۔

□ عائشہ نظام۔مقام نامعلوم

o السلام علیکم! بابا جی امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ آپ کی خدمت کو قبول فرمائے اور اس کا اجر دے آمین۔ بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ میرے جبڑے کی ہڈی کے جوڑ Temporomadibular Joint کی ڈسک Dislocate ہوگئی ہے جس کی وجہ سے منہ کھولنے اور بند کرنے پر آواز آتی ہے اور درد ہوتا ہے۔ سخت چیزیں کھانے سے بھی درد ہوتا ہے۔ یہ بیماری دو سال سے ہے۔ ڈاکٹر نے سخت چیزیں کھانے سے منع کیا اور احتیاط کرنے کا کہا لیکن فائدہ نہیں ہوا۔ آپ کوئی وظیفہ بتادیں۔ اور بابا جی میں اس سال میڈیکل کا ٹیسٹ دوں گی۔ کامیابی کے لیے دعا کیجیے۔

☆بیٹی عائشہ! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ مجھ سے تعویذ منگوالو انشاء اللہ کلام الٰہی کی برکت سے شفا بھی ملے گی اور کامیابی بھی۔

□ مومل مری۔میر پور

☆بیٹی مومل! تمہاری خواہش پر تمہارا مسئلہ شائع نہیں کیا جارہا۔ بیٹی میں دعا گو ہوں کہ اللہ تمہارے والدین کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ اچھے رشتے نعمت ہوتے ہیں انہیں ذات برادری کے نام پر انکار کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ تمہیں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوالو تاکہ رکاوٹیں دور ہوں۔

□ سدرہ۔احمد پور شرقیہ

o آداب بابا جی! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو صحت دے اور ہمیشہ خوش رہیں۔ بابا جی میں نے سچی کہانیاں میں آپ کا ذکر پڑھا ہے۔ آپ نے کافی لوگوں کی مدد بھی کی ہے بابا جی مجھے بھی آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ بابا جی میں پہلی بار بہت امید سے آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں اور امید ہے کہ آپ میری پریشانی کو ضرور سمجھیں گے۔ بابا جی ویسے تو ہمارے گھر میں بہت مسائل ہیں لیکن میں کچھ مسائل آپ سے شیئر کرنا

چاہتی ہوں۔ میری امی کا نام کنیز بی بی ہے اُن کی شادی کو 20 سال گزر چکے ہیں اور بابا جی میرے ابو کا برتاؤ ان بیس سالوں میں میری امی کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے وہ ہمیشہ میری امی کے ساتھ جھگڑتے رہتے ہیں۔ یہاں تک انہیں مارتے بھی بہت ہیں۔ ہم ماشاء اللہ سے چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ اور میرے ابو بھی تک میری امی کے ساتھ لڑتے رہتے ہیں۔ میری امی کی نہ ہی والدہ ہے اور نہ ہی اُن کے والد اور نہ ہی کوئی سگی بہن اور نہ ہی کوئی سگا بھائی ہے۔ بلکہ یوں ہی سمجھیں کہ وہ بالکل اکیلی ہیں۔ ہمارے سوا اُن کا کوئی نہیں ہے ہم اولاد ہی اُن کا آخری سہارا ہے۔ اور بابا جی میرے بھائیوں کے روزگار بھی بالکل اچھے نہیں ہیں اور ان کے ہر کام میں رکاوٹ ہے۔ بابا جی میری بہنوں اور بھائیوں کے رشتے بھی کسی اچھی جگہ پر نہیں ہو پاتے۔ بلکہ میرے ابو کی وجہ سے ہوتے ہوئے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن بابا جی ہم نے اپنے گھر کے لیے جہاں سے حساب کروایا ہے تو انہوں نے کہا ہے کہ ہمارے گھر میں کالے جادو کا اثر ہے اور ان رکاوٹوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی پریشانی آن پڑتی ہے۔ بابا جی ہمیں کوئی ایسا وظیفہ یا تعویذ دیں جس سے میرے ابو ٹھیک ہو جائیں اور بھائیوں کے روزگار میں بھی برکت ہو اور میرے بہن بھائیوں کے رشتے بھی کسی اچھی جگہ پر ہو جائیں اور ہمارے گھر میں کسی بھی جادو کا اثر نہ ہو۔ بابا جی شاید آپ کو اندازہ نہ ہو کہ میں یہ خط لکھتے ہوئے کتنا رو رہی ہوں اور کتنی امید سے آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ شاید آپ کے لیے یہ خط اہم نہ ہو لیکن یہ خط میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے پلیز بابا جان میری اس سلسلے میں کچھ مدد کریں اور ہم اس وجہ سے بہت بہت پریشان ہیں۔ بابا جی ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ میں آپ کے جواب کا شدت سے انتظار کروں گی۔

☆ بیٹی سدرہ! اللہ تمہارے والد کو عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ میں یہ بات بارہا بتا چکا ہوں کہ ایسے کسی گھر پر کالے جادو یا کسی بھی قسم کا شیطانی عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جہاں لوگ آپس میں خلوص اور محبت سے نہیں رہتے۔ آپس کی رنجشیں سب کچھ ویسے ہی برباد کر دیتی ہیں۔ تم بچوں کو چاہیے کہ والدہ کی طاقت بنو خوب محنت کرو تا کہ روزگار وافر ہو ماں کو زندگی میں کم از کم پیسے کی طرف سے تو مطمئن کر ہی سکتے ہو۔ بھائیوں سے کہو اپنی ذمہ داری سمجھیں والد کو ان کے حال پر چھوڑ دو، نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن ضرور پڑھو ترجمہ کے ساتھ پھر دعا کرو مدت ایک ماہ ہے انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

☐ عمران بخش۔ ساہیوال

o بابا صاحب! اللہ آپ کو صحت و زندگی دے میں بڑی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ آج سے سات سال قبل امریکہ گیا تھا اسٹوڈنٹ ویزے پر پڑھائی کے دوران ہی پاکستانی فیملی کی لڑکی سے شادی کر لی۔ شادی سے پہلے تو وہ لوگ بڑے سلجھے ہوئے لگ رہے تھے۔ شادی کے بعد انہوں نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ میری بیوی مجھے کتے کی طرح ٹریٹ کرتی ہے بات بات پر گھر سے نکال دیتی ہے۔ دو دفعہ 911 کو بلوا کر مجھے جیل کروا چکی ہے۔ میرا ایک بیٹا بھی ہے اب بابا صاحب میں اپنے بیٹے کو لے کر خاموشی سے پاکستان آ گیا ہوں تو اس عورت نے میرے پیچھے ایمبیسی کے لوگ لگا دیے ہیں میں دو سال سے بھاگا بھاگا پھر رہا ہوں۔ والدین الگ پریشان ہیں کچھ دنوں میں بیٹے کو اسکول داخل کروانا ہوگا۔ ذرائع آمدن بھی نہیں ہے بتائیں میں اس مشکل سے کیسے جان چھڑاؤں، میں اپنا بیٹا بھی اُس عورت کو نہیں دوں گا۔ آپ جو کہیں گے میں کروں گا بس کسی طرح اس مشکل سے نکال دیجیے۔

☆ بیٹے عمران! اللہ تمہارے لیے بہتر اسباب پیدا فرمائے کیونکہ اس طرح تم اپنے آپ کو بھی تکلیف دے رہے ہو اور اس معصوم کو بھی جو ابھی جانتا ہی نہیں کہ ماں باپ بچوں کی طرح لڑ رہے ہیں اور وجہ وہ ہے دیکھو جو ہوا سو ہوا یہ تو طے ہے کہ تم نے غلط قدم اٹھایا ہے۔ ماں سے بچہ چھیننا اور پھر چھین کر اتنی دور لے آنا مناسب نہیں لڑائی تم بڑوں کی ہے بچے کا کیا قصور کہ وہ ماں سے دور ہے اور باپ قریب ہو کر بھی قریب نہیں

ہے ایک نامعلوم خوف تم پر طاری رہتا ہوگا کہ کب ایمبیسی والے تمہیں پکڑلیں اور بیٹا چھین کر واپس لے جائیں اب بتاؤ خوف زدہ انسان ایک بچے کی کیا پرورش کرے گا۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ بچہ ماں کے حوالے کردو۔ وہ ابھی تمہاری بیوی ہے مصالحت کا راستہ نکل آئے گا۔ اُس کا رویہ تمہاری جانب درست ہو اس کے لیے میں تمہیں تعویذ دوں گا۔ یاد رکھو بیٹے جب بندہ اللہ سے مدد مانگتا ہے تو وہ ضرور کامیاب ہوجاتا ہے تمہارے مسائل بھی حل ہوں گے بس اپنے آپ کو ثابت قدم رکھو تم مرد ہو اور مرد خوف زدہ نہیں ہوتا بلکہ حالات کا رخ تبدیل کرتا ہے تم مجھ سے تعویذ منگوالینا میں خصوصی دعا کا اہتمام رکھوں گا انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

□ کاشفہ علیم۔پنڈی گھیپ

o بابا جی چند ماہ قبل میری والدہ کا انتقال ہوگیا۔ وہ اچھی بھلی تھیں ہم سب بہن بھائی کالج گئے ہوئے تھے اور بابا کام پر جب ہم لوگ واپس گھر آئے تو اُن کو دنیا سے گئے بہت دیر ہوچکی تھی یعنی جب صبح ہم سب ہنستے بولتے ناشتہ کرکے گھر سے جارہے تھے تب موت کا فرشتہ ہمارے گھر میں موجود تھا۔ بابا جی پتہ نہیں وہ کلمہ بھی پڑھ سکیں، جاتے وقت کس کو یاد کررہی ہوں گی یہ سوچیں مجھے چین نہیں لینے دیتیں...... میں گھر میں سب سے چھوٹی ہوں۔ ہر وقت یہ سوچتی رہتی ہوں کہ پتہ نہیں امی کس حال میں ہوں گی۔ زندگی میں سوچا نہیں، کیا میں اب اُن کے لیے کچھ کرسکتی ہوں۔ جس کا صلہ انہیں بعد از موت ملے۔ پلیز میری رہنمائی کیجیے ورنہ میں شاید پاگل ہوجاؤں۔

☆ بیٹی کاشفہ! مجھے تمہارے دکھ کا اندازہ ہے اور میری دعا ہے کہ اللہ تمہاری والدہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور تم سب لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ بیٹی موت حقیقت ہے اسی لیے اس کی تیاری رکھنی چاہیے۔ انسان جو صدقہ اپنی زندگی میں اور صحت مند ہوتے ہوئے دیتا ہے اُس کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا ہے۔ تم اپنی والدہ کے لیے قرآن پڑھ کر بخشا کرو اس کے علاوہ تم بہن بھائی جو بھی نیک عمل کرو گے اُس کا ثواب تمہاری والدہ کو ملے گا اسی لیے تو نیک اولاد کو صدقہ جاریہ کہتے ہیں۔ بیٹی خوب اچھے عمل کرو اور والدہ کو ہمیشہ دعاؤں میں رکھا کرو تم خود سکون محسوس کرنے لگو گی۔

□ سنبل شہاب۔کراچی

o بابا جان میری شادی کو 15 سال ہوگئے ہیں مگر ایک دن بھی سکون کا نہیں گزرا تین بیٹیاں ہیں جن کی وجہ سے میں روز روز کی ذلت سہنے پر مجبور ہوں۔ میرے سسرال والے انتہائی ظالم لوگ ہیں۔ بات بات پر طعنے ذرا ذرا سی بات پر سب کے سامنے ذلیل کرنا...... صرف تہواروں پر میکے جانے کی اجازت ہے۔ میرے شوہر مجھے انسان ہی نہیں سمجھتے۔ ان کی زبان اتنی گندی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ بابا جی بچیاں بڑی ہورہی ہیں وہ بھی ڈری سہمی رہتی ہیں۔ میں خود یہ نہیں سمجھ پائی کہ میں اتنی ذلت بھری زندگی گزارنے پر کیوں مجبور ہوں، باباجی شاید کم ہمت ہوں کوئی ذریعہ آمدنی بھی نہیں شاید اسی لیے صبر کرکے بیٹھی ہوں۔ آپ میرے کم لکھے کو بہت جانیے اور کوئی ایسا جلالی وظیفہ دیں کہ کم از کم میرے شوہر تو میری عزت کریں اور مجھے انسان سمجھیں اور بچیوں کے ساتھ بھی محبت بھرا سلوک رکھیں۔

☆ بیٹی سنبل! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ مجھے ان لوگوں پر افسوس ہوتا ہے جو اتنی مختصر زندگی میں بھی دوسروں کے لیے دکھ اور اذیت کا باعث بنتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی زندگیوں کو جہنم بنا رہے ہوتے ہیں بلکہ آخرت بھی برباد کررہے ہوتے ہیں۔ بے شک عزت اور محبت کے ساتھ زندگی گزارنا صرف اللہ کے اچھے بندوں کا ہی شیوہ ہے۔ بیٹی تم مجبور ضرور ہو مگر بے بس اور تنہا نہیں اللہ سے دعا کیا کرو کہ وہ تمہارے شوہر کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ نماز کی عادت ڈالو اور بچیوں کو بھی تاکید کرو بعد نماز فجر اور عشاء 3-3 تسبیح پڑھو ’ان مع العسر یسرا‘ (سورۃ الم نشرح) اول و آخر درود شریف

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

تین تین بار انشاء اللہ جلد مثبت تبدیلی دیکھو گی۔ چلتے پھرتے سورۃ ہود آیت نمبر 102 بھی ضرور پڑھو۔ بے شک بیٹی اللہ حد سے گزرنے والوں کو معاف نہیں کرتا۔

☐ منہاج خان۔ لاہور

o بابا صاحب! میں بڑی ہمت کر کے آپ کو خط لکھ رہا ہوں میں کاروباری آدمی ہوں کپڑے کا کاروبار کرتا ہوں اللہ کا بڑا کرم ہے کچھ دن قبل ایک مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں ذکر ہو رہا تھا کہ دکان دار جو اپنے مال کی قیمت زیادہ بتاتے ہیں پھر کم کر کے اصل قیمت پر مال بیچتے ہیں اور گاہک کو بتاتے ہیں کہ کم قیمت پر دے رہے ہیں یہ انتہائی غلط ہے۔ بابا صاحب اس دن سے میں بہت پریشان ہوں۔ میں اپنے گھر میں حرام کا ایک نوالہ بھی نہیں لانا چاہتا مگر انجانے میں برسوں سے غلطی کر رہا ہوں۔ کیا واقعی میں یہ گناہ ہے۔

☆ بیٹے منہاج! اللہ تمہارے کاروبار کو بہت وسعت دے۔ اس زمانے میں جب لوگ حلال اور حرام کا فرق ہی بھول گئے ہیں تمہیں تمہاری غلطی پریشان کر رہی ہے اس کا مطلب ہے کہ تم پر اللہ کا بڑا کرم ہے کیونکہ حضرت قیلہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ کے پاس ایک عورت حاضر ہوئی اور اس نے یہی پوچھا کہ کیا اس طرح تجارت کرنا جائز ہے تو اللہ کے نبیﷺ نے جواب دیا ایسا مت کیا کرو جو قیمت ہے وہی بتاؤ پھر خریدار خرید لے یا نہ خریدے۔ تو بیٹے تم بھی آئندہ احتیاط کرنا۔ اپنے اور اپنے گھر والوں کے اوپر سے صدقہ نکالا کرو رزق وافر ہوگا نماز کی پابندی رکھو اور بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ واقعہ ترجمہ کے ساتھ ضرور پڑھو۔

☐ سیما کوثر۔ فیصل آباد

o بابا جی میری شادی کو سات سال ہو گئے ہیں مگر میں اب تک اولاد سے محروم ہوں میری بڑی بہن کی شادی میرے جیٹھ سے ہوئی ہے اُن کے گھر بھی کوئی اولاد نہیں کسی نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ تعویذ دیتے ہیں ہمیں بھی عطا کر دیں۔ ہم آپ کو بہت دعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی سیما! اللہ تم بہنوں کو جلد صاحب اولاد کرے۔ میں تعویذ تیار کر دوں گا تم دونوں مجھے اپنے مکمل کوائف ارسال کرو۔ تعویذ منگوانے کا طریقہ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کر لینا اللہ حامی و ناصر ہو۔

☐ ظل ہما۔ سرگودھا

o بابا جی میرا مسئلہ بڑی سنگین نوعیت کا ہے، ساری زندگی جان توڑ محنت کر کے ایک ایک پائی جمع کر کے اپنا گھر بنایا اللہ نے کرم کیا اور میں عزت سے اپنے گھر میں شفٹ ہوگئی سب ٹھیک تھا پچھلے سال ہمارے نئے پڑوسی آئے شروع میں تو وہ لوگ ٹھیک ٹھاک ہی لگے مگر آہستہ آہستہ پتہ چلا کہ وہ شریفوں کے محلے میں رہنے کے قابل نہیں۔ ساری رات اوباش لوگوں کا ان کے گھر آنا جانا رہتا ہے۔ بابا جی میری جوان بچیاں ہیں میں تو بہت پریشان ہوں، گھر بھی نہیں بدل سکتی محلے والے بھی ڈرتے ہیں کچھ کہتے ہوئے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ کیا کروں؟ مجھے تعویذ دیں جلالی وظیفہ دیں کہ ہماری جان ان گندے لوگوں سے چھوٹ جائے۔

☆ بیٹی ظل ہما! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ صورتحال پریشان کن ہے ظاہر ہے پڑوس اگر اچھا نہ ہو تو زندگی کافی مشکل ہو جاتی ہے۔ بیٹی میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ معاملات میں خاموشی رکھو بچیوں سے کہو احتیاط سے باہر نکلا کریں اگر ممکن ہو تو کچھ عرصے کے لیے کہیں اور شفٹ ہو جاؤ اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو پھر مجھ سے دو عدد تعویذ منگوا لو ہمراہ وظیفہ بھی دوں گا۔ پابندی کے ساتھ وظیفہ کرنا انشاء اللہ تین ماہ کے اندر اندر وہ لوگ گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ فی الحال تم صبح و شام آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر گھر کے تمام افراد پر ضرور دم کیا کرو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات بھی ضرور کرو۔ میں بھی خصوصی دعا کا اہتمام رکھوں گا۔

☐ صابرہ احمد۔ کراچی

o بابا جی میں بہت پریشان ہوں میری ایک جاننے والی خاتون نے آپ کے بارے میں بتایا اور میں اس امید پر خط لکھ رہی ہوں کہ آپ اللہ کے نیک بندے میری پریشانی کا کچھ حل ضرور نکالیں گے۔ بابا جی میں شادی شدہ عورت ہوں اور میرے دو بچے ہیں شوہر اچھا کماتے ہیں بظاہر کوئی پریشانی نہیں بس ذرا غصے کے تیز ہیں اور غصے میں بہت گالم گلوچ کرتے ہیں چاہے سامنے کوئی بھی ہو۔ مجھے اُن کی یہ عادت بہت بری لگتی ہے بہت بار سمجھانے کی کوشش کی کبھی نرمی سے کبھی ناراض ہو کر مگر ان کو سمجھ نہیں آتی۔ اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ کچھ عرصے سے مجھے اپنے شوہر سے بہت نفرت سی محسوس ہونے لگی ہے اُن کا گھر میں موجود رہنا یا مجھ سے بات کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں چاہتی ہوں کہ رشتے میں بھی رہوں اور وہ نظر بھی نہ آئیں۔ بابا جی شاید آپ کو میرا مسئلہ اتنا سنگین نہ لگے مگر یقین کیجیے میرے لیے بہت اہم ہے میں ایسے شخص کے ساتھ رہتی ہوں جس سے مجھے اُلجھن ہوتی ہے اور اسی لیے میں بہت چڑچڑی اور بدتمیز ہوگئی ہوں بہت بدزمانی کرتی ہوں جس کا اثر بچوں پر پڑ رہا ہے۔ اللہ کے واسطے مجھے اس مشکل سے نکال دیجیے۔ مجھے تعویذ دیجیے گا بچے چھوٹے ہیں وظیفہ کرنا ممکن نہیں۔

☆ بیٹی صابرہ! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تمہاری کیفیت میں بخوبی سمجھ رہا ہوں کسی انسان کو بھی بے عزت کرنے والے رویے اچھے نہیں لگتے میں یہ بات اس بڑھاپے میں بھی سمجھ نہیں پایا کہ لوگ بیویوں کو محبت اور حسن سلوک کے ساتھ کیوں نہیں بساتے ہاتھ اٹھاتے یا برے الفاظ کا استعمال کرنے سے کیا سکون ملتا ہے، بیٹی اصل میں تمہارے شوہر نے اپنے گھر میں یہی سب دیکھا ہے یہ وہ بچپن کا غصہ اور بے بسی ہے جو اب نکل رہی ہے۔ اپنے باپ کو ماں سے ایسا رویہ رکھتے دیکھا ہوگا مگر میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ تم زبان درازی مت کیا کرو کیونکہ نہ چاہتے ہوئے بھی تم بھی اُن جیسی بن جاؤ گی اور پھر بچے بھی برا رویہ ہی اختیار کریں گے لہٰذا برائی کو روکنا چاہتی ہو تو اپنی زبان کو روک لو۔ شوہر جب غصے میں ہوں تو سامنے مت آیا کرو۔ بکثرت لاحولولا قوۃ پڑھا کرو۔ میں تعویذ ضرور تیار کردوں گا اس کے لیے تم جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھو۔ بیٹی صبر کرو ساری توجہ بچوں کی تربیت پر مرکوز رکھو انشاءاللہ سب اچھا ہوگا۔

□ لبنیٰ حمید۔ لاہور

o بابا جی! میں آپ سے اکثر اپنے گھر کے مسائل شیئر کرتی ہوں اور آپ کی وجہ سے بہت سے مسئلے حل بھی ہوئے میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے اس مسئلے کا بھی حل بتائیں، یہ بات میں کسی اور کو نہیں بتا سکتی آپ ناراض مت ہوئیے گا بابا جی مجھے اپنے کزن سے بہت محبت ہے وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں ہم لوگ چھپ چھپ کر ملتے بھی ہیں۔ میں نے یہ بات آپ کو پہلے بھی بتائی تھی مگر پوری طرح نہیں بتائی تھی میرے گھر والے اور اس کے گھر والے ہمیں کبھی بھی ایک نہیں ہونے دیں گے وجہ کوئی دشمنی نہیں بلکہ میری سگی بڑی بہن ہے میرا یہ کزن میرا بہنوئی بھی ہے ڈیڑھ سال پہلے میری بہن سے نکاح ہوا تھا تب وہ مجھے اتنا پسند نہیں تھا مگر جب گھر میں آنا جانا شروع ہوا تب وہ مجھے بہت اچھا لگنے لگا۔ اس عید کے بعد میری بہن کی رخصتی ہے یہ سوچ سوچ کر میرا برا حال ہے بابا جی کچھ ایسا کردیں کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور میری شادی اُس سے ہوجائے آپ کچھ بھی کریں جتنا خرچہ ہوگا میں کروں گی مگر میرا کام کردیں میں وظیفہ نہیں کرسکتی۔

☆ بیٹی لبنیٰ! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ اگر تمہاری بہن کو وہ شخص طلاق دے دے تو کیا تمہارے والدین اسی گھر میں دوسری بیٹی دیں گے؟ بالکل نہیں ساری رشتہ داری بھی ختم ہوجائے گی۔ تمہارے پاس بہت پیسے ہیں تو بیٹی اللہ کے نام پر صدقہ خیرات کردیا کرو تاکہ یہ جو شیطان تم پر حاوی ہے اس سے چھٹکارا مل سکے۔ ایک بات اور بتادوں وہ شخص صرف تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے وہ جلد ہی تمہاری بہن کو رخصت کروالے گا اور اس کے

بعد بھی تمہیں اسی طرح بے وقوف بنائے گا۔ تمہاری نجات صرف اسی میں ہے کہ اللہ سے توبہ کرو اور عہد کرو کہ آئندہ اس شخص سے تنہائی میں نہیں ملو گی، میں تمہیں تعویذ ضرور دوں گا مگر جب تم یہ وعدہ کرو گی کہ غلط رستے پر اب نہیں چلو گی بیٹی یاد رکھو دھوکا دینے والا شخص کسی اور کو نہیں دراصل اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے اور یہ بات وقت ثابت کر دیتا ہے۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

☐ صبوحی کریم۔ ملتان

○ بابا صاحب! اللہ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ تین ماہ قبل آپ سے بیٹی کی شادی کے لیے تعویذ منگوایا تھا اللہ کا بڑا احسان ہے کہ بچی کی بات طے ہوگئی ہے جہاں ہم لوگ چاہ رہے تھے عید کے بعد اُس کی شادی ہے لڑکا بیلجیئم میں رہتا ہے اور بہت اچھا گھرانہ ہے۔ بابا صاحب میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں آپ کی ہدایت کے مطابق صدقہ نکال دیا تھا آپ سے گزارش ہے کہ میری بہن سچی کہانیاں کے دفتر آکر آپ کے لیے لفافہ دیں گی قبول کیجیے گا اور بابا صاحب وہ ایک ماہ پاکستان میں ہی ہیں ان کے ہمراہ میری چھوٹی بیٹی اور بیٹے کے لیے بھی تعویذ ارسال کر دیجیے گا ہدیہ میں آپ کو بھجوا دوں گی، بیٹے کی جاب کا مسئلہ ہے اور بیٹی کی شادی اچھے گھر میں ہو اس کے لیے تعویذ درکار ہے۔ مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر بھیج دیں شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی صبوحی! اللہ کا شکر ہے کہ اس نے کرم فرمایا بس اس کی راہ میں حسب استطاعت رقم نکالتی رہا کرو۔ تعویذ میں تیار کر دوں گا بڑی بچی کا تعویذ اب تلف کر دو اس کے لیے بھی دوسرا تیار کر دوں گا بیٹی میں بوڑھا آدمی کہاں بینکوں کے چکر لگاؤں گا اسی لیے اکاؤنٹ ہی نہیں، تم ویسٹرن یونین کے ذریعے نیکیوں میں اپنا حصہ ڈال سکتی ہو، خوش رہو۔

☐ شمسہ۔ کلر سیداں

○ بابا جی! میں ایک بیوہ عورت ہوں شادی کے صرف چار سال بعد بیوہ ہوگئی میرے دو بچے ہیں شوہر کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے سسرال والے چاہتے ہیں کہ میں اپنے دیور سے شادی کر لوں۔ وہ لوگ بچوں سے دور ہونا نہیں چاہتے میں بھی نہیں چاہتی کہ اپنے والدین پر بوجھ بنوں مگر بابا جی میں اپنے دیور سے شادی نہیں کرنا چاہتی وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا بھی ہے پھر اس کے ساتھ کیوں زیادتی ہو کہ وہ ایک بیوہ اور دو بچوں کی ذمہ داری اٹھائے۔ میں ایسے ہی زندگی گزارنا چاہتی ہوں اپنے ساس سسر کی خدمت کر کے بچوں کی پرورش کر کے میں کسی جذباتی فیصلے کی وجہ سے پچھتانا نہیں چاہتی اور بابا جی سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے شوہر کی جگہ کسی اور کو دے بھی نہیں سکتی لہٰذا دھوکے والی زندگی میرے لیے گزارنا بہت مشکل ہے۔ مجھے مشورہ دیجیے کہ میں کیا کروں؟

☆ بیٹی شمسہ! اللہ تمہیں صبر اور ہمت عطا فرمائے۔ بیٹی تمہارے سسرال والوں کی سوچ بھی بالکل درست ہے، جوان بیوہ بہو کو گھر میں رکھنے سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں نکاح کر دینے سے تمہارا اس گھر میں رہنے کا شرعی جواز بن جائے گا ورنہ تمہارے سسر بھی تمہارے لیے نامحرم ہیں۔ تمہاری سوچ بھی اپنی جگہ درست ہے مگر بیٹی معاشرتی اقدار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہارے دیور کی اگر کہیں اور شادی کر دی جائے تو وہ لڑکی تمہیں اور بچوں کو برداشت نہ کرے پھر کیا ہوگا؟ تم سمجھدار لڑکی ہو میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ ساس سسر کی بات مان لو اور معاملات اللہ کے سپرد کر دو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا تم نماز کی پابندی رکھو اور جس قدر ممکن ہو پڑھا کرو ''سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم'' مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔

☐ تابش رسول۔ مردان

○ میرا مسئلہ نوکری کا ہے ڈیڑھ سال قبل میں اور میرا بڑا بھائی سعودیہ میں تھے بڑا بھائی عرصہ 12 سال سے اور میں 8 سال سے وہاں نوکری کر رہے تھے۔ اچانک ہماری نوکریاں بھی ختم ہوگئیں اور تنخواہ بھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



پھنس گئی، میں تو پاکستان آ گیا کیونکہ شادی تھی مگر بھائی ابھی اُدھر ہی ہے نہ کام ہے نہ تنخواہ دیتے ہیں نہ واپسی کا کوئی سبب بن رہا ہے بہت پریشانی ہے، بھائی کے بیوی بچے گاؤں میں ہیں میں کراچی میں کام کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں بوڑھے والدین' چھوٹے بہن بھائی اور میری بیوی سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے سوچ سوچ کر سر پھٹتا رہتا ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں اپنے ساتھ کچھ غلط نہ کرلوں میری مدد کریں کچھ ایسا پڑھنے کو دیں کہ یہ مسائل حل ہوجائیں۔

☆ بیٹے تابش! یقیناً حالات بہت مشکل ہیں مگر ناممکن نہیں مشکل وقت سدا نہیں رہتا جیسے اچھا وقت بھی ہمیشہ نہیں رہتا زندگی نام ہی نشیب وفراز کا ہے۔ اپنے رب پر بھروسہ رکھو مایوس بالکل مت ہو وہ مسبب الاسباب ہے۔ رزق کا وعدہ اُس کا ہے لہٰذا پریشان مت ہو کوشش ضرور کرتے رہو مگر یقین کے ساتھ اور بیٹے یہ بات بہت بری ہے اللہ نے تمہیں پیدا کیا جوان کیا مکمل اعضاء عطا کیے صحیح دماغ دیا ہے اگر زندگی کے چند سال تکلیف دہ ہوگئے تو تم اللہ کے ساتھ خیانت کرنے کا سوچ رہے ہو یہ بہت بری بات ہے زندگی اللہ کی امانت ہے اس کی قدر کرو' حفاظت کرو خوشی میں شکر ادا کرو دکھ میں صبر کرو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کرو۔ بکثرت درود شریف پڑھو راستے خود بخود کھلتے چلے جائیں گے۔ انشاء اللہ

□ جمال خان۔ مردان

☆ بیٹے جمال! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ سب سے پہلے تو نماز کی عادت ڈالو۔ درود شریف بہت پڑھا کرو، صرف اس عادت کی بدولت تم اللہ کے گھر چلے جاؤ گے اور وہاں سے رزق بھی حاصل ہوگا انشاء اللہ' جہاں تک والدہ کا تعلق ہے تو اُن سے کہو معاملات میں خاموشی رکھیں۔ مجھ سے تعویذ منگوالیں طریقہ کار سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کرلو۔

☆☆......☆☆